

چونکہ دے مال و خزانہ کا کھانا لے گا انتخاب

ماہنامہ

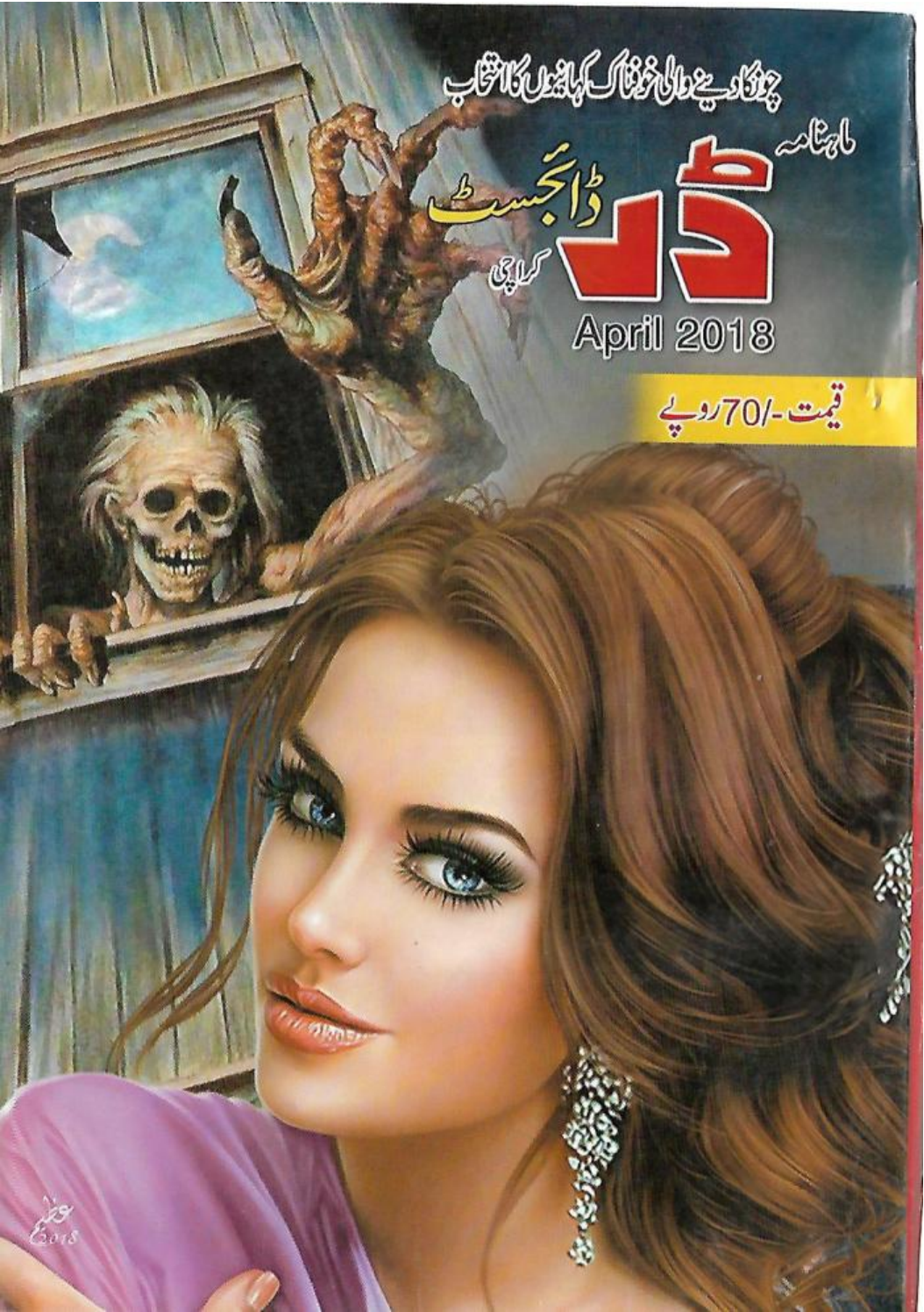
ڈائجسٹ

کراچی

ڈ

April 2018

قیمت - 70 روپے



2018

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ  
ڈائجسٹ  
کراچی

جلد نمبر 19 شمارہ نمبر 7 اپریل 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 70/- روپے

سالانہ قیمت - 1200/- روپے



ادارہ کا کسی بھی راسخ کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیکی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

خوفناک کہانیاں

کراچی

قیمت - 70/- روپے

نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

جس میں شامل ہے۔

ملک کے مشہور و معروف رائٹراؤیم۔ الیاس کی قسط وار کہانی ”پراسرار همزاد“ اور ایم اے راحت کی قسط وار کہانی ”کنارہ“ اس کے علاوہ سچ پر مبنی خوفناک، دہشت ناک، لمحہ دل کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانیاں۔ آپ کے مسائل اور ان کا حل۔ رنگ و دھنک۔ پراسرار دنیا۔ کھٹی میٹھی باتیں۔ اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا باکرسے نام لے کر طلب فرمائیں۔

اپنی قیمتی رائے ہمیں ضرور ارسال کریں۔

ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ۔ رتن ٹلاؤ نمبر 3، کراچی

Email: Khofnakahaniya@gmail.com

PH: 32744391-32711915



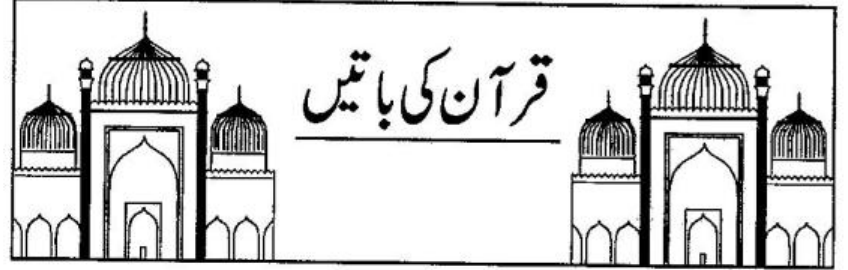
136	مہر پر دیز احمد	حقیقت کے پالنا میں جھوٹی ہوئی اپنی نویت کی لرزادینے والی دل گرفتہ کہانی
145	نسرین رانا	ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والے رات کے گمنا ٹوپ اندر سے چم لینے والی وحشت ناک کہانی
155	گلاب خان سولگی	خوف کے آفت پر رواں دواں عجیب و غریب دل گرفتہ دل ٹھکتے اور دل فریختہ کہانی
160	محمد خالد شاہان	صدیوں پر محیط سوچ کے آفت پر چمکاؤتی گمنا ٹوپ اندر سے چم لینے والی کہانی
181	ملک فرخ ندیم	خوف کے ٹھکے میں بکڑی ہوئی عجیب و غریب اپنی نویت کی دلچسپ کہانی
184	شانزہ اخوان	ایک ایسی کہانی..... جو کہ پڑھنے والوں کو کسی کوٹ بھی جھن سے نہ رہنے دے گی
189	مریم فاطمہ	بدلے اور انتقام کی..... لرزہ بر اندام کرتی ..... لہو پو خوف کے لباس سے لپی کہانی
197	ادارہ	قادرین کے پیسے کے افسانہ جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....
202	شہزاد خان	دل دہلائی ہوش اڑاتی رگوں میں لہو نمہ کرتی حیران کن اور حیرت ناک کہانی
سفاک کون		
شہر خوشاں		
گمنام اسٹیشن		
اسرار		
خونخوار بلی		
بے چین روح		
طوفانی رات		
قوس قزح		
ویران مندر		

18	احسان الحق	انگشت بندناں کر دینے والی..... کہنہ مشق رائے کے قلم کی..... شاہکار حقیقت
29	فاطمہ خان	جسم و جاں میں خوف کی لہر دوڑاتی اور آنکھوں کو پتھر دینے والی وحشت ناک روداد
33	ایس امتیاز احمد	ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف ہوا اس کے ساتھ ساتھ حقیقی ہی ہے
40	محمد قاسم رحمان	کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت میں بڑ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا، سچی آموذ کہانی
54	راشد نذیر طاہر	ایک نادرہ اور براسرار ہستی کی ہولناک رودادوں کی دھڑکنیں جڑ کرنے والا سلسلہ
83	محمد رضوان قیوم	دل دہلائی اور جسم و جان پر لرزہ خاری کرتی خونخاک وحشت ناک لرزیدہ لرزیدہ کہانی
95	نینا خان	کیا جھنڈ لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے کہ یا گھر و کچہ بہاں کر لیں حقیقت کہانی میں پہاں ہے
102	ملک فہیم ارشاد	حقیقت سے روشناس کرتی اپنی نویت کی عجیب و غریب دماغ سے نکلنے والی روداد
131	طارق محمود	بہی بھی تاحل لوگ اپنی نامحقی دوسروں پر غصہ دیتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں
المیہ		
خونی نمبر		
پراسرار مخلوق		
محبتیں شمار کرنا		
جان لیوا		
خبیث روح		
نیا گھر		
اندھیرے سے اجالا		
اندھیرے کے مسافر		

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

## خطوط

## قرآن کی باتیں



- ☆ اور ہاں تم جو خرچ کرو گے تو ان حاجت مندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔ اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور مانگنے سے حار رکھتے ہیں، یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب لوگوں سے منہ پھوڑ کر اور پلیٹ کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 273)
- ☆ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ (سورۃ صفا 93 آیت 10)
- ☆ اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 36 سے 37)
- ☆ کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے وہی اپنے بندوں سے خیردار اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 96)
- ☆ پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو کے میں ہے بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 96)
- ☆ اور جو لوگ اللہ سے عہد واثق کر کے اس کو توڑ ڈالتے اور جن رشتوں کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کو قطع کر دیتے اور ملک میں فساد کرتے ہیں ایسوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 25)
- ☆ اور جو کچھ انہوں نے کیا ان کے اعمال ناموں میں مندرج ہے یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔ (سورۃ قمر 54 آیت 52 سے 53)
- ☆ جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں کو مال کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے لپٹن سے وہ پیدا ہوئے بے شک وہ نامعقول اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ (سورۃ مجادلہ 58 آیت 2)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکریہ شیخ بک ایجنسی کراچی)

☆ **مسند سندس اقبال** راولپنڈی سے، مارچ ۲۰۱۸ء کا ڈراما انجسٹ سامنے ہے اور مکمل پڑھنے کے بعد کچھ الفاظ لکھ دی ہوں۔ زندگی کی مصروفیات ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں، بچوں کا خیال رکھنا اور شوہر کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر امور، پھر فرمت کے چند لمحات کے بعد ایک واحد ڈراما انجسٹ کا ساتھ۔ یہ سب میری زندگی کا حصہ ہیں۔ سرورق کہانیات خوبصورت اور ڈرامے کے معیار کے عین مطابق تھا لیکن جو کہانیاں ڈرامے کو ترقی پاتی بناتی تھیں ڈراما انجسٹ بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں وہ جان لیوا، ڈاک بنگ، شمشک، بہادر کون، دیوتا نگری تھیں۔ ان رائٹرز نے الفاظ کا جادو نکسیرتے ہوئے کہانی میں ان کا انداز بالکل جدا گانہ ہوتا ہے۔ حقیقت پڑنی اپنی تحریر لکھتے ہیں۔ گوان کا منظر اور زبردست انداز صاحب نے پیش کیا اور کہانی میں ڈرامے اور ڈرامے والی تمام باتیں یکثرت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایس حبیب خان صاحب کی کئی خطوط اور سہارو دیکھا جائے تو کہانی میں ڈرامے اور ڈرامے والی تمام باتیں یکثرت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆ **مسند سندس صاحب** قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر اچھا لگا، بہر حال سبکی زندگی ہے کہ کام اور کام میں مصروف رہنا اور احکام خداوندی کو بجالانا، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے، اور آپ سمیت تمام اہل خانہ کو اور خوشیوں سے نوازے۔ کہانیوں کی پختہ بندی اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈراموں شکر ہے۔

☆ **فلک زاہد** لاہور سے، السلام علیکم، بہت دیر بعد حاضری دے رہی ہوں، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بتاتی ہوں کہ اپنے پیارے ڈرامے میری غیر حاضری کی وجہ کوئی مصروفیت نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ میرا آپریشن تھا جو 22 نومبر کو ہوا۔ میرے سینے میں دو گلیاں تھیں جن کا اللہ کے فضل سے کامیاب آپریشن ہو چکا ہے اور اب اللہ کے کرم سے میں بہتر ہوں۔ آپریشن کے نام سے تو بڑے بڑے لوگ گھبرا جاتے ہیں، میری عمر تو پچاس سال ہے۔ آپ سب بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں میری کیا حالت ہوگئی ہوگی۔ سچ کہوں کی خود پر گزری تو صبح معنوں میں پتہ چلا کہ ”خوف“ کسے کہتے ہیں۔ ورنہ اب تک تو میں دوسروں کو ہی ڈراتی تھی۔ وقت کی سبکی عادت بہت اچھی ہے اچھا ہوا یا برا کر رہی جاتا ہے۔ مجھ پر بھی آئی بلاں پکلی ہے اور اب انشاء اللہ ڈرامے میں باقاعدگی سے حاضری دیجی رہوں گی۔ آپریشن کے دنوں میں سارا سارا دن میں بستر پر لیٹی رہتی تھی کیونکہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ ایسے میں ڈرامے بہترین ساتھی تھا۔ جس کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتی رہی ہوں اور اپنے پیارے بہن بھائیوں کے محبت نامے بہت حوصلے دیتے تھے۔ ارسال کردہ کہانی میں نے شدید بیماری کی حالت میں بستر پر ہی لکھی ہے۔ لہذا کوئی کمی رہ گئی ہو تو درگزر کر دیجئے گا آئندہ اس سے بھی بہترین کہانی لائے گی کوشش کروں گی۔ آخر میں سب بہن بھائیوں کا شکریہ کہنا چاہوں گی جنہوں نے مجھے برابر ہر ماہ اچھے خطوط میں یاد رکھا۔

☆ **فلک صاحب** ارسال کردہ کہانی مل گئی ہے اس کے لئے شکریہ، آپ کا آپریشن ہوا اس کے لئے ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور ہمیشہ کے لئے آپ کی زندگی سے دکھ تیار پائیاں ختم کر دے، کہانی آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔

-Thanko

☆ **راجہ آفرین** لاہور سے، ڈرامے تمام اسٹاف بشمول قارئین! السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں ڈراما انجسٹ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ہر ماہ میری شاعری شائع کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈرامے پرانے لوگوں کو جگہ دیتا ہے مگر مجھے یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ رائے غلط ہے۔ آپ سب لوگ جنہیں لگتا ہے کہ ڈرامے جاننے والوں کو جگہ دیتا ہے، ان سے میری گزارش ہے کہ Look at me میرے خیال میں ڈرامیک وسیع پلیٹ فارم ہے جو معیار کو ترجیح دیتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ڈرامے والے تمام قارئین خود پر نظر ڈالیں تو ڈراما بہت فریش لگے گا جو کہ سب کا خیال رکھتا ہے، کیوں کہ میں ایک زندہ مثال ہوں۔ جن لوگوں نے میری شاعری کو پسند کیا، میں ایک بار پھر ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہتی ہوں۔ ڈراما انجسٹ ہر ماہ لکھتی ہوں مگر فی الحال تیرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ امتحانات قریب ہیں۔ اس لئے ابھی پڑھا نہیں، بعد میں پڑھ کر تیرہ ضرور کروں گی، پکارا پاس! اپنا خیال رکھنے کا۔ اللہ حافظ۔



☆ رابعہ صاحبہ: چلئے حقیقت کا پتا تو آپ کو چل گیا کہ کچھ لوگ خواہ مخواہ ڈر کے متعلق باتیں بناتے ہیں خیر اب آئندہ ماہ ضرور تبصرہ ارسال کیجئے گا۔ شکر ہے۔

**مسز زینت خان** روات سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے اور وطن عزیز پر برکتیں بھیجے، دشمن لگائے بیٹھے ہیں، انہیں مذمت کی کھائی پڑے۔ خیر، مارچ کے ڈر نے کوئٹہ تا ٹنڈی کوٹہ دیا کڑی یادہ کہانوں پر تبصرے کی نوبت آتی۔ لیکن سرورق نے بہت خوش کیا کہ یہ ادارے کی نیک نیتی سے کی گئی کوشش ہوتی ہے اور محنت بھی۔ سرورق بہت خوبصورت رنگوں کے ساتھ ڈر کی حقیقی عکاسی کر رہا ہے۔ بہت خوب۔ اب آتے ہیں کچھ ایسے لکھنے والوں کی جانب جو روز بروز اپنی محنت کے بل پر اپنی تحریر کے گراف میں بہتری پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ایس اے امتیاز احمد صاحب ہیں اور پھر اس مرتبہ ناصر محمود فہرہ صاحب ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ دونوں تو رائٹرز ہیں اور دونوں ہی اپنے وسیع مطالعہ کے سبب کہانی لکھتے ہوئے محنت سے کام لیتے ہیں۔ گھیل نیازی صاحبہ امیر سے خیال میں Marvel Studios سے وابستہ Stan Lee کی فلموں سے لی گئی کہانی 'دیو تاگری' ایک دلچسپ اور اچھی کوشش ہے، ایسی کہانوں کو لکھنا بھی ایک فن ہے جو آپ کے پاس ہے۔ شہزاد خان صاحب کی کہانی میں شروع میں بہتری تھی لیکن آگے چلتی ہوئی نامعلوم کہانیاں نکل گئی۔ غینا خان صاحبہ محنت کر رہی ہیں لیکن 'کالو ایکس' ملتی جلتی کہانی ڈر میں ناگ بیٹا کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ 'شیدے' کی کرامت ایک ایسی کہانی ہے جسے ایک علیحدہ نوعیت کی کہانی قرار دیا جاسکے اور الفاظ کی خاموشیت کے اعتبار سے یہ کہانی پورے وطن کو پرستی چاہئے۔ ڈائجسٹ کی پہلی کہانی بھی بہتر طرز کی تھی۔ میری نظر میں سب سے زیادہ اچھی کہانی 'جان لیوا' ہے جو پڑھنے والے کی جان لینے پر تلی رہتی ہے، خیر امید ہے کہ احسان الحق صاحب کی محنت بہتر ہوگی ہوگی۔ آئین، نیک تمنائیں۔

☆ زینت صاحبہ: میرے خیال سے اب بہت سے رائٹرز نے آپ کی باتوں پر عمل شروع کر دیا ہے، اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دوسروں کو سنتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو خوشیوں سے نوازے، اور آپ اپنے چاہنے والوں میں خوشیاں بانٹیں۔ شکر ہے۔

**ایس حبیب خان** کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کی فیم اس کے رائٹرز اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمار میرے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کی باتیں سے ابتداء کی۔ خطوط کی بزم میں کافی دوستوں کو سک کیا اور جو حاضر تھے ان میں سرپرست مسز زینت خان اس کے بعد سر فرحمن حامد، احسان الحق، عبداللہ بارہروی، ڈاکٹر عامر شہزاد کے تبصرے جامع اور مفصل تھے جنہوں نے تمام لکھنے والوں کی بھرپور انداز میں تحریف و اصلاح دونوں کی، میں ڈر کے ایڈیٹر مسز زینت خان، غینا خان، احسان الحق، شاہد عظیم، میاں یاور حسین اور تمام ان لوگوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کما کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آئین) میں مسز زینت کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ "والدین کی خدمت سعادت ہے بلکہ نصیب کی بات ہے۔" میرے نزدیک ماں جو یزداں کی مایہ ناز تخلیق ہے بلاشبہ میری متاع حیات ہے۔ اور میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ مجھے اپنی مائے خدمت کی سعادت نصیب ہے اور میں اس کو سعادت سے بڑھ کر عبادت کا دھجہ دیتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ میری مائے رداے شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہے۔ (آئین) اب آتے ہیں مارچ کی تحریروں کی جانب تو جناب ڈر کی ابتداء اور انتہا دونوں ہی بہترین طریقے سے ہوئی۔ اور ہاں رائٹر کے قلم کی خوبصورتی اس کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ فلک زہا اور احسان الحق صاحب کی تحریروں کی کی محسوس ہو رہی ہے۔ احسان الحق صاحب کا شمار ان رائٹرز میں ہوتا ہے جن کے بغیر ڈر اور ماہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تحاریر خاص ترین کے زمرے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو محنت عطا فرمائے تاکہ آپ کے قلم سے نکلتی لازوال تحریروں آپ کے قلم کی تحقیر دور کریں۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆ ایس حبیب صاحب: نئی ارسال کردہ کہانی اس ماہ شائع نہ ہو سکی اس کے لئے معذرت ہے، آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ والدین سے بڑھ کر دنیا میں اور کچھ نہیں۔ وہ لوگ بد قسمت ہیں جو والدین کی خدمت نہیں کرتے اور والدین کی باتوں کو..... ہم آپ کی مائے محنت و ہمدستی کے لئے دعا گو ہیں۔

**خدیجہ فاطمہ** اسلام آباد سے، السلام علیکم! نکل امیر سے ہے 13 تاریخ سے شروع ہیں اور اپریل کے آخر تک رہیں گے۔

شاید اگلی مرتبہ ڈر میں حاضری نہ دے سکوں کیونکہ سالہ بچہ کے بعد پڑھوں گی۔ اس لئے اگلے شمارے میں غیر حاضری پر ابھی سے معذرت خواہ ہوں۔ اس مرتبہ مارچ کے شمارے کا سرورق بہت زبردست تھا اور ادارے کی محنت واضح طور سے جھلک رہی تھی۔ خطوط میں ایس حبیب خان ہائیڈر، چنگیز انبوی نے اپنی اُمی جان کے متعلق پچھلے خط میں لکھا تھا تو دل سے دعا کی ہے کہ سب خیریت ہو، آئین۔ اس مرتبہ پڑھائی پر دھیان زیادہ رہا تو دو کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں ایک ڈاک بنگلہ اور دوسری جان لیوا۔ بہت زبردست لکھا ہے اور جان لیوا تو ایسی کہانی ہے کہ چھوڑنے کو بھی ہی نہیں کرتا۔ باقی آئندہ سہی۔ بہت شکر ہے، دعاؤں کی منتاج ہوں، والسلام۔

☆ خدیجہ صاحبہ: چلئے آپ کی معذرت قبول کرتے ہیں کہ آپ مئی کے شمارے میں نظر نہیں آئیں گی، لیکن ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو محنت و ہمدستی دے اور امتحانات میں اچھے نمبروں سے کامیاب و کامران کرے۔ (آئین)

**مسز فرحین حامد** رحیم یار خان سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، مارچ 2018 کا شمارہ زبردست ہے۔ سرورق دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ادارہ اس جانب خاص توجہ کے ساتھ محنت کر رہا ہے، سرورق کمال کا تھا بلکہ انتہائی زبردست۔ کہانوں میں جان لیوا کا نمبر سب سے پہلے ہے کیونکہ یہ سلسلہ دار کہانی روح میں بسنے والی اور قاری کو اپنے ساتھ چلانے والی کہانی ہے۔ اور ایسے ہر اچھی کہانی خود بخود ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ اب ان شاء اللہ تیسری قسط کا شدت سے انتظار ہے گا۔ دیگر کہانوں میں ایس امتیاز احمد، ناصر محمود فہرہ، گھیل نیازی، گلپا خان سولگی نے بھی انتہائی محنت سے لکھا ہے، البتہ گھیل نیازی صاحب کی کہانی کسی قلم کا خلاصہ تھی، شاید Thor۔۔ آپ کی کسی کہانی کا۔ باقی بھی محنت کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ایک دن رائٹرز کی محسوس میں متاثر نظر آئیں گے۔ اس مرتبہ خطوط میں اپنی فحوت رائٹر ایس حبیب خان صاحبہ کی کی کو محسوس کرتی رہی۔ امید ہے کہ اپنی خیریت سے نوازیں گی، ان کی والدہ کے لئے دعا گو ہوں۔ اس مرتبہ کے لئے اتنا ہی۔ والسلام۔

☆ فرحین صاحبہ: آپ کی اور اپنے تمام چاہنے والوں کی خوشی کے لئے ایس حبیب صاحبہ نے اپنی کہانی بھیج دی ہے، جو کہ مئی کے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ اور ہاں آئندہ ماہ بھی خط لکھنا مت بھولے گا۔ Thanks۔

**مریم فاطمہ** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ مارچ 2018 کا ٹائل اس بار بہت اچھا تھا۔ خطوط کی محنت میں مسز زینت خان نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا بہت بہت شکر ہے، ڈر میں لکھنے والے رائٹرز کو ملی ادنی فاؤنڈیشن سے ملنے والے اعزازات پر ڈیر ساری مبارکباد۔ فروری میں مجھے بھی ملی ادنی فاؤنڈیشن کی طرف سے بہترین ادب تخلیق کرنے پر سند اعزاز شعلیت بزرگ ڈاک گھر پر مل گیا تھا۔ بے حد خوش محسوس ہوئی۔ میں تقریب میں شریک تو نہ ہو سکی لیکن پھر بھی سائل ایڈو صاحب سے فون پر بات ضرور ہوئی تھی۔ جناب نے بڑی خوش اخلاقی سے بات کی، اچھا لگا، محسن عزیز صاحب کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا آپ کو محنت و ہمدستی عطا فرمائے۔ آئین! ام آئین!

☆ مریم صاحبہ: سائل ایڈو واقعی زندہ دل اور ادب سے لگاؤ رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے، کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہو جائے، اور ہاں آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجے گا۔

**رشک نور** فیصل آباد سے، امید ہے کہ ڈر کا تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کرام اللہ پاک کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوں گے۔ سب سے پہلے تو Thank you جب میں کالج سے واپس پر اپنے کمرے کی طرف گئی تو خاک کی کاغذ میں پہلے کسی چیز کو اپنی اسٹری ٹیبل پر پایا جو اٹھایا تو میرا فحوت ڈر ڈائجسٹ تھا، خوشی کے مارے میرے من سے بے اختیار واہ لگا، اتنی خوشی مجھے میرے فٹ ایئر کے زلزلے آنے پر بھی نہ ہوئی تھی۔ جتنا خوش ڈر واہ ڈائجسٹ کو دیکھ کر ہوئی، Again Thank you، ڈر مجھے اس قدر پسند ہے کہ کیا بتاؤں۔ اس وقت میں بخار میں چپک رہی ہوں اور خط لکھ رہی ہوں ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوتی ہوں۔

☆ رشک نور صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکر ہے، ایک مشورہ ہے کہ کہانی لکھ کر دوبارہ پڑھا کریں اور اس طرح صحیح بھی ہو جائیگا کہ کسی کہانی پر نظر ڈالے گا کہ کس قدر محنت کرنی پڑی۔ شکر ہے۔

**فاطمہ خان** علی پور مظفر گڑھ سے، السلام علیکم! مارچ کا شمارہ 22 فروری کو نکلا۔ ٹائل بہت خوب صورت لگا۔ رنگوں سے بھرپور اور جاذب نظر اور کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس شمارے میں اپنی کہانی کو نہ پا کر دکھ ہوا لیکن کوئی بات نہیں جناب ممبر کا کچل بیٹھا ہوتا ہے، اگلی دفعہ ہی سہی۔ لیجئے جناب ایک اور خوب صورت تحریر لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ تحریر

میں کی بیشی دور کر کے ڈر کی زینت بنا دیجئے گا۔ بہت بہت شکریہ!  
 ☆☆ مرحوم صاحب: چلئے اب کہانی شامل اشاعت ہے اور قوی امید ہے کہ دیر کے بغیر ایک اور کہانی لکھ کر ارسال کر دیں گی۔  
 -Thanks

**قاسم رحمان** ہری پور سے، السلام علیکم امید ہے کہ ڈر کا سارا ایشاف خبریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمارہ میں نے 3 مارچ کو خریدی تھی قسط وار کہانیوں نے متاثر بھی بہت کیا اور خوش بھی کیا ویڈیوز۔ ایڈیٹر صاحب میں کافی عرصے سے اپنی کہانیوں کے چھپنے کا انتظار کر رہا ہوں، میری کئی تحاریر آپ کے پاس ہیں، بلتیز! نظر ثانی کریں۔ مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی نہ پا کر اتنا افسوس ہوا کہ الفاظ میں بیان کرنے کی سکت نہیں۔ دو تین ماہ دوسرے غیر حاضر کیا رہا آپ نے مجھے دودھ سے کھمی کی طرح نکال کر باہر چھینک دیا اور ہاں یہ بتا دیں کہ ”خون کا کہانیاں“ کہاں سے ملے گا، ہری پور میں دستیاب نہیں ہے۔ اگلے ماہ ایک مفصل تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میں خالد شامان بھائی کو اور امین اے کاوش کو ایوارڈ ملنے پر مبارکباد دیتا ہوں، اللہ آپ کو ایسی ہزاروں کامیابی اور دکھائے۔ جب تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ قاسم صاحب: اب تو خوش ہیں ناں کہ ”مجتہدین شاکرنا“ شامل اشاعت ہے ہم کسی کو کھمی کی طرح دودھ سے نکالنے نہیں بلکہ دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔ تبصرہ ارسال کرنا بھولے گا نہیں۔

**احسان الحق**، السلام علیکم محترم ایڈیٹر صاحبان، رانٹرز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ 2018ء کا ڈرڈائجسٹ دیکھ کر دل انتہائی خوش ہے کہ سرورق بے حد متاثر کن ہے اور لکھنے والے تمام رانٹرز نے اس میں خوب اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کہانیوں میں ایسے امتیاز احمد صاحب، ناصر محمود صاحب، ملک فیہما احمد، رشک نور، نینا خان، گلاب خان مولگی صاحب، ظلیل غازی صاحب نے خوب خوب لکھا۔ ایڈیٹر ڈیو کیٹ نینا خان صاحبہ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ واقعہ نگاری کی جگہ آپ کے قلم میں ایک کہانی کا لکری خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے، چاہے چھوٹی کہانیاں لکھیں لیکن واقعہ نگاری سے اپنے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے لکھیں اور کہانی کے انداز میں لکھیں۔ یہاں خاص طور پر مہر پر دیز احمد دولو صاحب کا ذاتی طور پر احسان مند ہوں اور کئی طور پر عاجزی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا جا رہا ہوں کہ آپ نے اپنی کہانی لکھ کر ناچنے کے دل کو ایک ایسی راحت بخشی جس نے فہم الہدیل میں کوئی دوا دار نہیں ہو سکتی۔ آپ اپنی کہانی میں ہر ہر سطر پر بچ بولتے ہیں۔ آپ کی کہانی میں سب وطن عزیز کا المیہ ہے اور بہت قابل توجہ المیہ ہے اور میں عاجزی سے کہتا ہوں کہ جب جب ڈر مجھ گناہ گار کے ہاتھ میں آیا تو مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے میں نے فہرست میں آپ کے نام کی تلاش کی اور سب سے پہلی کہانی آپ کی ہی پڑی ہے اور جب جب (آپ کی کسی ذاتی تجویز کی بنا پر) آپ کہانی نہ لکھ سکے ہوں تو میں ادا اس ضرور ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ ڈر میں ہر ماہ ایک مختصر کہانی لکھی، لیکن لکھیں گے لازماً، کیونکہ رانٹرز کے ذہن میں کم از کم ایک پلاٹ تو مینے بھر میں، ضرور ہوتا ہے۔ اور ہاں ڈرڈائجسٹ میں کسی ہے تو دو بہترین رانٹرز کی کسی ہے۔ ایک ایس صاحب خان صاحب کی اور دوسرے فلک زاہد صاحب کی۔ یقیناً ڈر کے تمام احباب ان دونوں کو Miss کر رہے ہوں گے۔ اللہ کرے کہ ان کی جانب سے جلد کوئی دھماکہ خیز کہانیاں شامل اشاعت ہو جائیں۔ دونوں ڈرڈائجسٹ کی تجھی ہوئی رانٹرز ہیں بلکہ میں تو قائل ہوں کہ خوف ڈور کے میدان میں ٹاپ کی رانٹرز ہیں۔ آپ سب کا شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام و خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: یہ حقیقت ہے کہ ردو لو صاحب قلمی نگار سے کہانی نہیں بلکہ معاشرتی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں، لیجئے ایس حبیب اور فلک صاحب کی کہانی اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔ میں خود بھی ان دونوں رانٹرز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کہانی ارسال کر کے خوشی فراہم کی۔ Thanks

**شاہد عظیم** راولپنڈی سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹر ڈرڈائجسٹ اینڈ ٹیم۔ مارچ کے مینے کا ڈر پڑھا۔ سب سے پہلے سرورق کے متعلق عرض ہے کہ بہت خوب، محنت اور جان فشانی کے ساتھ بنایا گیا ہے، دل خوش ہو گیا۔ امید بندھی کہ کہانیاں بھی ڈر کے عین مطابق ہوں گی۔ جان لیوانے دل خوش کیا۔ ڈاک بنگلہ بھی معیاری کہانی تھی۔ گلاب خان مولگی صاحب نے بھی اس مرتبہ خوب کہانی لکھی۔ پرویز احمد دولو صاحب نے دراصل ملک کے حالات کا تذکرہ کیا ہے اور تمام باتیں ڈرا دینے والی ہیں۔ بے شک ایسے ملک ہر وقت بہت سے خطرات میں ڈوبے ہوئے ہیں جہاں ایسی باتیں ہو رہی ہوں جیسا کہ ردو لو صاحب نے سادہ الفاظ میں پیش کی ہیں۔

اللہ بچائے سب کو! ایس امتیاز احمد نے بھی ہمیشہ کی مانند بہترین لکھا۔ بہر حال عمومی طور پر ڈر میں اس مرتبہ کہانیاں بھی پسند آئی ہیں۔ امید ہے کہ باقی حضرات دو تین بھی محنت کرتے رہیں گے۔ فلک زاہد صاحبہ کا فی عرصہ سے ڈرڈائجسٹ میں نہیں لکھ رہی ہیں، برائے مہربانی ان تک عاجز کا پیغام پہنچا دیں کہ کوئی ایک آدھا لکھی سی کہانی لکھ دیں، شکریہ۔ باقی آئندہ، دعا گو۔  
 ☆☆ شاہد صاحب: فلک صاحبہ کی کہانی اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی، ان کی نئی کہانی آگئی ہے۔ آئندہ ماہ بھی غلط نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks

**میان یاور حسین** اسلام آباد سے، السلام علیکم اگلے! میرے بچے زمر پر ہیں لیکن مارچ میں شائع ہونے والی صرف ایک کہانی پر کچھ کہوں گا جو جان لیوا کے عنوان سے اگلے رانٹرز پر ظاہر کی، بہترین پیشکش ہے، دوسری قسط بھی خوب رہی، اب دیکھتے ہیں کہ تیسری قسط میں کیا ہوگا۔ ڈرڈائجسٹ کا سرورق بہت زیادہ زبردست بنایا گیا ہے اور ڈرڈائجسٹ کی ٹیم کو داد دیتا ہوں کہ محنت سے سرورق کو ترتیب دیتے ہیں۔ اللہ ڈرڈائجسٹ سے وابستہ ہر ایک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اس مرتبہ باقی ایس صاحب خان کا تبصرہ بھی تھا جو کہ ڈر کی جان ہوتا ہے، آئی زینت خان کی باتیں بہت غور طلب ہوتی ہیں، میں ان کی باتوں سے رہنمائی لے رہا ہوں، شاید کسی ایک دن کوئی ایک کہانی لکھ سکوں، والسلام۔

☆☆ یاور صاحب: جولوگ دوسروں کی باتوں پر غور کرتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں، آپ آئی زینت کی باتوں پر غور کیا کریں، ایک دن یقیناً کہانی لکھ سکیں گے، لیکن تب تو اگلے ماہ بھی بیچے گا۔

**ایس امتیاز احمد** کراچی سے، غلط جنیت، خدا کرے آپ سب خبریت سے ہوں۔ ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلخربہ ناٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کہانی اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا! Dar کا پلیٹ فارم پر کافی خوب صورت لکھنے والے جمع ہو رہے ہیں اور Dar کے خون کا سفر پر ساتھ چلنے کو تیار ہیں! ”ڈر ایکسپریس“ اپنی تمام تر خون کیوں کے ساتھ پلس کی ہر خطرناک سانسوں پر رواں دواں ہے اور ہم اور آپ سب اس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ کوئی انٹین نہیں!... دعا ہے کہ ”ڈر ایکسپریس“ کا سفر یوں ہی جاری رہے۔

☆☆ امتیاز صاحب: کم لکھا مگر کچھ تو بہت کچھ لکھا، اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی زور قلم عطا کرے، تاکہ اپنے چاہنے والوں کے لئے اچھی کہانیاں لکھ سکیں اور مکمل تبصرہ بھی، کیونکہ ٹھیک ہے ناں۔

**شرف الدین جیلانی** غزوالیہ سے، مبارک آغاز! بسم اللہ انعام خدا جانے بوس قزح سمیت 18 کہانیوں کا قلدستہ ڈر کی صورت میں حاضر نظر ہے۔ ظلیل جبار کو ڈر میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، شہزادہ کا عذیب عباسی اور ظلیل جبار کی کہانیوں میں منظر کشی بہت کم ہوتی ہے۔ شہباز احمد کے قلم میں برابر کے شریک ہیں۔ محسن عزیز حکیم کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں، گلاب خان مولگی، اللہ آپ کی پریشانی دور فرمائے۔ ڈر میں کسی ساتھی کو پریشان دیکھتا ہوں تو دل دھکی ہو جاتا ہے، کیوں کہ میں بھی خوشی کو ترستا ہوں۔ والسلام۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کی تحریر کردہ باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں آپ کا دل دھکی ہو جاتا ہوگا۔ کسی ساتھی کی پریشانی دیکھ کر بس جی ہم تو کسی کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی صحت و تندرستی دے اور خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔

**طارق محمود** کارہاٹک سے، السلام علیکم 25 فروری کی گرم دوپہر میں اپنا پیارہ ڈرڈائج کی طرف سے ملا، سچ میں بہت ہی خوشی ہوئی، ناٹل کی حسینہ کو دیکھ کر دلکش اشائیل سے کجراے نیوں سے جانے کے دیکھ رہی تھی اس کے سامنے ہی شاید موت کا نکواں تھا جس میں سے تین انوکھی حلقوں ایک مردہ کو نکال کر لارہی تھیں لیکن اس کرل کا دھیان جانے کدھر تھا۔ ”قرآن کی باتیں“ سب کے لئے مشکل راہ ہیں۔ غلطی کا مکمل ایک بہترین سلسلہ ہوتا ہے۔ جس میں کسی کے لئے تعریف کے جانے کو کون سے کلابے ملاتے رہتے ہیں اور کسی کو کیکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چلیں پسند اپنی اپنی، اس دفعہ کچھ ماہ بعد ضرغام محمود صاحب ڈرڈائجسٹ میں کہانی کے ساتھ نظر آئے، اسنے ماہ بعد ایک بہترین کہانی لے کر آئے، پڑھ کر کچھ میں محفوظ ہوئے۔ ”پراسرار ہوٹل“ چھوٹی سی اچھی کہانی تھی۔ ہوٹل کی پراسراریت کے تینوں دوست شکار ہو گئے۔ ”کربناک انجام“ سبق آموز کہانی تھی۔ ”جان لیوا“ رانٹرز پر ظاہر صاحب بہت ہی اچھے دیکھے انداز سے کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اسٹوری بہت ہی اچھی ہے۔ مکمل قسط پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ”موت سے



چھکارہ، اچھی تحریر کی۔ کہانی کا لکھنے کا اسٹائل اور پلاٹ بہت ہی اچھا تھا۔ باقی کہانیاں بھی ڈر کے لحاظ سے بہترین تھیں۔ ڈر ہر اسٹری کی کہانی کو مدھر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے شکر ہے۔

☆ طارق صاحب: دراصل ادارہ ڈرڈائجسٹ اپنے تمام رائلٹوں اور قاریوں کو دلی طور پر چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے رائلٹوں کی کہانیاں بھی بے ساختہ کرپش کرتا ہے اور اس طرح بہت کم عرصے میں سے ایک لکھنے والا رائلٹ بن جاتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

**عبدالعزیز بلوچ** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف سارے لکھاری و قارئین حضرات خیریت سے ہوں گے۔ ماہ مارچ کا شمار 22 تاریخ کو موصول ہوا۔ سروق پسند آیا۔ خطوط میں تمام دوستوں کے خطوط خوب رہے۔ کہانیوں کی فہرست میں تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر کالی مانتا کا پیماری، کرنٹاک انجام، پراسرار ہوٹل، اس بادی کی بہترین کہانیاں تھیں، اس بار میں ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے اصلاح کے بعد شائع کر کے شکر یہ کا موقع دیں گے۔ شکر ہے اللہ حافظ۔

☆ عبدالعزیز صاحب: فکر نہ کریں اصلاح کر کے کہانی شائع کر دی جائے گی۔ کہانیوں کی تعریف اور اگلے ماہ بھی تبصرہ ارسال کرنے کے لئے شکر یہ قبول کریں۔

**ڈاکٹر عامر شہزاد رانا** ننگرانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، معزز رائلٹز اور قارئین السلام علیکم! مارچ کا اعزاز می کالی ارسال کرنے پر بہت بہت شکر ہے، ورنہ بازار سے تو بہت لیٹ رہتا ہے۔ سروق انتہائی خوب صورت اور ڈرائنگ ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پر چھ کر دیکھ کر سکون ملا۔ ”خطوط“ میں مسز فرمین حامد، مسز زینت خان، مسز سندس اقبال، خدیجہ فاطمہ، فاطمہ علی خان، گریت نینا خان، مریم فاطمہ، مریم نعمتی، ملک امین اے کاوش، محترم احسان الحق، خالد عباس، ہر طرح پر محمد حنیف شاکر اور عبدالجبار رومی نے بہترین تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں گریت نینا خان کی ”کالو“ نے تو دل خوش کر دیا۔ اسد اللہ بھٹی کی پراسرار ہوٹل ملک امین اے کاوش کی ”کرنٹاک انجام“ شہزاد خان کی ”موت سے چھکارا“ ناصر محمود کی ”یہمک“ رشک ٹورکی کی ”سزائے موت“ محمد شعیب کی ”وہ ایک لمبی“ محسن عزیز کی ”تھکنا گمن“ اور فکیل نیازی کی ”دیوتا گری“ عمدہ اسٹوریز ثابت ہوئیں۔ محمد حنیف شاکر صاحب کا شنی شامی میں چھا گئے۔ مہر پر یز صاحب آپ بھی ننگرانہ صاحب تحریف لائیں میں آپ کو یہاں کچھ مذہب کے بانی گردنا تک صاحب کے جنم استحقاق اور مختلف گوروں کی سیر کرواؤں گا اور کچھ شیڈوں سے بھی ملاؤں گا دینیے ”شیدے کی کرامت“ لا جواب کہانی ہے۔ غزل میں پروفیسر ڈاکٹر واجد محمد اسلم جادید، گریت نینا صاحبہ، فردا توہیر، محمد حنیف شاکر، کائنات رشک، خالد عباس، راجہ آفرین اور ایس امتیاز احمد نے قابل تحریف غزلیں لکھیں۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نمبر نو! ڈائجسٹ ”ڈر“ مزید کامیابی سینیے، دعائے خیر ہے کہ ”ڈر“ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆ عامر شہزاد صاحب: دراصل میری بھی خواہش ہوتی ہے کہ میں ہر کسی کا خط پورے کا پورا شائع کر دوں مگر ہائے رے مجبوری، محدود صفحات کے بنا پر خواہش گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ سمجھدار ہیں، سمجھ گئے ہوں گے۔ Thanks۔

**محمد اسلم جاوید** فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، بھٹی بار آپ کو خط تحریر نہ کر سکا، معذرت خواہ ہوں، کام کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے شہر جانا نصیب نہ ہوا۔ سوچے ہوئے کالی دن گر گئے، پرچہ پریس میں جانے کی تیاری کے قریب تھا۔ چند دن رہ گئے۔ اس وجہ سے خط آپ کو نہ لکھ سکا کام زوروں پر ہے۔ وقت نہیں ملتا۔ شہرک اسٹائل پر جانے کو آپ نے سابقہ روایات کے تحت دوئی کا حق ادا کر دیا ہے ابھی ابھی کام سے آئے ہوں اور یہ مختصری تحریر آپ کی نظر کر رہا ہوں ویسے میں پرچہ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ اس کا اپنا ہی معیار ہے۔ اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں۔ نئے نئے قلم کاروں کو تحائف کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ مقررہ تاریخ پر ڈرڈائجسٹ کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ موسم بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ خدا آپ کو اپنے نیک مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ ہر بار کہانیاں اور غزلیں خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ قوس قزح کے اشعار بھی اچھے ہوتے ہیں۔ قرآن کی باتیں بھی اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو استفادہ کرنا چاہئے۔

☆ اسلم صاحب: دراصل زندگی مسلسل تک و دو کا نام ہے۔ اگر انسان احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو جائے تو ساری مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ سارے عمل کا دار و مدار نیکیوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین)

**مختصر حیات** روڈہ قتل سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا سارا اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمار ایک خوبصورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 25 فروری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوب صورت اور دلکش تھا۔ ٹائٹل ایک طرف اور شمارہ ایک طرف۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گا۔ شمارہ بہت بہت زیورست تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت زیورست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ ویسے تو سب کہانیاں زیورست اور اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں بہت بہت ہی زیورست تھیں۔ ان میں ”کرنٹاک انجام“ ”جان لیوا“ ”موت سے چھکارا“ شامل ہیں۔ باقی کہانیاں بھی سب سے عمدہ اور اچھی تھیں۔ قوس قزح میں گیا تو پورے شمارے کا مزہ ہی دو بالا ہو گیا۔ پورے کا پورا قوس قزح زیورست تھا۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر خوشی 4 گنا بڑھ گئی۔

☆ مختصر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکر ہے بلکہ بہت بہت شکر یہ قبول کریں۔

**محب گل اداسی** غلوالہ دیر سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین کے لئے پر خلوص دعائیں، مارچ کے شمارے کا ٹائٹل اپنی مثال آپ تھا، کالی ماہ سے ٹائٹل بہت زیورست آ رہے ہیں، تمام کی تمام کہانیاں قابل تعریف ہیں، لیکن پھر بھی چند کہانیاں جودل کو بھاگئیں وہ ہیں، موت سے چھکارا، کرنٹاک انجام، یہمک، کاوشی شامی، شیدے کی کرامت اور دیوتا گری، تمام رائلٹوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید ہے کہ تمام رائلٹز آئندہ بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھ کر پڑھنے والوں کو خوش کریں گے۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ محب گل صاحب: بہت بہت شکر یہ کہ آپ نے کہانیوں کی تعریف کے لئے خط لکھا، تو پلیر! آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کاشت سے انتظار رہے گا۔

**محمد دانیال** روڈہ قتل سے، السلام علیکم! میں ڈرڈائجسٹ کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریروں کو شمارے میں جگہ دی، مجھے دیکھ کر ہوا حوصلہ افزائی کی۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ اب آتا ہوں شمارے کی طرف، مارچ کا شمارہ ایک حسین، خوب صورت سروق کے ساتھ 23 فروری کو مل گیا۔ سروق بہت بہت ہی خوب صورت تھا اور اس نے پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیئے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ بہت بہت زیورست تھا۔ شمارے میں شامل سب کہانیاں بہت زیورست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ جب قوس قزح اپنی غزل اور شعر دیکھ کر پاگل ہو گیا خوشی سے مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہ آیا۔ اب تک کے لئے اتنا ہی۔

☆ دانیال صاحب: ہم بھی آپ کی خوشی میں شامل ہیں اور یہ خوشی اس وقت تک رہے گی جب تک آپ ابھی ابھی تحریریں لکھتے رہیں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سینئر ڈر پڑھیں اور تحریریں لکھتے رہیں کامیابی قدم چومے گی۔

**محمد خالد عباس** ننگرانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، مارچ کے شمارے میں غزل اور خط شائع ہونے پر خوشی ہوئی، اس بار رسالہ بہت خوب صورت لگا، تمام رائلٹز نے خوب اچھا لکھا، کہانیوں میں ”پراسرار ہوٹل“ ”کرنٹاک انجام“ ”ڈاک بنگلہ“ ”سزائے موت“ نینا خان کی ”کالو“ ”بہادر کون“ ”شیدے کی کرامت“ ”دیوتا گری“ رانا عامر شہزاد نے ”خونخاک رات“ نہایت اچھی کہانی لکھی، جسے پڑھ کر دل خوش ہو گیا، یہ واقعی بہت خوبخاک، پراسرار اور ہیبت ناک کہانی ہے۔ ”کاوشی شامی“ میں محمد حنیف شاکر نے بھی خوب رنگ بھجایا۔ واقعی شاکر صاحب بہترین ہارر رائلٹ ہیں۔ امید ہے جلد ایک اور خونخاک کہانی کے ساتھ پیش ہوں گے۔ غزل میں ڈاکٹر واجد صاحب، محترم نینا خان صاحبہ، محمد حنیف شاکر صاحب، فردا توہیر، کائنات رشک، راجہ آفرین اور رانا عامر شہزاد صاحب نے نہایت عمدہ غزلیں لکھیں، دعائے خیر ہے کہ ڈرڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہے۔ آمین۔

☆ خالد صاحب: خط بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈیر دل شکر یہ قبول کریں اور ہاں اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجتا مت بولنے گا۔

**شہباز احمد** اجبٹ آباد سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے تمام لکھاری و قاری اور ادارے والے خیر خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ کے شمارے میں تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کہانیوں میں احسان الحق صاحب کی کہانی کاشت سے انتظار ہے۔ کہانیوں کے علاوہ قوس قزح میں بھی ہر شاعر نے اچھا کام پیش کیا۔ شاعری لکھنا نثر لکھنے سے مشکل ہوتا ہے۔ آخر میں سب کو پیار بھر اسلام اور ایک بات کہنا چاہوں گا ہر ماہ ڈر کا ٹائٹل مزید ہار

☆☆ شہباز صاحب: آپ کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے ہماری کوشش ہوگی کہ نائل مزید بار بار ہوا اور آپ خوش ہو جائیں۔

☆☆ مہر پر دیا صاحب: آپ کی کہانی بھی بڑھ کر دل خوش ہوئی، معاشرے کی حقیقت کو بیان کر کے آپ دل خوش کر دیتے ہیں اور کاش کہ ہم لوگ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔

☆☆☆ حقیف صاحب: بیڑی کہانی لائن میں لگ گئی ہے پلیز! چھوٹی کہانی ارسال کریں، چھوٹی کہانیاں ہی پار بارشائع ہوتی ہیں۔ امید ہے شت جواب ضرور دیں گے۔ Thanks-

**Dar Digest** **16** **April 2018**

☆☆ شیر صاحب: خط لکھنے اور کہانوں کی تعریف کے لئے ویری ویری ٹیکس، آئندہ ماہ بھی غلام نامہ بھجوتا ہوں گے کامت شکریہ۔

☆☆

**Dar Digest** 17 April 2018



کیا یہ خوفناک باتیں نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہو رہی ہے اور یہ خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے، ہر ملک میں مثبت سوچ رکھنے والی قوم ہی نظام کو بدلتی ہے ناکہ اختلافی سوچ رکھنے والی قوم.....

انگشت بدنداں کر دینے والی..... کہنے مشق رائٹر کے قلم کی..... شاہکار حقیقت

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میری عمر پچاس سال ہے۔ میں نے ”باقاعدہ“ M.B.B.S. کر رکھا ہے۔ باقاعدہ کا لفظ تو میں نے دانستہ استعمال کیا ہے ورنہ آپ بھی متعرض ہو سکتے ہیں کہ کیا ہر ڈاکٹر M.B.B.S. نہیں ہوتا؟

تو بچے جواب بھی حاضر ہے۔ جی نہیں! آج کل ہر ڈاکٹر کے پاس ایک عدد سند تو ہوتی ہے لیکن وہ M.B.B.S. نہیں ہوتا۔ اب آپ کہیں گے کہ کیوں جی؟ تو جواب یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے سے انسان انجینئر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ اور مکینک نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اس کا تجربہ وسیع ہو۔ محبت کامل بھی تو کسی شے کا نام ہے کہ نہیں! اور یہ بھی تو یاد رکھیے کہ آج ہر استاد انجینئر یا پروفیسر ”کامل“ تو نہیں ہوتا نا۔۔۔ ورنہ ہم سب معاشرے میں ”گورہ نایاب“ کو کیوں تلاش کرتے؟

مجھے یاد ہے کہ M.B.B.S. کے آخری کلاس سیشن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدکریم صاحب مرحوم نے ہماری کلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک جملہ کہا تھا۔ شاید وہ M.B.B.S. کے ہر آخری کلاس سیشن میں اُسے دہراتے آئے تھے۔ ہم سے پہلے والوں کے

لئے بھی اور ہمارے لئے بھی وہ جملہ اُن کی وصیت سمجھتے ہوئے ہم نے اپنے پلے سے باندھ لیا تھا۔ اور وہ جملہ یہ تھا!

”محترم دوستو! آج سے آپ لوگ ڈاکٹر نہیں بنے بلکہ ڈاکٹر بننے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔“

بیڑا غرق! ستیاناس!۔۔۔ یہ پانچ سال! تو پھر یہ کس کھاتے میں گئے۔ نہ دن کا پتہ نہ رات کو چین۔ کیا ہم جھک مارتے رہے تھے؟

اُس وقت ہم سب کو یہی محسوس ہوا تھا۔ لیکن! ہمارے اُستاد نے بالکل تجربے کی بات کہی تھی۔ وہ ٹھیک تھے اور ہم غلط۔ انسان اپنی ابتدائی زندگی کے چالیس سال تک غلط ہی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا۔

پھر امتحانات ہوئے۔ میری تیاری پوری تھی کیونکہ منزل کا تعین کر چکا تھا یعنی اگر مجھے بننا ہے تو ڈاکٹر ہی بننا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں بننا۔

پھر ایک دن میں گھر آیا اور نہادھو کر جب کپڑے تبدیل کئے تو ابا جان نے آواز لگا دی۔ ”بھیل الدین آیا کہ نہیں؟“

”بھئی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہے آپ کے پاس!“ یہ امی جان ہمیں۔

”اس لڑکے کو تین دن قبل دیکھا تھا میں نے، عالیہ! اور اب بھی کوئی خاص امید نہیں رکھتا۔“ ابا کے انداز میں شکوہ تھا۔

”ابائیں! آ رہا ہوں، آپ ہی کے پاس؟“ میں نے قدرے اونچی آواز سے کہا تھا کیونکہ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں فوری ابا کے پاس چلا گیا۔ سلام کے بعد ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹری کہاں تک پہنچی آپ کی؟“

”بچہ زود دے دیئے ہیں، ابا۔ اب بس رزلٹ کا انتظار ہے۔“

”کیا آپ سے امید بہاراں رکھی جاسکتی ہے یا.....؟“ ابا نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی یہ بات سن کر دل تو چاہا کہ زوردار قہقہہ لگا دوں لیکن ہمارا دور بزرگوں اور بڑوں کے احترام کا دور تھا۔ میں نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔

”ابا، آپ اور امی جان کی دعاؤں کی بدولت میں نے پورے M.B.B.S. میں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یقیناً آپ کامیابی کی نوید سنیں گے۔“

”اس کے بعد کیا کرنا ہے، میرا مطلب ہاؤس جاب کہاں کرو گے؟“ ابا نے فی البدیہ سوال پوچھ لیا۔

”ابا، میرا ارادہ تو۔۔۔“ اور میں نے ایک بڑے اسپتال کا نام لے لیا کہ میں وہاں پریکٹس کرنا چاہتا ہوں۔

سرکاری ملازم جو آغا میں ایک نچلے درجے کے کلرک تھے اور اب بیس سال بعد کہیں سولہویں درجے تک پہنچے ہیں۔ اپنے زمانہ کے ایم اے (اردو)۔

اردو میں ماسٹرز! اردو۔۔۔ اور وہ بھی اس مضمون میں دو سال کھپا ڈالے میرے ابا نے۔ بھلا اردو بھی کوئی مضمون ہے؟ یہ سب میں اُس وقت سوچ رہا تھا۔ دفعہ دہر گندمی مجھورا!

اردو تو ہمارے امی ابا ہمیں بچپن میں سکھا دیتے ہیں۔ بھلا اس میں 730 دن ضائع کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی اور اوپر سے نتیجے کا انتظار کیجیے، وہ علیحدہ Fatigue! یعنی خوری۔ (یاد رہے کہ یونیورسٹیوں کے ہاں پہلے سالہا سال اگر امتحانات کے نتائج نہ بھی آتے تو بھی اُن کے سر پر جوں نہ رنگ تھی، یہ تو اب تو ہوا بہت نظام سیدھا ہوا ہے اور وہ بھی عدلیہ اور فوج کی دراندازی کی بدولت، معاف کیجئے گا!)

تو ایسی سوچیں اُس نوجوانی کے دور میں اپنا ڈھن سوچا کرتا۔ لیکن جب میں ہاؤس جاب کے لئے ایک کے بعد دوسرے ہسپتال در بدر ہوا تو مجھے اپنی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا۔

”یہ تم نے اپنے منہ پر چھ کیوں بجا رکھے ہیں۔“ خالدہ نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں مجھے ”بوتل“ دیتے ہوئے کہا تھا۔

آپ لوگ غلط مت سمجھئے، اُس زمانے میں مشروب لطف کو بوتل ہی کہا جاتا تھا۔ یا اسے حریہ واضح کر دوں۔۔۔ کہ جو مشروب، شیشے کی بوتل میں قہما، بازار سے منگوا کر سرعام یا محفل میں، ہر رشتہ دار کے سامنے یا ان کے ساتھ بیٹھ کر پیا جاتا، اُسے عام بول چال میں ”بوتل“ کہا جاتا۔ اور جو مشروب حرام چھپ کر یا دوستوں کے ساتھ پیا جاتا اُسے ”بوتلی“ کہا جاتا۔ بہر حال! خالدہ نے مہمان نوازی کے بطور ایک بوتل میرے سامنے میرے گھر رکھ دی تھی۔

خالدہ میری بہت اچھی دوست تھی رہی تھی۔ وہ مجھ سے دو سال پیچھے کے Batch میں تھی۔ ایک

پوش علاقے میں رہتی کیونکہ اس کے والد ایک اچھے خاصے کاروباری آدمی تھے۔ ان کی دو فیکٹریاں تھیں۔ تین مرئیوں کے فارم ہاؤس تھے۔ اُس دور کے حساب سے اُس کے والدین آزاد خیال تھے اور حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی

اکلوتی بیٹی کو انہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ مجھ جیسے شریف اور خاندانی لڑکے سے بات چیت کی حد تک ملاقات کی جاسکتی ہے۔ دیگر یہ کہ گھر کے وفادار ملازمین اور دھڑا جاسوسوں کی مانند بھگتے دکھائی دیتے تھے جو کہ یقیناً خالدہ کے والد اور والدہ کی خاص تاکید پر ہی ایسا کر رہے تھے۔ اب اُس دور میں C.C.TV کیسرے تو تھے نہیں، یہی لوگ تھے۔

مجھے بھی کسی عشق یا ہوس کے ٹٹونے لات نہیں ماری تھی، میں تو خود حالات اور نظام کا مارا تھا۔ M.B.B.S. مکمل کرنے کے بعد ہاتھ کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”خالدہ! میں اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہوں۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ اُس نے دونوں ہاتھوں کی لمبیاں بنا کر اپنے رخساروں کے گرد جماتے ہوئے کہا۔

میں نے ساری بات اُس کے گوش گزار کر دی۔ ”اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے سال بڑھنے کے بعد بھی میری وقعت ایک عام سے طالب علم جتنی ہی ہے۔ کر دوں تو کیا کروں؟“

”ااااا..... اگر تم کہو تو میں ڈیڈی سے بات کروں؟“ اُس نے فنی خیر انداز میں کہا۔ میں نے اُس کی جانب ایک بار دیکھا ضرور لیکن مجھے اپنی ذات میں ندامت سی محسوس ہوئی۔ ابا تو میرے بھی تھے۔ بھلا وہ اپنے ڈیڈی سے میرے متعلق کیوں بات کرتی، میں اپنے ابا سے بھی مدد مانگ سکتا تھا۔

”اب کیا سوچ رہے ہو، جی؟“ اُس نے جیل الدین سے مجھے جی بتادیا۔

”مجھے جی مت کہو، ایسا لگتا ہے جیسے اپنے پالتو کتے کو پکار رہی ہو۔“ وہ میری بات پر زیر لب مسکرائی اور دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، جمیل الدین صاحب۔“ اس مرتبہ میرے مکمل نام کے ساتھ اُس نے ”صاحب“ پر کچھ زیادہ ہی زور دیتے ہوئے کہا تھا اور میں نے اُس کی جانب پر شکوہ انداز میں دیکھا۔

”خالدہ، تم میرا مذاق اڑا رہی ہو نا، کیونکہ میں حالات کا مارا ہوا ہوں، ہے نا؟“

”خیر، چھوڑو، بوتل پیو اور ٹھنڈے حراج سے سوچ کر میرے سوال کا جواب ضرور دینا۔ ویسے ڈیڈی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ وہ میری بات کبھی رو نہیں کریں گے۔“ اُس نے اپنے سامنے رکھی مشروب کی بوتل کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے ڈیڈی کا احسان نہیں لینا چاہتا۔“ میں نے اپنے دل کی بات اُس پر عیاں کر دی۔

”اس میں احسان والی کون سی بات ہے؟“

”احسان تو ہے؟“ میں نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”احسان و حسان کچھ نہیں ہے، یہ تمہارا حق ہے۔ اب سیدی انگلی سے تو گھی نہیں نکھاتا، تو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑے گی۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کے سے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”تم فکرمند کرو۔ میں موقع دیکھ کر اپنے ڈیڈی سے بات کر لیتی ہوں۔“ اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”اب مسکراؤ نا۔“

میں نے زبردستی اپنے چہرے پر غیر ناثرانہ مسکراہٹ دی۔

”مسکراؤ بھی یار، ایسا لگتا ہے کسی نامور اخبار کے فرٹ پیج پر چھوٹے گم کے ایڈ پر نظر آرہے ہو۔“ اُس کی اس بات پر میں نے اپنی ہنسی نہ روک سکا۔



خالده نے اپنا کام کر دیا تھا۔ جو ”میڈرنگ“ میرے ابا کے پاس نہ تھی، وہ خالده کے ڈیڑی کے پاس تھی بلکہ کچھ دافر مقدار میں دستیاب تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میرا کام ہو گیا تھا۔

اتنی جلدی تو جنت منتر اور کالا جادو کے ماہر افریقی یا بنگالی بابے بھی مسئلہ حل کرنے پر قادر نہ تھے۔ پہلے تو مجھے کمرہ فون آیا۔ شہر کے سب سے بڑے سرکاری ہسپتال سے۔ دوسری کال شہر کے سب سے بڑے نجی ہسپتال سے تھی۔ اور تیسری کال خالده کے ڈیڑی کی جانب سے تھی۔ ٹیلی فون چونکہ ابا ہی اٹھایا کرتے تھے یا ای جان تو اس مرتبہ ابا نے اٹھائی۔

”جی کون صاحب؟“ ابا نے رسیور کان سے لگاتے ہی پوچھا۔ دوسری جانب سے کچھ بتایا گیا۔ ”اچھا! لیکن میرا بیٹا تو ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، بھلا کسی ٹیکسٹری سے اُس کا کیا لینا دینا؟“ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو ابا نے بھی رسیور میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”جمیل الدین، یہ کوئی خاقانی صاحب ہیں، ملک کے نامور صنعت کار ہیں، جنہیں مبارک باد دینا چاہتے ہیں۔“ اور اپنا منہ ٹیڑھا سا بنا کر جھٹکتے ہوئے خیالات میں گم وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خالده کے ڈیڑی ہیں، میں نے کھکارا بھرتے ہوئے سلام کے بعد اُن کا دھیسے سے شکر یہ ادا کیا۔

”کوئی بات نہیں بیٹے، یہ تو میرا فرض تھا، لو اب خالده سے بات کرو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے خالده کو فون دے دیا۔ لیکن میں سوچ میں گم ہو گیا کہ یہ سفارش کرنا اُن کے فرض نہیں کیونکہ شامل ہو سکتا تھا۔ ”مبارک ہو۔“ خالده نے فون پر آتے ہی پر جوش انداز میں مجھے مبارک باد دی۔

”میں تمہارا احسان مند ہوں، خالده! میں نے اُس وقت اپنا آپ منوں بھاری محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔“ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”بے کاری پاگے جا رہے ہو۔ فون تو ڈیڑی نے اس لئے کیا تھا کہ ہمیں یاد کر دے کہ اب مٹھائی کھانا مت بھولنا اور میں نے اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ ابھی بھی منہ پر چڑھتی بجے ہیں یا سونیاں چھ سے آگے بھی بڑھی ہیں؟“

اُس کی بات سن کر میں ہنس دیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، کب آؤں؟“

”پہلے یہ تو فیصلہ کر لو کہ سرکاری ہسپتال میں پریکٹس کرنی ہے یا نجی ہسپتال میں۔ جو اننگ دے دو، پھر تھوڑا سا سب ڈاکٹری کی ریل گاڑی آگے بڑھنے لگے تو مٹھائی بھی کھلا دینا۔“

”اوکے، ڈن!“

”چم چم مت ڈلوانا مٹھائی میں کیونکہ ڈیڑی کو شکر کا عارضہ ہے۔“ اُس نے مجھے تنبیہ کی۔ ”نہیں ڈلواؤں گا۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے اُس سے سوال کیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ پر ہو تو سرکاری ہسپتال میں کام کرنے کو ترجیح دیتے یا نجی ہسپتال میں؟“

دوسری جانب سے کچھ وقفے کے بعد خالده گویا ہوئی، غالباً وہ سوچ رہی تھی۔

”میں نجی ہسپتال میں کام کرتی۔“

”اور اس فیصلے کی وجہ کیا ہوئی؟“

”ایک تو بھیڑ کم، چل خوراری کم، صفائی والا ماحول، بیرون ممالک سے پڑھے لکھے ڈاکٹروں کے زیر سایہ مجھے زیادہ سے زیادہ جدید برائے پر سکینے کا موقع ملتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سرکاری ہسپتالوں سے ڈھائی تین گنا زیادہ تنخواہ اور اہمیت تھی۔“

(یہ باتیں اچھے وقتوں کی ہیں ورنہ نجی ہسپتالوں میں اب بلیک میلنگ کی جاتی ہے اور کم از کم تنخواہ دی جاتی ہے جبکہ سرکاری حکموں میں اب بہتر حالات ہیں۔)

”تو تم چاہتی ہو کہ میں اپنا کیریئر نجی ہسپتال سے شروع کروں!“ میں نے دانستہ بات اُس کے

کورٹ میں بھیجتے ہوئے کہا۔

”میری مرضی تھوڑی سی ہے، تم نے پوچھا سوئیں نے کہہ دیا۔“

”اچھا! کیا واقعی؟“ اس مرتبہ میں نے اُسے کریدتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا جسے وہ بخوبی سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرما جائے گی لیکن اس کے برعکس وہ چڑ کر بولی۔

”ہاں تو اور کیا؟ جس میں تمہاری خوشی، جی“

”مجھے جی مت کہو، میں چڑ کر بولا۔“ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا سن کر اپنا آپ پر بھونکنے کو دل کرتا ہے۔“ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ورنہ مجھے اُس کے منہ سے اپنے لئے جی کا لفظ اتنا بھی برا نہیں لگتا تھا، بس، ہمارے کچھ میں ایسے خطاب رائج نہیں تھے۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھے زہر لگتی تھی۔

”اوہ سوری، میرا مطلب تھا۔۔۔ جمیل الدین صاحب۔“

”یہ صاحب بھی ہٹاؤ!“ میں نے احتجاج کیا۔

”جمیل الدین!“ وہ تنک کر بولی۔

”بائی دی وے، جمیل سے کام نہیں چلا سکتیں، کیا؟“

”میں چاہتی ہوں، جمیل کہ تم ایک کامیاب انسان بن کر مجھے دکھاؤ۔ بس!“

”بہت بھگوس ڈائلاگ ہے۔“ اکثر فلموں میں ماں کا کردار ادا کرنے والی اداکارائیں بولتی ہیں۔ تم میری ماں تو نہیں ہو۔“ میری بات پر وہ ٹھٹھکا کر ہنس دی۔ پھر بولی:

”اب کام پر فوکس کرو، باتیں بعد میں۔ اور ہاں مٹھائی میں چم چم نہ ہوں کیونکہ۔۔۔“

”۔۔۔ تمہارے ڈیڑی کو شکر کا عارضہ ہے، یاد رکھوں گا۔“ میں نے اُس کی بات اچک کر مکمل کر دی۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرتا چلا گیا۔ میں نے خالده کے مشورے اور اُس کی بات میں وزن ہونے کی بنا پر نجی

ہسپتال سے ہی آغاز کیا۔ اور اس دوران اپنی تعلیم آگے جاری رکھی۔ چار سال جرنی میں بیتائے۔ وہاں سے گروہ و مشائے کی مہارت حاصل کی اور واپس اُسی نجی ہسپتال میں بحیثیت ماہر گروہ و مشائے کے اپنی پریکٹس کا از سر نو آغاز کیا۔

لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے میں ایک عام ڈاکٹر تھا اور اب مخصوص شعبے کا انچارج بھی تھا اور بہت سے ڈاکٹروں کا اُستاد بھی۔ گویا اب میں اپنے شعبے کا ایک طبی ماہر تھا اور دیگر ڈاکٹر میری رائے کے طلکار اور محتاج تھے۔ وہ میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور کان کھڑے کر کے میری بات کو دھیان سے سنتے اور یہی نہیں بلکہ مجھے بھی اپنی حیثیت کا حقیقی معنوں میں اب ادراک ہو چلا تھا۔

گروہ و مشائے کے شعبے میں تحقیق کرنے کی وجہ یہ بنی تھی کہ ابا کو شکر کے عارضے نے آلیا تھا جس وجہ سے اُن کے گردوں میں خطرناک سوزش پیدا ہو گئی۔ ریٹارمنٹ کے بعد وہ کافی عرصہ طویل رہے اور پھر ایک دن وہ ان کو بچے لگیوں کو چھوڑ کر تنہا ہی بھرے، ابدی نیند والے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔

کافی عرصہ تک ابا کی یادوں نے مجھے اپنے کام سے روکے رکھا تھا۔ نہ کپڑوں کا ہوش تھا اور نہ ہی اپنی بڑی شیو کا۔ عجیب جھوٹا سا ہو گیا تھا، میں۔ میری حالت ایسی تھی جیسی ناصر کاظمی نے کہہ ڈالی تھی۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بتاؤں کس کے لئے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لئے

سرکاری ملازمت سے انیسویں درجے پر ابا ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ امی جان کو پیشین مل رہی تھی۔ آفیسر گریڈ میں پیشین ہمیشہ سے اعلیٰ رہی ہے، ورنہ ٹپلے درجے کے لوگ تو فقط چار دن کا خرچ بنام پیشین وصول کرتے ہیں۔

خیر، اس سے قطع نظر خالدہ سے فون پر بات چیت رہتی تھی۔ اس کے والدین کا اصرار تھا کہ میں اب خالدہ سے تمام عمر کے لئے تعلق ہو جاؤں۔ بات تو ہم میں کب کی ایک خاموش سمجھوتے کے طور پر طے ہو چکی تھی، بس! ٹھیک اور مناسب وقت کا انتظار تھا، سو وہ وقت اب آن پہنچا تھا۔

ہماری شادی ہو گئی۔ خالدہ بھی ڈاکٹر تھی لیکن اُس نے ناک، کان اور گلا کے امراض میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ ہم دونوں شادی کے بعد بھی ایک دوسرے سے زیادہ عرصہ دور ہی رہتے تھے۔ دراصل ساری بات فرانس میں ادا کرنے کے اوقات کے تفاوت کی وجہ سے تھی۔

اُس کی نائٹ ڈیوٹی تو میری دن کو، اُس کی دن کو تو میری رات بھر میں۔ ایک اینڈرژ میں کہیں اتفاقاً ایسا ہوتا کہ ہم دونوں کو آپس میں فراغت کے لمحات مل پاتے، اُن لمحات کو بھی اسی جان کے ساتھ تینوں گھومنے پھرنے نکل جاتے اور خوب اچھا سا کھانا کسی فائینا اشار ہوئی یا کلب میں کھاتے۔ زندگی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر ایک دن ہمارے ہسپتال کے ڈین کا تبادلہ ہوا اور دوسرا ڈین ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر بن کر یہاں تعینات کیا گیا۔ اُس کا نام ظہیر الدین تھا۔ ڈاکٹر ذکی فہرست میں اُسے میں کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ جس کا اُس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے ذکر بھی کیا۔

”ڈاکٹر جمیل الدین، آپ کا نام تو میرے نام سے مماثلت رکھتا ہے لیکن اب آپ کا کام بھی مماثلت رکھے تو بات ہے۔“

”جی شکر یہ، سر۔ لیکن میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا میرے کام میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟“

اُس نے میری بات سن کر اپنی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگا کر کہا۔ ”کام تو سپر ہے۔ لیکن یوں کام کرتے کرتے تو کام کا وقت

کل جائے گا۔“ اُس نے دونوں آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے مضمی خیر انداز میں کہا۔

”میں ابھی بھی آپ کی بات نہیں سمجھا، سر۔ اب میرے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں نمایاں ہو چکی تھیں۔“

”بھئی، زندگی ایک بار بلی ہے، بار بار نہیں ملتی اور یہ بات ایک ڈاکٹر تو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔“

”جی بالکل صحیح کہا آپ نے، سر۔“

”تو پھر کچھ پہنچ لایے، اپنے اندر کے انسان میں، اپنی سوچ میں، اپنے لائف اسٹائل میں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ میں ابھی بھی اس کی باتوں میں چھپی بات تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

”جی ضرور، سر۔“ میں نے ایک گول مول جواب دیا۔

”دیکھیے اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا۔ چند روز ہی گزرے ہیں، لیکن ہماری سوچ وہیں پرانگی ہوئی ہے۔ فرض کیا، ڈیوٹی پر گئے، واپس لوٹے، گلی بندگی پر شکر کر لیا، یہ سوچ رکھتے ہوئے کہ اوپر والا بلا مہربان ہے، آج نہیں تو کل خواہشات ضرور پوری ہو جائیں گی اور ویسے بھی کتابی معاشرہ ہے کہ روم ایک دن میں تو تعمیر نہیں ہوا تھا تو یوں اس کھادت کو سچا تسلیم کرتے ہوئے ہم جیسے بدحوشی اپنی تمام تر زندگی روم کی تعمیر پر بیتا دیتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمائیے جمیل الدین صاحب! کہ انسان نے ایک آلہ بنایا، جسے کمپیوٹر کہتے ہیں، یہ آلہ انسان ہی استعمال کر رہے ہیں اور اس آلے کا مقصد تو یہ تھا کہ ہر کام ایک معمول کے مطابق، منظم طریق سے بروقت کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے اور نہ صرف مکمل ہو بلکہ تیار میں بھی آجائے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہمارے یہاں پر یہ آلہ اب انسان کو استعمال کر رہا ہے۔“ پھر اُس نے اپنی آرام کرسی سے کھڑے ہو کر میری جان پیٹھ کرتے ہوئے، بڑے سے روزن کے سامنے باہر کھلے میدان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”ہم نے اپنے نیچے والوں کو ابھی تک غلامی میں رکھا ہوا ہے۔ جو ہم کریں گے، یہ لوگ وہی کریں گے۔“

”سر، نظام ہی ایسا ہے! اور پھر انہیں اسی کام کی تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔“ میں ابھی بھی اُس کی سوچ تک رسائی نہیں کر سکا تھا۔

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ قدیم دینا تو ہی انداز کو اپناتے ہوئے ہیں، اب تھوڑی جدیدیت پیدا کیجئے۔“ اُس نے مڑتے ہوئے میری جانب مسکرا کر کہا۔ ”اور یہ جدیدیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے، سر؟“ میں نے براہ راست سوال کر دیا۔

”لیجئے، پھر میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ہم میں اگلے دو گھنٹے تک طویل بات چیت ہوئی۔

☆.....☆.....☆

خاقانی صاحب میرے محسن ہی نہ تھے بلکہ اب میرے سرسبھی تھے۔ اُن کی صحت اس وقت بھی قابل رشک تھی حالانکہ وہ شکر کے عارضہ کے دائمی مریض تھے اور وہ بھی ”حم دم“ کی شکر کے لیکن پھر بھی انہوں نے اور میری ساس صاحبہ نے اس عمر کی بڑھتی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنے مرض پر خوب قابو رکھا ہوا تھا۔

آج اُن کی دعوت تھی۔ ہمارے گھر پر بحیثیت مہمانان خصوصی مدعو تھے۔ لیکن میں نہ جانے کیوں سارا وقت بوجمل بوجمل سا بیٹھا رہا تھا، شاید اکیسویں صدی کا کچھ جو سننے ڈین نے مجھے دو گھنٹے کی طویل ملاقات میں دیا تھا میری روح کو مکمل طور سے مہم نہیں ہو بار ہوا تھا۔ میرے بچے بچے روئے کو خاقانی صاحب نے بھی محسوس کیا تھا اور باتوں ہی کے دوران مجھ سے شکوہ بھی کیا تھا لیکن میں نے دانستہ بات آئی گئی کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے گھر میں دفتری معاملات کو زیر بحث لاؤں بلکہ کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا۔ اسی لئے جب سب مہمان رخصت ہوئے اور امی جان بھی آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تو بستر پر دروازہ ہو کر میں چھت کی جانب خاموشی سے گھورتے ہوئے لیٹا رہا۔ دیک اینڈ تھا اور خالدہ کا ساتھ میر تھا۔ ورنہ عام دنوں میں وہ نائٹ ڈیوٹی کیا

کرتی تھی۔

”آپ کچھ نارمل والے جیل نہیں تھے، آج!“ آخر کار اُس نے بھی مجھ سے شکوہ کر ہی ڈالا تھا اور میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کا آغاز کرے۔

”خالدہ!۔۔۔“ میں نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ وہ میرے ساتھ لیٹے ہوئے یکدم چونک کر میری جانب دیکھی تھی۔ شاید اُسے میری بات عجیب سی لگی ہو۔

”آخر براہم کیا ہے اس نوکری میں؟“ اُس نے میرے بڑے کبل میں ٹھٹھے ہوئے اور اپنے اوپر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

”خالدہ!۔۔۔ ہسپتال میں نیا ڈین آ گیا ہے۔“ ”تو آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔ وہ آیا ہے، اپنے لئے اور آپ کو اس سے کیا، آپ وہاں سے جانے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔“

”تم سچ کہتی ہو، وہ اپنے لئے ہی آیا ہے۔“ میں نے چھت کی جانب سوچتے ہوئے، گھورتے ہوئے کہا۔

”چلیں ایڑی ہو کر میرے ساتھ مکمل کر بات کریں، اس طرح تو آپ کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آسکتی۔“

”تم نے آج مجھے یہ نہیں کہا کہ منہ پر چھ کیوں بجا رکھے ہیں نہیں نے؟“ میں نے اُس کی جانب کروٹ لے کر اُسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے پوچھا۔

”اُس کی ضرورت نہیں، یہ ٹائم آپ کے منہ پر اکثر نظر آتا رہتا ہے، اب مجھے عادت سی ہو گئی ہے۔“ اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ لیا تھا۔ ”چلیں ذرا جلدی سے اُس نئے والے ڈین کی سائیے کہ اُس کا آنا آپ کو کیونکر گراں گزر رہا ہے۔“

”وہ چاہتا ہے کہ میں اُس کی فیم کا حصہ بن جاؤں۔“

”لیجیے، یہ تو احقانہ بات ہے، ہر ڈاکٹر اسی کی ٹیم کا حصہ ہے۔ اس میں چاہنے یا نہ چاہنے والی کون سی بات ہے؟“

”میں نے اس کو اپنی ہانہوں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل وہ چاہتا ہے کہ میں ڈاکٹری کے مقدس پیشے پر کلنگ لگا دوں۔ وہ کروں جو ایک ڈاکٹر کے شایان شان نہیں۔“

وہ اب بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میری جانب حیرت سے مگھرتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”دیکھو خالده، ہم دونوں کا پیشہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم مرض کی تشخیص کے بعد اس کے علاج یا مرض پر ایک خاص حد تک قابو پانے کی کوشش کریں، اسی مطابق مریض کو موثر ادویات دیں۔“ میں نے پھر اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں! ایسا ہی ہے ناں؟“

اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”ہاں ایسا ہی ہے۔“

”لیکن اس ڈین کا کہنا یہ ہے کہ ہم کمپنیوں سے معاہدہ کریں گے، اور جو کمپنیاں ہمیں کچھ دیں گی تو ہم بھی انہیں کمپنیوں کی ادویات اپنے مریضوں کو تجویز کریں گے۔ چاہے ادویات موثر ہوں یا نہ ہوں۔“

”لیکن یہ تو سراسر رشوت ہے اور اپنے پیشے سے غداری بھی۔“ اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جواب دیا۔

”اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو وہ میرا جینا مرنا دو بھر کر دے گا۔ اور تمہیں معلوم ہے خالده! کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔“ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

”پلیز، خالده۔۔۔ میرا مقصد تمہیں ہرگز نہیں پہنچانے کا نہیں تھا، میں تو صرف تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔ باقی جو تم کوگی اور جیسا تم چاہو گی۔“

اس نے اس مرتبہ مجھے اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے جسم کے گداز حصوں سے مس کرتے ہوئے مجھے اپنا آپ ہکا پھکا سا لگا تھا۔ وہ میری حواشی اور میں اس کا آدم۔ ہماری سیدی سادی خوبصورت سی بسی بساتی جنت میں جانے کہاں سے شیطان گھس آیا تھا۔ وہ میرے کاندھے کو سہلاتے ہوئے بولی۔

”میں سوچتی ہوں جمیل، کیا یہ ہے اکیسویں صدی؟ جس کا انتظار انسانوں نے کیا تھا کہ ایک نمایاں تبدیلی آجائے گی۔ انسانی ذہنی خلفشار دور ہوں گے۔ پریشانیوں میں کمی آجائے گی۔ انسان ترقی کرے گا۔ انسانیت کے امور والے فلاحی کاموں میں اضافہ ہوگا۔ زندگی جنگ و جدل اور برائیوں کے عزائم سے پاک ہوگی۔ ایسی فضا ہوگی جس میں ہر آنے والی نئی روح ایک طمانیت اور فخر محسوس کرے گی اور اپنے خالق کا شکر بجالائے گی جس نے اسے اس صدی میں پیدا کیا۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ سوہانے خواب دکھلائے تھے، اُن دجل و فریب کے کارکنوں نے جو اپنے آپ کو نئی دنیا کا حکم سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کو اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جو لوگ ازل کی بھوک کے مارے، رزق اور انسانی خون و جسم میں فرق نہیں سمجھتے۔ واہ جمیل واہ۔۔۔ یہ ہے اکیسویں صدی جس کے آغاز پر دنیا بھر میں ایسا جشن منایا گیا تھا کہ جیسے دنیا کے تمام مسائل حل ہونے کو جا رہے ہیں۔“

”اور ہاں ایک بات یہ بھی تھی، خالده۔ ڈین چاہتا ہے کہ میں پرچہ کمپنی (Purchase Committee) میں شامل ہو کر جاؤں اور کل خریداری میں اس کا 7% اور اپنا 5% حصہ رکھتے ہوئے بل بخواؤں اور ہسپتال کے لئے خریداری کروں۔“

”لیکن یہ تو سرکاری ہسپتالوں میں حکومتی فنڈز کا حق کرنے کی غرض سے وہاں کے بڑے ڈاکٹر زایا کرتے ہیں، آپ کے نجی ہسپتال کو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ یہ تو سراسر ان کا نقصان ہوگا۔“ اس نے پریشانی میں سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

”اگم ٹیکس کم دینا پڑے گا اور دیگر فوائد بھی ہیں۔“ میں نے مختصر کہا۔ ”ہسپتال کے مالک کا وہ داماد بھی ہے۔“

”تو یہ بات ہے!۔۔۔“ اس نے طنزیہ جملہ کہا۔ ”نئی صدی، نئے لوگ، نئی سوچ، نیا آغاز۔“

”ہاں ایسا ہی ہے لیکن تم جیسے کیا مشورہ دو گی؟“

”میرا خیال ہے کہ میں ڈیڑی سے اس بات کا ذکر کرنا چاہئے۔“

”کمال ہے، خالده۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا مطلب ہے کہ کیا سوچیں گے؟“ اس نے مجھے اپنی ہانہوں کی قید سے آزادی بخشے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا اور اس بات کو کرتے ہوئے وہ بخیرہ تھی۔

”مطلب۔۔۔ اگر تمہیں یاد ہو کہ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں بھی تو تمہارے اُن سے بات کرنے کا عمل دخل رہا ہے تو کہیں وہ۔۔۔“ میں نے دانستہ اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔

”جمیل، پلیز۔۔۔ یہ کہامیا بیاں آپ کی ہی تھیں۔ آپ کا حق جو نہیں دے رہے تھے، اُن سے دلوا کر آپ کو دے دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ ڈیڑی کے پاس اس کا توڑ کیا ہے۔“

”اوہ اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ ہمیں یہ باتیں اب ڈیڑی سے کرنی چاہئیں کیونکہ اب ہم بھی نہ تو بچے ہیں اور نہ ہی اتنے غیر مجتہد کہ بار بار ڈیڑی کو پکارتے رہیں۔ میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ ڈیڑی بھی پھر کیا سوچیں گے؟“

”میں کہہ رہی ہوں ناں کہ وہ ایسا کچھ نہیں سوچیں گے، اس وقت فی الحال آپ کو اور مجھے فائدہ کے متعلق سوچنا چاہئے، باقی کے معاملات مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں جانوں ڈیڑی جاتیں اور ہمارا کام۔“

”میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور مجھے سے ”ٹھیک یو“ کہہ کر کروٹ بدل لی۔

”کوئی ناراضگی ہے کیا؟“ میرے عقب سے اس کی آواز سنائی دی اور جب میں نے اس کی جانب کروٹ لی تو اس نے مجھے زور سے اپنی ہانہوں میں بھینچ لیا۔

اس کی ہانہوں میں آکر میں اپنے سارے جمیلے بھول گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خالده کے ڈیڑی نے میرے ٹرانسور پوسٹنگ کے آرڈر جاری کروا دیئے تھے۔ دوسرے شہر لیکن جزواں شہر میں مجھے ترقی دلوا دی تھی اور یہی نہیں بلکہ ایک نئے عالی شان بیٹنگ میں بھی ہیں شفٹ کروا دیا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی خالده کو تحفے میں دیا تھا۔

جب ہم تینوں نے بیٹنگ میں آئے تو خالده کے ڈیڑی نے جبراً ہم سے اپنی دعوت کروائی۔ وہ زندہ دل انسان ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور اب تک ایک مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے بھی اس نئی اسکیم میں بیٹنگ خرید لیا ہے اور اپنی اہلیہ سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اُن کی اگلی اولاد اگر خالده ہے تو اُن کا داماد اور بیٹا میں بھی ہوں۔ دعوت میں جب امی جان، خالده اور اس کی مئی قدر سے فاصلے سے آپس میں بات چیت اور خوش کپوں میں مصروف تھیں تو میں نے اُن سے سوال کیا،

”انگل، ایک بات بتائیے کہ ہم کس شعبے میں محفوظ ہیں۔“

حالیہ واقعات کے تناظر میں وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کافی کی چسکی بھرتے

”میں کہہ رہی ہوں ناں کہ وہ ایسا کچھ نہیں سوچیں گے، اس وقت فی الحال آپ کو اور مجھے فائدہ کے متعلق سوچنا چاہئے، باقی کے معاملات مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں جانوں ڈیڑی جاتیں اور ہمارا کام۔“

”میں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور مجھے سے ”ٹھیک یو“ کہہ کر کروٹ بدل لی۔

”کوئی ناراضگی ہے کیا؟“ میرے عقب سے اس کی آواز سنائی دی اور جب میں نے اس کی جانب کروٹ لی تو اس نے مجھے زور سے اپنی ہانہوں میں بھینچ لیا۔

اس کی ہانہوں میں آکر میں اپنے سارے جمیلے بھول گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

خالده کے ڈیڑی نے میرے ٹرانسور پوسٹنگ کے آرڈر جاری کروا دیئے تھے۔ دوسرے شہر لیکن جزواں شہر میں مجھے ترقی دلوا دی تھی اور یہی نہیں بلکہ ایک نئے عالی شان بیٹنگ میں بھی ہیں شفٹ کروا دیا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی خالده کو تحفے میں دیا تھا۔

جب ہم تینوں نے بیٹنگ میں آئے تو خالده کے ڈیڑی نے جبراً ہم سے اپنی دعوت کروائی۔ وہ زندہ دل انسان ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور اب تک ایک مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے بھی اس نئی اسکیم میں بیٹنگ خرید لیا ہے اور اپنی اہلیہ سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اُن کی اگلی اولاد اگر خالده ہے تو اُن کا داماد اور بیٹا میں بھی ہوں۔ دعوت میں جب امی جان، خالده اور اس کی مئی قدر سے فاصلے سے آپس میں بات چیت اور خوش کپوں میں مصروف تھیں تو میں نے اُن سے سوال کیا،

”انگل، ایک بات بتائیے کہ ہم کس شعبے میں محفوظ ہیں۔“

حالیہ واقعات کے تناظر میں وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کافی کی چسکی بھرتے

☆.....☆.....☆

خالده کے ڈیڑی نے میرے ٹرانسور پوسٹنگ کے آرڈر جاری کروا دیئے تھے۔ دوسرے شہر لیکن جزواں شہر میں مجھے ترقی دلوا دی تھی اور یہی نہیں بلکہ ایک نئے عالی شان بیٹنگ میں بھی ہیں شفٹ کروا دیا تھا جو انہوں نے اپنی بیٹی خالده کو تحفے میں دیا تھا۔

جب ہم تینوں نے بیٹنگ میں آئے تو خالده کے ڈیڑی نے جبراً ہم سے اپنی دعوت کروائی۔ وہ زندہ دل انسان ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور اب تک ایک مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے بھی اس نئی اسکیم میں بیٹنگ خرید لیا ہے اور اپنی اہلیہ سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اُن کی اگلی اولاد اگر خالده ہے تو اُن کا داماد اور بیٹا میں بھی ہوں۔ دعوت میں جب امی جان، خالده اور اس کی مئی قدر سے فاصلے سے آپس میں بات چیت اور خوش کپوں میں مصروف تھیں تو میں نے اُن سے سوال کیا،





## خونی نمبر

فاطمہ خان۔ علی پور مظفر گڑھ

خوبرو حسینہ کے ہاتھوں سے اچانک موبائل نیچے گر پڑا تو حسینہ خوف کی وجہ سے گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی اور پھر اس کے سامنے ایک آتما نمودار ہوئی جسے دیکھ کر حسینہ کی.....

جسم و جان میں خوف کی لہر دوڑ اُٹی اور آنکھوں کو پتھر ادینے والی دہشت ناک روداد

”چھ سال ہو گئے اس اخبار میں کام کرتے ہوئے محال ہے کہ ایک دن بھی پاس ہمارے کام سے خوش ہو، اور بھول کے بھی تھوڑی بہت ترقی دی ہو۔“ کرن نے ایک بھاری فائل جانی کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”جانی اور کرن کو مصافحت میں آئے ہوئے کم و بیش چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اتفاق سے وہ بہت اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خواب بھی ایک ساتھ ہی دیکھنے لگے تھے مگر کرن کا کہنا تھا کہ جب تک وہ ایک گھسے پے بھائی سے تھوڑا اور ترقی نہیں کر لیتا تب تک جانی سے شادی نہیں کرے گا۔ جانی جس حال میں تھی خوش تھی۔ اس نے اونچے اونچے خواب بھی دیکھے ہی نہ تھے۔ مگر کرن کی اس شد کے سامنے اس نے تھپیر ڈال دیئے تھے۔ وہ بخوبی

بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔“

”آپ نے آج تک کتنوں کو رشوت دی ہے؟“ سوال احمقانہ سا تھا لیکن میں نے کر دیا۔

”سرکاری محکموں میں تو ہر قدم پر اور نجی کام میں بعض جگہ اور بعض جگہ بالکل بھی نہیں۔“ انہوں نے کچھ لگی بندھی رکھے بغیر جواب سے مجھے نوازا دیا۔

”انگل، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں بھگتا ہوں کہ میں اس نظام میں شاید۔۔۔“

”Miss fit ہوں۔۔۔“ انہوں نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا تو میں نے انہیں سر ہلا دیا۔ ”ہاں تو صحیح ہے، تم واقعی مس فٹ ہو۔ بلکہ تم جیسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو پردیس میں ہیں اور جو لوگ یہاں آئے ہیں اور انہوں نے کوئی مقام حاصل کیا ہے تو شرانکھ کے ساتھ۔ ورنہ وہ بھی یہاں نہ بٹھرتے۔“

”کیا یہ خوفناک بات نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہو رہی ہے؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے۔ کالا دمن جس معیشت میں عام ہو جائے، اُس کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں، بیٹا ایسوں کا تو، نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں۔“

وہ تو اپنی بات روانی میں کہہ گئے تھے لیکن مجھے ٹھنڈے سپنے آنے لگ گئے تھے کیونکہ مجھے اپنے وطن سے شدید پیار رہا تھا اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ وطن میرا آبائی گھر ہے۔ مجھے ان کی بات سن کر یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے ایک زلزلہ آیا، 18 اکتوبر 2005 والے زلزلے سے بھی شدید زلزلہ اور وہ سب کچھ اور سب کو زمین یوں دھسا کر کرتے ہوئے نکل گیا۔

انگل نے یہ کیا کہہ ڈالا تھا۔

”ایسوں کا تو بیٹا نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں!۔“



ہوئے پوچھا۔

”تمہارا مطلب یہ کہ کرپشن ہے؟“

”جی ایگزیکٹ کی! میں نے جواب دیا۔

”بیٹا میں ایک صنعت کار ہوں۔ اس میدان میں پرانا کھلاڑی ہوں۔ اور جب سے اس میدان میں ہوں تو تب سے میں اپنا ہر کام نکھوانے کے لئے دانش ڈالتا آیا ہوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟“

”جی!۔۔۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے اُن سے پوچھا۔ ”اور اگر کوئی دانش ڈالے تو؟“

”تو پھر کوئے کا کیا بنے گا؟“ انہوں نے میری آنکھوں میں نہایت رعب دار انداز میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”لیکن انگل، جب میں جرمنی میں تھا تو وہاں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ سب ایک نظام کے تحت حکومت اور سرکاری مشینری کے قابو میں تھا اور۔۔۔“ میری بات کاٹتے ہوئے وہ بولے۔

”روم میں وہی کرو، جو رومی کرتے ہیں۔“ پھر وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور ویسے بھی تم ہنس کی مثال دے رہے ہو۔ یہاں تو کوئے زیادہ ہیں اور ہنس کم۔ کوا، کوا ہی رہے تو بہتر ورنہ سب نے کیا کہتے ہیں، کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا!“

”کیا یہ نظام بدل سکتا ہے؟“ میں نے دو ٹوک سوال کر دیا۔

”نظام ایک قوم بدلتی ہے۔ نظام کو ایک بھیڑ، جھوم، اختلاقی سوچ رکھنے والے لوگ نہیں بدلتے۔ بلکہ آبشار کی جتنی دھارا کے ساتھ خود بھی بہے جاتے ہیں، کیونکہ یہی بات اُن کی نظر میں اور ہر دیکھنے والے کی نظر میں آسان ہے۔ لیکن اہل نظریہ کہتے آئے ہیں کہ نظام ایک سوچ کے زیر نگیں رہتے ہوئے بدلا جاتا ہے، مختلف افکار رکھنے والے تو شاید عمر بھر اپنا آپ بدلنے کی





## پراسرار مخلوق

ایس امتیاز احمد - کراچی

منفی سوچ رکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی جانور کو عام جانور سمجھتے ہوئے اس پر سختی نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ جانور کوئی اور نادیدہ مخلوق ہو جو کہ.....

ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ سبق ہی سبق ہے

یہ کہانی اس واقعہ سے متعلق ہے جو گزشتہ سال گرمیوں کے مہینے میں ہمارے ساتھ پیش آیا تھا۔ گرمیوں کے مہینوں میں جب ہم کزنز اپنے آبائی گاؤں نورپور گئے تھے۔ جہاں ہمارے پردادا، دادی کا بہت بڑا مکان ہے، دراصل وہ شہر کی ہنگامہ پرور اور گرد آلود فضاؤں میں رہنے کی بجائے گاؤں کی سرسبز و تازہ فضا اور ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تاجا جان اور ابو کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شہر میں ہماری بڑی سی کونٹی میں آکر شہر کی آلودہ فضاؤں میں بیمار ہونا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ سویرس کی عمر کے باوجود وہ دونوں ابھی تک صحت مند اور چاق و چوبند ہیں چونکہ نورپور پنجاب کا ایک دور دراز مگر انتہائی سرسبز علاقہ ہے لہذا ہم سب ہر سال گرمیوں کی چٹھیاں گزارنے نورپور آتے ہیں لیکن گزشتہ سال

چھٹیں سنیں، بچپانے میں اس نے بالکل دیر نہ لگائی۔ کیونکہ یہ جانوی کی اپنی چیخنے کی آوازیں تھیں جو اسے موبائل سے آ رہی تھیں۔ موبائل اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔

چند ہی لمحوں میں اس نے سیاہ لباس میں لمبوس ایک آتما کو اپنے سامنے دیکھا جس کے لمبے نوکیلے دانت کسی ڈریکولا سے مشابہت رکھتے تھے جانوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سخت ندھی کہ وہ بھاگ جائے۔

آتما اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کے لمبے نوکیلے دانت منہ پر صاف نظر آ رہے تھے حلقوں میں آنکھوں کا نام و نشان تک نہ تھا اور خشار ایسے جیسے کسی نے سارا گوشت نوچ لیا ہو۔

خونی آتما جانوی پر ہل پڑی۔ کرن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو خون میں لت پت جانوی تڑپ رہی تھی کیونکہ جانوی آتما کا شکار بن چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کرن تڑپتی ہوئی جانوی کو جلد از جلد اسپتال لے گیا مگر تب تک جانوی زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد تعقدیق ہوئی تھی کہ کسی درندہ نے اپنے نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے جانوی کی گردن کو بھجھوڑ ڈالا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جانوی کی لاش کرن کو دے دی گئی تھی اور اس نے اس کی آخری رسومات ادا کر دی تھیں۔

کرن نے جانوی کی موت کے بعد صحافت کا کام چھوڑ دیا تھا اور مزدوری کرنے لگا تھا۔ وہ جانوی کی موت کا ذمہ دار خود کو ہی سمجھ رہا تھا۔ ایک جانوی ہی تھی جو اس دنیا میں اس کا واحد سہارا تھی اب وہ بھی اس کے پاس نہ رہی تھی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا اور جانوی کو یاد کرتا رہتا۔ اس کی زندگی ایک چلتی پھرتی لاش کے علاوہ کچھ نہ تھی۔



اٹھایا اور کرن کو کال کی، کرن نے جلد ہی کال ریسیو کر لی تو جانوی بولکھلاہٹ میں بول اٹھی۔ ”کرن مجھے بچاؤ وہی رنگ..... وہی رنگ نمبر میرے موبائل پر بار بار آ رہا ہے۔ مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔ کرن پلیز! جلدی آ جاؤ۔ کرن پلیز۔“

کرن پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ ”میں ابھی آ رہا ہوں جانوی تم پریشان نہ ہو میں ابھی آ رہا ہوں۔“ جانوی نے موبائل واپس ٹھیک پر رکھ دیا۔ اس کے حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ سردی کے باوجود بھی اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس نے ٹھیک پر سے پانی کا جبک اٹھایا تو وہ خالی تھا، وہ بچن کی طرف مڑی۔ پانی کا گلاس اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔

جانوی اور کرن کا کوئی رشتہ دار نہ تھا، وہ دونوں ہی تنہا رہے تھے۔ والدین نہ جانے کب حادثے میں گزر گئے تھے۔ جانوی کے اور کرن کو ایک دور دراز کے رشتہ دار نے پالا تھا جو کب کا مر چکا تھا۔

زندگی میں پہلی بار جانوی کو اپنے گھر کی تنہائی سے خوف آیا تھا۔ وہ خوف سے تقریباً کانپ رہی تھی۔ بچن سے جب وہ واپس لوٹی تو ایک مرتبہ پھر اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے دیکھا تو وہی رنگ نمبر بج رہا تھا۔ جانوی نے غصے اور ڈر کے ملے جلے جذبات میں فون دیوار پر دے مارا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ مگر یہ کیا چند ہی لمحوں میں موبائل فون دوبارہ مکمل تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر بج اٹھا۔

☆.....☆.....☆

جانوی کو اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ ضرور کسی آتما کا چکر ہے۔ موبائل فون کی مسلسل بجتی ہوئی رنگ ٹون اسے وحشت زدہ کئے جا رہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کال ریسیو کرے گی۔

بھرپور جرأت اور بہادری سے اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس نے اپنے موبائل سے چند دھڑاٹ



نور پور میں پیش آنے والے واقعہ نے ہم سب کزنز کو بے حد خوف زدہ کر دیا۔ بالخصوص مجھ سے چھوٹا فرحان جو مزاجاً چلبلا ہوا کرتا تھا اس واقعہ کی وجہ سے پورا سال گزرنے کے باوجود اب تک سہا ہوا رہتا ہے۔ دراصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہر سال کی طرح گزشتہ سال بھی نويس جماعت کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب کزنز یعنی میرے تایا ریاض احمد اور میرے ابو بشیر احمد شہر میں ایک ہی کوشی میں اوپر نیچے کے پورشن میں اپنی اپنی فہمیلی کے ساتھ رہائش پذیر ہیں اور ہمارا لیدر گارمنٹس کا کاروبار بھی ساتھ ہی ہے۔ چونکہ تائی جان اور امی آپس میں بہنیں بھی ہیں اس لئے دونوں خاندانوں میں مثالی محبت اور یکجہت ہے جس کے باعث ہم سب کزنز ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ تایا جان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جبکہ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن۔

بہر حال فاضل انگریز سے فارغ ہوتے ہی ہم سب کزنز چھوٹے ماموں جو ابھی کالج میں زیر تعلیم ہیں، کے ساتھ نور پور گاؤں روانہ ہوئے چونکہ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اس لئے ہم سب ماموں کے ساتھ بیٹھے سفر کا انجوائے کرتے ہوئے آپس میں کہیں لڑاتے ہوئے جارہے تھے۔ تینوں لڑکیاں یعنی میری بہن شمع اور تابا زاد کی شاد اور روشنی پھیلی سیٹوں پر اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ہم سب پہلے اسکول کے فصول میں اتنے مگن تھے کہ سفر کتنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ جب نور پور گاؤں کی حدود میں گاڑی داخل ہوئی تو ڈرائیور نے ہی ہمیں سرسبز پہلاتے کھیتوں کی جانب متوجہ کیا۔ صاف ستھری پکی سڑک کے دونوں اطراف گندم کی فصل لہلہا رہی تھی اور چچ پلڈنڈی نما سڑک سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ تب ہی ڈرائیور کے کہنے پر ہم سب بے ساختہ کھڑکیوں کی جانب لپکے اور پردے ہٹا کر باہر کے خوب صورت سرسبز نظارے کی دلکشی میں محو ہو گئے تھے۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ سنہری

بالیوں کے ڈھیر جیسے سورج کی روشنی میں سونے کی طرح دکھ رہے تھے۔ حالانکہ یہ اور ایسے بے شمار دلکش مناظر ہمارے لئے نئے نہیں تھے لیکن قدرت کے ان دلکش فطری مناظر میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جتنی بار دیکھو یہ منظر آنکھوں کو کھلے اور دل کو تازگی بخشنے ہیں۔ جیسے صاف ستھری آلودگی سے پاک دھلی شفاف فضاؤں سے روح تاز اور شفاف ہو جائے۔

بہر حال ڈرائیور کافی تیز رفتاری سے آگے کا سفر طے کر رہا تھا کیونکہ دوپہر سر پر تھی اور ہم سب کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نور پور گاؤں کے داخلی چھانک پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں رک کر ماموں نے حلوائی کی دکان سے ڈھیر ساری مٹھائی اور دادی کی پسندیدہ مٹھائی رس ملائی خریدی تھیں۔ پھر گاڑی آگے روانہ ہوئی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ہم ناریل، کیلے، امرود، آم اور چنیکو کے سرسبز درختوں میں گھرے بڑے سے باغ کے درمیان بے سرخ آبنیوں کے بڑے مکان کے سامنے موجود تھے۔ ڈرائیور کے برآمدے میں گاڑی پارک کرتے ہی گھریلو ملازمین نے آکر گاڑی سے سامان اتارنا شروع کیا اور ہم سب نے اندر کی جانب دوڑ لگا دی۔ جہاں دادا، دادی اور گھر کے سب سے پرانے ملازم سلیم چاچا بے چینی سے ہم سب کی آمد کے منتظر تھے۔ ہم سب بڑے ہال میں پہنچے تو ساڑھے چھ فٹ کے لمبے چوڑے دادا اور عظیم دادی نے ہم سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ڈھیروں پیار کیا۔ جبکہ ملازمین ہماری آمد پہلے ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ تب دادی جان نے ہم سب کو کھانا کھانے کے کہا۔

”چلو بچو! پہلے تم لوگ نہادھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ پھر سب مل کر بڑے ہال میں کھانا کھائیں گے۔“ دادی کا باآواز بلند فرمان جاری ہوتا ہی سب کے فرمانی پروگرام شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا فرحان بولا۔

”دادی میں نے گڑوالے چاول کھانے ہیں۔“ لہذا پھر حان کو دیکھ کر ڈیشان اور عمر بھی پیچھے نہیں رہے۔ ”اور دادی! ہمیں کھانے میں آم کی بھی چٹنی لگنی کھانی ہے۔“

ڈیشان اور عمر کی اسی مصیبت پر میں اور ماموں جی کھول کر بیٹھے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بڑے ہال میں گاؤں کے روایتی کھانوں سے اٹھتی اشتہار انگیز خوشبوؤں نے سب کی بھوک بڑھا دی تھی اور کچھ ضرورت سے زیادہ کھانے کے باعث سب ہی لیلوہ کی غرض سے سونے مشترکہ کمرے میں آرام کے لئے چلے آئے جبکہ لڑکیاں بھری دوپہر میں اپنی دلچسپ سرگرمی یعنی آم اور پینل کے کتنے درخت پر ڈالے گئے جھولوں پر چھوٹے چل دی تھیں۔

شام کو پانچ بجے منہ ہاتھ دھو کر ہم سارے لڑکے ماموں کے ساتھ دادی اور دادا سے اجازت لے کر گاؤں کی نہر کی جانب چل پڑے تھے۔ جہاں ہماری ذاتی زمینیں ہیں چونکہ فصلوں کو پانی دیا جا چکا تھا اس لئے نہر میں پانی زیادہ نہیں تھا مگر ماموں کے منع کرنے پر ہم لڑکوں نے نہر میں نہانے سے گریز کیا۔ الہست کھیتوں میں لگے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی سے صاف خوب لطف اندوز ہوئے۔ وہاں موج مستی کرتے ہوئے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا اور ساڑھے چھ بجے کلچا سرمنی اندھیرا پھیلنے ہی ارد گرد کے گھروں سے دھنکے تندوروں میں پتی روٹیوں کی سوندھی سوندھی ٹھنک اور کھلی فضاء کی ٹھنڈک کے باعث ہلکی خشکی نے ہم سب کو گھر کی جانب چلنے پر مجبور کر دیا۔ لہذا ماموں نے ہم سب لڑکوں کو بلا کے اکٹھا کیا، پھر پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ ابھی ہم گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھے کہ وہاں موجود ایک اندھے کنویں کے پاس ایک کالی بلی کو بیٹھے دیکھا۔ اس بلی کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں، جیسے کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی ہوتی آنکھیں ہوں۔ میں نے بڑے غور سے رک کر اس بلی کو دیکھا اور ماموں کو بھی

بتایا تھا لیکن جواب ماموں بولے۔

”دیکھو کاشان! یہ گاؤں ہے اور یہاں اب بھی پرانے زمانے کی توہم پرستی کے واقعات کو مانا جاتا ہے۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے بلی سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔ فرحان کے مزاج کو تم جانتے ہو، ہمیں اس کی کسی شرارت سے ہم سب کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

ابھی ماموں نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ فرحان نے زمین سے پتھر اٹھا کے کنویں کے پاس بیٹھی کالی بلی کو مارا جو زمین بلی کی دہائی آنکھ پر جا کے لگا اور وہ زور کی غراہٹ کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس سے پہلے کے ماموں، فرحان کی اس حرکت پر سرزنش کرتے بلی کی خوف ناک غراہٹ سے سب نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

گھر پہنچ کر ہم سب راستے کے اس معمولی سے واقعہ کو بھول بھی چکے تھے کیوں کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ معمولی سا واقعہ ہمارے لئے بہت بڑی سبق آموز کہانی بن جائے گا۔

چونکہ گاؤں میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور سویرے اٹھ بھی جلد جاتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے بعد ہی سلیم چاچا نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تھی، لہذا ہم سب معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھو کر بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کی مشترکہ فرمائش تھی کہ آج دادی جان سے کوئی پرانے زمانے کا خوف ناک قصہ یا کہانی سنیں گے۔ لہذا سب نے اندر کمروں میں سونے سے انکار کر دیا تھا اور کچھ اس طرح روز فضا میں جھپٹے، لہذا ملازم سے کہہ کر ہم سب کے لئے گھر کے کھلے دالان میں چار پائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ ہم سب دالان میں پاس پاس چار پائیوں پر بیٹھے دادی کے عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے منتظر تھے حالانکہ وہ روز ہی ہمیں باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ فجر

## گوھر آبدار

اللہ تعالیٰ کی عبادت رات کے پہلے حصے میں پھول اور پھلے حصے میں پھل ہوتی ہے کیوں کہ وہ وقت ہوتا ہے جب دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہیں۔

وہ بد بخت روح جس سے رب تعالیٰ نے منہ موڑ لیا ہو اب وہ خواہ جس قدر افسوس کرے اور غم میں گھلتی رہے رب تعالیٰ کو دوبارہ پانا اس کے نصیب میں نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ان ہی کو ملتی ہے جو راتوں کو جاگ کر فکر کے ساتھ ذکر الہی کرتے ہیں۔

بے زاری اور بے بسی کے عالم میں ترک دنیا کوئی کمال نہیں اصل کمال تو یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اللہ سے لولگیائی جائے۔

(شرف الدین جیلانی - شذوالہ یار)

انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ پھر تجھے ضرورت کیا ہے، ادھر ادھر گھومنے کی۔ آ میں حیرا زخم صاف کردوں۔“

دادی اس کالی بلی سے باتیں کر رہی تھیں جیسے کسی انسان سے باتیں کر رہی ہوں۔ میری خوف سے کھلمی بندھ چکی تھی کیونکہ آنا فانا دادی نے دلوں بازو پھیلا کے اس کالی بلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اس کا زخم صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ میں وہیں کھڑا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دادی

دیکھنے اس کالی بلی کو پتھر مار کے اچھا نہیں کیا۔ جیسے وہ کالی بلی حقیقت میں جانور نہیں کوئی اور مخلوق ہو، کیونکہ جس وقت فرحان نے اس کالی بلی کو پتھر مارا تھا جب اسے ٹپ تک اگر وہ بلی عام جانور تھی تو اس کا خون خشک ہو جانا چاہئے تھا مگر بلی کی آنکھ سے اب بھی تازہ خون پھلک رہا تھا جس کے باعث مجھے خوف کے ساتھ ساتھ کسی انہونی کا بھی ڈر تھا۔ بہر حال دادی کے چونک کر دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھنے اور پھر خاموشی اختیار کر لینے پر مجھے بھی اچھا ہوا تھا۔ دادی نے بلی کو دیکھ کر انجانے پن کرنا شروع کیا؟

اگر بلی ہمیں نظر آ رہی تھی تو انہیں بھی نظر آئی ہوگی پھر انہوں نے اسے نظر انداز کیوں کیا؟ حالانکہ بلی کی جانب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اچانک الجھنے کے ساتھ فکر مند بھی امنڈ آئی تھی۔ ان کی خاموشی انہیں نے دانستہ فرحان کو دادی کے ساتھ سونے کی تاکید کی تھی۔ تب جا کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ جانے کیوں؟ مجھے یقین تھا کہ دادی کی موجودگی میں وہ کالی بلی فرحان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد ہم سب گہری نیند میں چلے گئے، شاید کوئی رات تین بجے کا وقت ہوگا تب اچانک پیاس لگنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا اور ماموں کا پلنگ ساتھ ساتھ بچھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر بے ساختہ دادی کے پلنگ پر گئی تھی اور وہاں ان کو نہ پا کر میں بے اختیار اپنے پلنگ سے چلاٹک لگا کے اتر آفرحان کو قریب سے صبح سلامت دیکھ کر میری جان میں جان الٹی تو میں دادی کی تلاش میں آگے بڑھا اور جب میری آنکھیں خوف اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب میں نے دادی کو سامنے صحن کی دیوار کے پاس کھڑے دیکھا۔ میں میکا کی انداز میں چلا ہوا ان کے کچے پاس پہنچا تو وہ کالی بلی سے کہہ رہی تھیں۔

”یہ تیری آنکھ کو کیا ہوا؟ تیرے زخم سے تو خون بہہ رہا ہے کہ کہیں کسی شرابی بچے نے تو نہیں مارا۔ دیکھ تو اس کو معاف کر دینا۔ معصوم بچے فرشتے ہوتے ہیں۔“

دراصل وہ کالی بلی مسلسل دیوار سے ٹیک لگائے فرحان کو گھور رہی تھی اور تب ہی میرا ہاتھ لگا تھا۔ فرحان نے ہی اس بلی کو پتھر مار کے ڈھی کیا تھا۔

”کہیں یہ بلی فرحان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“

میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا اس لئے میں نے فوراً سے پتھر سب کو خطاب کر کے کہا۔

”بہت رات ہوگئی ہے، مجھے تو اس کھلے آسمان کے نیچے سردی لگ رہی ہے، چلو ہم سب اندر چل کے سوتے ہیں۔“

میرے یہ کہنے پر دادی کے ہاتھیں گھٹنے پر سر رکھے ڈیٹان اور عمر نے منہ بسور کے مجھے دیکھا۔ وہ قصہ سچ میں ادھورا چھوڑ کر وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ تھے اور فرحان بھی ان کا ہموا بن گیا تھا لیکن میرے اصرار پر بے اختیار دادی نے سامنے دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھا تھا اور اچھبے میں رہ گئیں شاید انہوں نے کچھ محسوس کیا تھا۔ ورنہ ہم نے کالی بلی کی وہاں موجودگی کے بارے میں دادی کو نہیں بتایا تھا مگر جانے کیسے انہیں پتہ چل گیا تھا؟ اور انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی تھی۔ البتہ ان سب کی ضد کی وجہ سے مجھے اور ماموں کو بھی اس رات وہیں چار پائوں پر سونا پڑا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا الارم دے رہی تھی اس لئے میں نے ڈیٹان، عمر اور فرحان کی ضد کی وجہ سے بالخصوص فرحان کو دادی کے ساتھ ان کے بڑے سے پلنگ پر سونے کے لئے کہا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا اور چونکہ سب گھر بھر کا لاڈلہ بھی تھا اس لئے جانے کیوں مجھے اس کی حفاظت کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔

جانے اس کالی بلی کی آنکھوں میں کیسی وحشت تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔ میں تو ہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا لیکن بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر فطری لگاؤ اور محبت کے باعث میرے دل میں فرحان کی فکر بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فرحان

میں باقاعدہ سر پر کھڑے ہو کر سب کو نماز کیلئے اٹھاتی تھیں جن میں سے میں اور ماموں ہی، بمشکل اٹھ کر نماز پڑھتے تھے پھر دوبارہ بلی تان کے سو جاتے تھے۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد چکن کے سفید براق سوٹ میں دادی اپنی مخصوص لاٹھی ہاتھ میں تھا سے چلی آئیں۔ تو سب نے مشترکہ ”دادی کہانی سنائیں۔“ کا نعرہ بلند کیا۔ جواباً دادی اپنے پر نور چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئیں جبکہ کچھ فاصلے پر اپنے پلنگ پر بیٹھے دادا گرم حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری فرمائش سن کر دادی سے مخاطب ہو کر بولے۔

”سنو بھگوان! کوئی سچ سچ کی خوف ناک کہانی سن کر بچوں کو پریشان مت کر دینا۔ بس اپنے اور میرے بچپن کا کوئی واقعہ سناؤ۔ ورنہ رات کا وقت ہے، بچے ڈر جائیں گے۔“ جانے دادا جان کی سرزنش میں کیا بات تھی کہ مجھے لگا انہوں نے دانستہ دادی جان کو، کسی خاص بات سے روکا ہو کیونکہ دادی نے جواب دیئے بغیر بس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا اور دادا سمجھ گئے تھے اس لئے پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو گئے۔

پھر دادی نے واقعی اپنے بچپن کا واقعہ سنانا شروع کیا جب وہ اپنے پھلوں کے باغ میں بھری دو پہری میں گھوما کرتے تھے اور کچے امرود اور کیر پاؤں توڑا کرتے تھے۔ ابھی وہ ایسا ہی ایک واقعہ سن رہی تھیں کہ میری نظر والا ان کی منڈیر پر پڑی کالی بلی پر پڑی۔

چاند کی روشنی میں وہ بلی مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور بغور دیکھنے پر میں چونکا بلکہ اچھل پڑا تھا۔ یہ وہی بلی تھی جو آج نہر سے واپسی پر راستے میں کنویں کے پاس موجود تھی اور جسے فرحان نے پتھر مارا تھا۔ اس بلی کی آنکھ سے ابھی تک سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر بے اختیار خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ساتھ بیٹھے ماموں کو کہنی مار کے دیوار کی منڈیر پر پڑی کالی بلی کی جانب اشارہ کیا جب ماموں بھی بری طرح چونکے کیونکہ میری طرح انہوں نے بھی اس کالی بلی میں غیر معمولی پراسراریت محسوس کی تھی۔

بار بار اسے ایک ہی تاکید کر رہی تھیں کہ ”دیکھ شامو! جس بچے نے بھی یہ شرارت کی ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا اسے کیا معلوم کہ تو کون ہے؟ اور ہاں شہر سے بچے آئے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ سب یہاں ہیں، تو یہاں مت آنا، وہ بے چارے خوف زدہ ہو جائیں گے۔“

دادی اپنی بات مکمل کر کے کالی بلی کو دوبارہ دہرایا کہ ”تو اپنے ٹھکانے پر جا۔ صبح ہونے والی ہے، کسی بچے کی آنکھ مل گئی تو وہ طرح طرح کے سوال کریں گے۔“

دادی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور جانے کہاں سے میرے اندر راتنی طاقت آئی تھی کہ میں اٹنے پاؤں وہاں سے تیزی سے آ کر واپس اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واقعی صبح ہونے والی تھی کیوں کہ فجر کی نماز کے لئے دادی وضو کرنے اندر جا چکی تھیں۔ مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ مجھے فرحان کی فکر ستا رہی تھی کیونکہ دادی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کالی بلی (جو کہ اصل میں پراسرار مخلوق تھی) اس کو فرحان نے پتھر مار کے ڈھی کیا ہے۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ مجھے دادی کو بتا دینا چاہئے کہ بلی کو فرحان نے پتھر مار کے ڈھی کیا ہے۔

دراصل میرے دل میں اب بھی یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ پراسرار مخلوق فرحان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگرچہ دادی نے اس کالی بلی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس انجانے بچے کو معاف کر دے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے لیکن میرے دل کو بے چینی لاحق تھی۔ اس لئے صبح ہوتے ہی میں نے دادی کو چالیا۔ وہ فجر کی نماز اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں ان کے فارغ ہوتے ہی میں نے ان سے سوال کر ڈالا۔

”دادی! رات آپ اس کالی بلی سے جو باتیں کر رہی تھیں وہ میں نے سن لی تھیں۔ دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کالی بلی کو فرحان نے پتھر

مار کر ڈھی کیا تھا۔ پہلے میں بھی اسے عام جانور سمجھا تھا لیکن کل رات آپ کو اس سے باتیں کرتے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی عام بلی نہیں بلکہ کوئی پراسرار مخلوق ہے آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہیں وہ فرحان کو نقصان نہ پہنچا دے۔ پلیز آپ مجھے بتائیں آخر یہ ماجرا کیا ہے؟“

میرے اصرار پر مجبوراً دادی کو اس کالی بلی کی حقیقت بتانی پڑی۔

”کاشان جسے تم بلی سمجھ رہے ہو اور جسے فرحان نے پتھر مار کے اس کی ایک آنکھ ضائع کر دی ہے وہ دراصل ایک ہندو بچے کی آتما ہے۔ شہر کے بڑے گھسے لوگ جن، بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں کچھ ٹیک اور کچھ شرارتی، مگر یہ ہندو بچہ ہمارے گھر کا وفادار ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے گھر کے دوسرے بچوں کی طرح سمجھا۔ اسے ملازم سمجھ کر بدسلوکی یا تعزیر نہیں کی۔ اسی لئے وہ مجھ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک رات وہ گاؤں میں لگے میلے سے واپس آ رہا تھا، راستے میں کسی چور لیٹرے نے اسے لوٹ لیا اور اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین کر اسے زندہ کنویں میں پھینک کر فرار ہو گیا۔ جب وہ گھر واپس نہ لوٹا تو تمہارے دادا نے چاروں طرف ملازمین دوڑا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن واپس ہو کے واپس آ گئے۔“

تب چار دن بعد گھر سے قریب اندھے کنویں سے اس کی مٹی سڑی لاش ملی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تمہارے ابو اور چچا بچے تھے۔ وہ ہندو بچہ ان ہی کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ اس کی بے بسی کی موت کا ہم سب کو بہت صدمہ تھا، بے چارہ اندھے کنویں میں دن رات زندہ پڑا جانے کب تک تروتار پنا ہوگا پھر جا کے بھوک پیاس اور زخموں سے چور بدن سے روح نکلی ہوگی۔ چونکہ ہندو دھرم میں دوسرے جنم کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے اس لئے گاؤں کے سب ہی لوگوں کا اس کی ناگہانی موت پر کہنا تھا کہ یہ بچہ دوسرا جنم لے کر اپنے

حال سے اپنی موت کا بدلہ ضرور لے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے چھانکے پر ایک انجان لاش پڑی، جس کی آنکھیں کسی جانور نے کھینچیں تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص کسی دوسرے گاؤں کا چوراہا تھا۔ چونکہ دوسرے جنم میں اس نے بلی کی شکل لی تھی اس لئے تب ہی اپنی موت کے کچھ عرصے بعد سے اس کالی بلی نے مستقل گھر سے اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا جسے تم کالی بلی سمجھ رہے ہو۔

”دراصل یہ وہی ہندو بچہ ہے۔ وہ تمہیں بلی نظر آتی ہے مگر میں اسے اسی انسانی روپ میں دیکھتی ہوں جس میں وہ میرے گھر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ صرف انسانی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ شاید میری محبت اور انسانی ہمدردی کے صلے میں قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ سب کو ایک جانور بلی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے لیکن میری آنکھیں اسے اپنے شامو کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ بس یہی حقیقت ہے اس کالی بلی کی، لیکن فرحان کو اسے مارنا نہیں چاہئے تھا کیا ہوا جو وہ جانور کی شکل میں نظر آتا ہے پر بے توانہ کی مخلوق! اور اللہ کی رحمت نے زبان مخلوق کو بھی جان بوجھ کر تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ کیا پتہ؟ کوئی دوسری مخلوق کے روپ میں موجود ہو۔“

تب میں نے فکر مند لہجے میں جوابا کہا تھا۔ ”لیکن دادی اب فرحان کو وہ مخلوق نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ پلیز آپ کچھ کریں مجھے فرحان کی بہت فکر ہے۔“ میری پریشان صورت دیکھ کر دادی بھی فکر مند ہو گئیں تھیں اور فوراً اٹھ کر میرے ساتھ باہر والان کی جانب دوڑی تھیں مگر شاید ہماری باتوں میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب ہم وہاں والان میں پہنچے تو فرحان لابی کے پلنگ سے غائب تھا۔ خوف سے میری چیخ نکلی تھی اور انجانے دکھ نے میری آنکھیں اشکبار کر دی تھیں۔

میری چیخ کی آواز سے سب اٹھ گئے اور آٹا ٹافا

فرحان کی کشمکش کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہم سب اسی وقت فرحان کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ تب اندھے کنویں کے قریب جہاں پرفران نے کالی بلی کو پیٹنے دیکھ کر پتھر مارا تھا۔ وہیں پرفران بے ہوش کی حالت میں ملا۔ جب ماموں نے اس کی پشت پکڑ کے سیدھا کیا تو ہم سب کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں کیونکہ فرحان کی آنکھیں نکال لی گئیں تھیں اور اس کے خالی دیدوں کی جگہ گڑھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اور ماموں نے فرحان کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اسی وقت اسے لے کر گاؤں میں شہر کے اسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹر کی بروقت ٹریٹمنٹ سے فرحان کی جان بچ گئی تھی لیکن وہ اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو چکا تھا۔ بس ایک معمولی سی شرارت نے فرحان کو ہستی سکرانی دنیا کو اندھیروں میں بدل دیا تھا۔ اس دکھ اور صدمے نے ہم سب کو ادھوا کر دیا تھا۔ مگر دادی نے پڑ پڑتے کی محبت میں اس کالی بلی کو جو حقیقت میں وہ ہندو بچہ تھا جسے اپنے اچھوں سے دادی نے پال پوس کے بڑا کیا تھا ہمیشہ کے لئے گھر بدر کر دیا تھا اور اپنی اس سزا کے بعد وہ کالی بلی پھر بھی اس گھر تو دور گاؤں میں بھی دکھائی نہیں دی۔ اس نے فرحان سے اس کی شرارت کا بدلہ تو لے لیا تھا لیکن دادی کی محبت و شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

بس تب سے خاندان کے سارے بچوں نے کسی بھی بے زبان جانور کو مارنے یا تکلیف پہنچانے سے گریز کیا۔

اگرچہ فرحان کی ذات کا اتنا بڑا نقصان ہو چکا تھا مگر اس مخلوق نے اس کی جان بخش دی تھی۔ ہم سب کے لئے یہی کافی تھا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد سے اس بلی کو سب نے پراسرار خونی بلی کے نام سے یاد رکھا۔





## محبتیں شمار کرنا

محمد قاسم رحمان - ہری پور

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے اس لفظ کو احاطے کرتی اپنی نوعیت کی دل سے محو نہ ہونے والی برسوں یاد رہنے والی حقیقی کہانی

کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت میں پڑ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا، سبق آموز کہانی



نمرتا روتی رہی کچھ نہ بولی۔  
فارگاڑ سیک نمرتا مت رو۔ مجھے تکلیف ہوتی  
کے لئے ٹشو دے رہا تھا۔  
”رونا بند کرو نمرتا بس کرو کیا رونے سے یہ مسئلہ  
حل ہو جائے گا؟“  
نمرتا بولی۔ ”ہم لڑائیاں تو رونے کے سوا کچھ بھی  
کے لے سکتی ہیں ایک عورت اذل سے قربان ہی تو ہوتی ہوئی  
آتی ہے۔ مردوں کی اتنا کی تسکین کے لئے عورت کی  
قربانی ہی اس دنیا کا دستور ہے خواہ وہ مرد بھائی کے  
روپ میں، شوہر کے روپ میں یا باپ کے روپ  
میں۔ ہمارے معاشرہ میں عورت کی کوئی چاہ نہیں  
ہو سکتی۔ میرے باپا صرف اس لئے ہماری شادی نہیں  
کروانا چاہتے کہ وہ اپنے دوستوں داروں کو کیا  
منہ دکھائیں گے کہ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی ایک مڈل  
کلاس انسان سے بیاہ دی۔ ایسے میں، وکرم تم ہی بتاؤ  
کہ میں کیا کروں۔ کیا مجھے رونے کا حق بھی حاصل  
نہیں ہے؟“  
وکرم بولا۔ ”نمرتا رونا بہت آسان ہوتا ہے لیکن  
چیزوں کو فیس کرنا اتنا ہی مشکل۔ لیکن یاد رکھو اس دنیا  
میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔ تم  
پریشان نہ ہوا اپنے آپ کو پرسکون رکھو اور دماغ کو ٹھنڈا  
رکھ کر یہ سوچو کہ اس مسئلہ کا کیا حل نکل سکتا ہے۔ کیسے

نمرتا روتی رہی کچھ نہ بولی۔  
فارگاڑ سیک نمرتا مت رو۔ مجھے تکلیف ہوتی  
کے لے سکتی ہیں ایک عورت اذل سے قربان ہی تو ہوتی ہوئی  
آتی ہے۔ مردوں کی اتنا کی تسکین کے لئے عورت کی  
قربانی ہی اس دنیا کا دستور ہے خواہ وہ مرد بھائی کے  
روپ میں، شوہر کے روپ میں یا باپ کے روپ  
میں۔ ہمارے معاشرہ میں عورت کی کوئی چاہ نہیں  
ہو سکتی۔ میرے باپا صرف اس لئے ہماری شادی نہیں  
کروانا چاہتے کہ وہ اپنے دوستوں داروں کو کیا  
منہ دکھائیں گے کہ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی ایک مڈل  
کلاس انسان سے بیاہ دی۔ ایسے میں، وکرم تم ہی بتاؤ  
کہ میں کیا کروں۔ کیا مجھے رونے کا حق بھی حاصل  
نہیں ہے؟“  
وکرم بولا۔ ”نمرتا رونا بہت آسان ہوتا ہے لیکن  
چیزوں کو فیس کرنا اتنا ہی مشکل۔ لیکن یاد رکھو اس دنیا  
میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔ تم  
پریشان نہ ہوا اپنے آپ کو پرسکون رکھو اور دماغ کو ٹھنڈا  
رکھ کر یہ سوچو کہ اس مسئلہ کا کیا حل نکل سکتا ہے۔ کیسے

”پاپا آپ جانتے ہیں نہ کہ میں وکرم سے کتنا  
پیار کرتی ہوں اس کے باوجود آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں  
سوشانت سے شادی کر لوں۔ کیوں کر رہے ہیں آپ  
میرے ساتھ ایسا۔ پاپا میں آپ کی بیٹی ہوں آپ  
کو اپنی بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنے انٹیشن کی پرواہ  
ہے۔“ نمرتا اپنی بات مکمل کر کے روئے گی۔  
ارجن کمار، اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے جس کی  
آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے وہ بولے۔ ”بیٹا  
تم میری بیٹی ہی ہو اسی لئے تمہاری شادی وکرم سے نہیں  
کروانا چاہتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی وکرم  
کے ساتھ خوش نہ رہ پاؤ گی۔ تم جس آسودگی میں پلی  
بڑھی ہو وہ خوشحالی، وہ آسودگی تمہیں کبھی بھی وکرم نہیں  
دے پائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم  
حیثیت کا ہے میں سماج کو کیا بتاؤں گا کہ میرا داماد نہیں  
ہزار روپے ماہوار کھاتا ہے۔“  
”آپ کو سماج کی پرواہ ہے اپنی بیٹی کی کوئی فکر  
نہیں ہے آپ کی بیٹی اس میں ہزار روپے کمانے والے  
عام سے انسان پر مرتی ہے اسے اپنا بھگوان مانتی ہے  
اور آپ۔۔۔“ نمرتا بات کر رہی تھی کہ ارجن کمار زور  
سے دھاڑے۔  
”بس کرو لڑکی تمہیں پیار کی زبان سمجھ میں نہیں  
آتی کیسی بے حیا ہو گئی ہو کیا تم یہ نہیں جانتی کہ تمہارے  
سامنے جو انسان کھڑا ہے وہ رشتے میں تمہارا باپ

تمہارے بابا کو مایا جاسکتا ہے۔

”دکرم میں بابا کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ جب ایک بات کر دیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں کسی صورت میں پیچھے نہیں ہٹتے۔“ نمرتا نے کہا اب وہ پہلے کی بانہست تھوڑی پرسکون تھی۔

”اگر تمہارے بابا ایک بات کر کے اس پر قائم رہتے ہیں تو تم بھی انہی کی بیٹی ہو۔ ضد پراڑ جاؤ وہ تمہاری بات ضرور مانیں گے۔“ Lets hope for the best

لیکن دکرم میں اپنے بابا سے بغاوت نہیں کر سکتی میں بہت پیار کرتی ہوں ان سے..... بہت چاہتی ہوں انہیں..... اپنی محبت مجھے اپنے بابا کی شفقت سے زیادہ عزیز نہیں ہے..... آج میں ان سے آل ریڈی بہت Miss behave کر چکی ہوں اور بہت شرمندہ ہوں.....“ نمرتا نے کہا۔

دکرم بولا۔ ”نمرتا تم اپنے بابا سے بغاوت نہیں کر رہی ہو تمہیں ہر انسان کی طرح خوش رہنے کا پورا حق حاصل ہے اور تمہیں وہ ساری خوشیاں میں ہی دے سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر تمہارے بابا ہم سے ناراض رہیں لیکن وہ بعد میں تمہیں خوش دیکھ کر مان جائیں گے کیونکہ تمہاری خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔ لیکن اب اگر تم ان کے لئے سوشائٹ سے شادی کر لیتی ہو تو یاد رکھو تم اس کے ساتھ خوش نہ رہ پاؤ گی اور بعد میں تمہارے باپ بھی تمہاری حالت دیکھ کر جلنے کڑھتے رہیں گے۔“

نمرتا نے کہا۔ ”دکرم تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... میں صرف تمہارے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہوں۔ تم ہی مجھے خوش رکھ سکتے ہو۔ میں آج جا کے بابا کو دوبارہ کنوئیں کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

نمرتا بھگوان سے بھی نراش نہیں ہونا ایشور پراپنا یقین قائم رکھو سب اچھا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

ارجن کمار اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی پر بہت غصے

تھے۔ بہت دکھ ہو رہا تھا ان کو..... ماضی یاد آ رہا تھا..... جب ان کی بیٹی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھیں گے۔

ارجن کمار ایک خاندانی رئیس تھے..... ان کی شادی ان کے ماں باپ کی مرضی سے رچنا دیوی سے ہوئی تھی..... رچنا وادی کسی دیوی سے کم نہ تھی..... اس نے ارجن کمار کی زندگی خوشیوں سے بھر دی۔

شادی کے دو سال بعد جب رچنا نے اپنے بچے کو ایک پیاری سے گڑیا کا تحفہ دیا تو اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی..... ابھی نمرتا دو برس کی ہی تھی کہ یہ انکشاف ہوا کہ رچنا کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئی ہے..... اور کینسر تھا آخری اسٹیج پر..... رچنا کو امریکہ لے جایا گیا علاج کے لئے..... مگر شاید اوپر والے نے رچنا کی موت لکھ دی تھی..... رچنا کی موت کے بعد ارجن کمار کے ماں باپ نے ان پر شادی کے لئے بہت زور ڈالا مگر وہ نہ مانے اور یوں نمرتا ماں کے بغیر ہی پروان چڑھتی رہی۔

آج ارجن کمار کو نمرتا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ ایک لڑکے کی خاطر اس نے اپنے باپ سے بدتمیزی کی تھی..... آفس میں بھی ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری فائزر کلوز کی اور چائے پینے کے لئے قریبی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔

ارجن کمار نے ریسٹورنٹ کا دواڑہ کھولا اور سامنے کا نظارہ دیکھ کر ان کے طوطے اڑ گئے وہ حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ سامنے نمرتا، ایک لڑکے کے ساتھ کارزوالے ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی..... مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھی اور چہرہ متورم تھا..... مگر پھر بھی وہ دستور روئے جاری تھی..... اس کے ساتھ والا لڑکا اسے خاموش کروانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بھی کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔

ارجن کمار نے ایک آخری نگاہ اپنی بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور ایک لمبے میں فیصلہ کر لیا کہ انہوں نے کیا کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

تمہا جتنا تو سیکھ لیا ہم نے

پر خوش بھی نہ رہ پائیں گے

حیرتی دوری تو پھر بھی سہ لیتا ہے دل

پر حیرتی محبت کے بغیر نہ جی پائیں گے

نمرتا اپنے کمرے میں مسلسل ٹھہل رہی تھی۔

اور اپنے بابا کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے طے

کر لیا تھا کہ آج وہ انہیں منا کر ہی رہے گی..... تھوڑی

دیر میں اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ ارجن کمار کے کار کے

ہارن کی آواز سنائی دی۔ نمرتا نے کھڑکی سے جھانکا

چوکیدار دروازہ کھول رہا تھا..... نمرتا کمرے سے باہر نکل

آئی..... سامنے سے ارجن کمار آ رہے تھے۔

”کیسی ہے میری پیاری سی گڑیا.....“ ارجن کمار

نے پیار سے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں بابا آپ جلدی آ گئے آج۔“

”ہاں جلدی آ گیا ہوں..... کیونکہ میں

چاہتا ہوں کہ آج ہم کچھ مہمانوں کو انوائٹ کریں کیا نام

بتایا تھا تم نے اس لڑکے کا..... ہاں دکرم..... دکرم کے

گھر والوں کو بلاؤ..... میں ان سے تمہارے رشتے کی

بات کروں گا۔“

”جج بابا.....“ نمرتا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں

آ رہا تھا۔

”جی میری جان..... تم کوئی خواہش کرو اور میں

اسے پورا نہ کروں..... بھلا یہ ممکن ہے؟“

ارجن کمار نے نمرتا اور دکرم کی گفتگو کی ڈیٹ فکس

کر دی تھی..... لیکن اب خود بہت پریشان تھے..... بیٹی

کی خوشی کے لئے مان تو گئے تھے لیکن وہ اس رشتے سے

مطمئن نہیں تھے۔

انہیں اپنے دوست شوریرکھنے کی طرف سے بھی

پریشانی لاحق تھی..... کہ اب اپنے شوریرکھنے کو کیسے منہ

دکھائیں گے۔ کیسے انہیں اپنی بیٹی کی گفتگو پر بلا لیں

گے..... لیکن ان سے بات تو کرنی تھی کیونکہ ان کے پاس

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ارجن کمار ٹیکس پر ٹپلتے ہوئے اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان کا سیل فون رنگ کرنے لگا..... ارجن نے ٹراؤڈر کی پاکٹ سے سیل فون نکالا اسکرین پر کوئی ان بون نمبر تھا۔

”ہیلو جی کون.....؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”یار میں ہوں

شوریرکھنے میں اپنے بیٹے کے ساتھ اٹھ آیا گیا ہوں.....

جلدی سے انیر پورٹ آ جا..... ہمیں لینے کے لئے۔“

”کیا شورے تم کب آئے.....“ ارجن کمار کی

حیرت دیدنی تھی۔

”اوکے فائن میں آ رہا ہوں..... تمہیں لینے

کے لئے۔“

☆.....☆.....☆

”کیا بکواس کر رہے ہو تم، ہوش میں تو ہو.....

اتنے سالوں پہلے کی گفتگو کو کیسے تم توڑ سکتے ہو..... تم نے

ہماری برسوں پرانی دوستی کا لحاظ بھی نہ کیا۔“ شوریرکھنے

حقیقت سن کر دنگ رہ گئے تھے اور اب اونچی آواز میں

چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا سوشائٹ بھی

آیا تھا..... لیکن ان کی بیٹی امریکہ سے نہ آئی تھی۔

نمرتا ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی

ساری گفتگو سن رہی تھی۔

”یار میں اپنی بیٹی کے آگے بے بس ہو گیا.....

کچھ نہ کر پایا..... نمرتا اس لڑکے سے بہت محبت کرتی ہے

کیسے میں اس کی محبت کو اس سے جدا کر دیتا..... یار میری

غلطی ہے مجھے معاف کر دو.....“ ارجن کمار نے اپنے

دوست کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

نمرتا یہ سب نہ دیکھ پائی اور اپنے کمرے میں

میں آ گئی۔

”انکل آپ پلیز ہاتھ مت جوڑیں..... آپ

چاہتے ہیں نہ کہ نمرتا کی شادی مجھ سے ہو..... اس کی

شادی مجھ سے ہی ہوگی..... وہ بھی نمرتا کی اپنی مرضی

سے..... وہ خود دکرم سے گفتگو نہیں کرے گی۔“ سوشائٹ

اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن جب اس نے بات کی..... تو ارجن کما راور شور پکھنہ حیران رہ گئے۔

”کیا مطلب.....؟ یہ کیسے ممکن ہے۔“ ارجن کما رنے تذبذب میں سوال کیا۔

”ممکن ہے..... اور بلیک میجک سے ممکن ہے۔“ سو شانت نے کہا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کالا جادو؟“

”تم نے کالا جادو کہاں سے سیکھ لیا؟“ شوریر نے حیرانی سے پوچھا۔

”ریلیکس انکل اینڈ پاپا..... میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں اس بارے میں۔“

☆.....☆.....☆

”اس روز میں بہت ہی خوش تھا۔ میری خوشی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قمار خانے میں جوا کھیلا تھا اور ہر بازی میں جیت میری ہی ہوتی رہی تھی۔ جب میں قمار خانے سے نکلا تو میرے پاس پانچ سو ڈالرز تھے۔ اس خوشی کو سیلبرٹ کرنے کے لئے میں ایک بار

میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا وہ لڑکی بہت حسین تھی اس نے گرین شرٹ کے نیچے سفید پھولوں والا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ نشے میں تھی..... وہ لڑکی میرے پاس آگئی اور اس نے

جھومتے جھومتے مجھ سے پوچھا۔

”اے مسٹر..... کیا تم مجھے میرے اپارٹمنٹ تک ڈراپ کر دو گے؟“

”ایسی حسین قہلی کی قربت کون بے وقوف نہیں چاہے گا۔“ میں نے حامی بھری۔ اور اسے لے کر باہر اپنی کار میں آگیا..... اس نے اپنے گھر اپارٹمنٹ کا ایڈریس مجھے سچایا اور میں اسے ڈراپ کرنے اس کے

اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنا نام روڈی بتایا تھا۔

اپنی ویز جب میں اسے چھوڑ کر واپس آ رہا تھا کہ اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا اور کہا کہ

”تمہارا انعام ہے۔“ پہلے تو میں نہ مانا مگر جب اس نے فورس کیا تو مجھے ماننا پڑا۔

بعد میں جب میں نے لفافہ دیکھا تو اس میں ایک یو ایس بی بی..... اور ایک فولڈ ہوا کاغذ تھا..... اس کاغذ کی تحریر کچھ یوں تھی۔

”ڈیئر سو شانت تم ہرگز یہ جاننے کی کوشش نہ کرنا کہ میں کون ہوں؟ ہاں تمہیں اتنا بتا دیتی ہوں کہ ہم

شیطان کے چیلے ہیں۔ شیطانیات کے پیروکار ہیں..... تمہاری زندگی میں ایک موڑ ایسا آنے والا ہے کہ تمہاری

شیطانیات کی ضرورت پڑے گی۔ اس یو ایس بی کو سنبھال کر رکھنا..... مستقبل میں یہ تمہارے کام آئے گی۔“

☆.....☆.....☆

”Wish you all the best“

میں نے وہ صفحہ ایک طرف پھینک دیا اور یو ایس بی چیک کی اس میں ٹوٹکے اور عملیات تھے۔

پھر میں روزی کے اپارٹمنٹ میں گیا لیکن اب وہاں وہ اپارٹمنٹ تو کیا..... وہ بلڈنگ ہی سرے سے غائب تھی۔

”اس وقت سے یہ یو ایس بی میرے پاس ہے۔“

”تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں کالے علم کے ذریعے غمزدگی سے کو بڑھانا ہوگا۔“ ارجن کما رنے سوال کیا۔

”ہاں انکل کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔ غمزدگی میری محبت ہے میں اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ وکرم

غمزدگی کو بھی خوش نہ رکھ پائے گا۔“ سو شانت نے کہا۔

شوریر کھنڈ بولے۔ ”لیکن یہ غلط ہے۔ کالا علم کرنا باپ ہے اور میں تم دونوں کو یہ باپ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”انکل پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے۔“ سو شانت نے اپنے باپ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ارجن کما ر سے پوچھا۔

وہ بولے۔ ”میں تو شروع سے ہی وکرم کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا تھا کیونکہ وہ

ہمارے ایشیئس کا نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے مان تو گیا کیونکہ میں نے دیکھا تھا اسے ریٹائرمنٹ میں اس وکرم کے ساتھ..... اس وقت وہ زارو قطار رو رہی تھی اور مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں مان گیا لیکن اب پچھتا رہا ہوں.....“

”اب اگر کوئی بھی راستہ ہے اس رشتے کو توڑنے کے لئے تو میں رضامند ہوں اس کے لئے..... خواہ وہ راستہ کالے جادو کا ہی کیوں نہ ہو۔“

شوریر کھنڈ بولے۔ ”ارجن تو پاگل ہو گیا ہے اوپر والے کے شراب سے ڈر۔“

”دیکھیں پاپا اصل بات یہ ہے کہ وکرم، صرف دولت حاصل کرنے کے لئے غمزدگی سے شادی کر رہا ہے۔ غمزدگی اسے کوئی پیار وائیں ہے غمزدگی کی زندگی کا سوال ہے..... اگر ہم کسی کی زندگی بچانے کے لئے کالا علم استعمال کریں تو اس میں برائی ہی کیا ہے؟“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....“ شوریر کھنڈ نے کہا۔ اور تینوں اس بات کے لئے رضامند ہو گئے۔

”شیطان بھی بہت خوش ہوگا آج..... کیونکہ تین اور انسانوں کو بھٹکانے میں کامیاب تھا۔“

☆.....☆.....☆

کمرے کا ماحول بہت بھیاٹک تھا..... کمرے کے چاروں اطراف میں کالی ماں کی خوف ناک بت

رکھے ہوئے تھے..... شوریر کھنڈ، ارجن کما ر اور سو شانت آلتی باقی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے آس پاس صندوق سے دائرے بنا رکھے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹے سے ہون رکھا ہوا تھا جس میں آگ روشن تھی

سو شانت اونچی آواز میں منتر پڑھ رہا تھا اور ہون میں کالی مرچیں ڈالتا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا عمل ختم ہوا اور ہون کی آگ اپنے آپ بجھ گئی۔

سو شانت نے منتر پڑھنے بند کر دیے اور ہون کی طرف دیکھا..... اس نے ہون میں سے ایک چٹکی

راکھ نکالی اور اس راکھ کو صندوق کی ڈبیا میں کس کر دیا

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

اور بولا۔

”اب ہمیں یہ راکھ غمزدگی کے جسم کے ساتھ لگانی ہوگی..... اور اس کے بعد غمزدگی وکرم سے نفرت کرنے لگے گی۔“

”ٹھیک ہے..... کشوری میری بہت ہی پرانی اور وفادار ملازمہ ہے میں یہ ڈبیا اس کو دے دیتا ہوں۔ اور یہ غمزدگی کے جسم کے ساتھ لگا دے گی۔“ ارجن کما ر نے کہا۔

سو شانت اور شوریر کھنڈ نے اثبات میں سر ہلادیا اور یوں ارجن کما ر نے اپنی ملازمہ سے مدد لے کر اپنے کالے کر تو تو کو مکمل کر لیا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆



اور بیچوں کی طرف اشارہ کیا جہاں سے نمرتا بچے  
اتر رہی تھی لیکن وہ تیار نہ تھی بالکل سہل سے چلے میں تھی۔  
”نمرتا کیا ہوا ہے؟“ تم بدلی بدلی سے دیکھائی  
دے رہی ہو؟“ نمرتا کے اندر کے بدلاؤ کو سب سے  
پہلے وکرم نے محسوس کیا۔  
”اور تم تیار بھی نہیں ہوئی ہو۔ کیا تم جانتی نہیں  
کہ آج ہماری سگائی ہے۔ ہماری انجمن کا فٹنشن چل  
رہا ہے۔“

نمرتا نے کہا۔ ”ہاں میری سگائی تھی۔۔۔ لیکن  
ہے نہیں۔۔۔ تھی۔۔۔ مجھے کل رات اس بات کا اندازہ  
ہو گیا کہ تمہیں مجھ سے کوئی محبت و محبت نہیں ہے بس تم  
صرف دولت کے حصول کے لئے مجھ سے شادی کرنا  
چاہتے ہو۔“

وکرم کی آنکھیں آنسوؤں سے لہلہاں بھر گئی۔  
”نمرتا میں بیگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ  
میرے من میں کوئی لالچ نہیں ہے۔۔۔ میں لالچی نہیں  
ہوں میرے من میں صرف تمہارے لئے پریم۔“

”بس ختم کرو یہ پیار کا بھاشن۔۔۔ میں نہیں  
سننا چاہتی تمہارے منہ سے پیار کی کوئی بات۔۔۔ اور نہ  
ہی میں تم جیسے دو کوڑی کے انسان سے شادی کروں گی  
دفعہ ہو جاؤ یہاں سے گیت آؤٹ فرام مائی ہاؤس۔“  
نمرتا زور سے چلائی۔

”بس بہت سن لی میں نے بے عزتی۔“ گامتری  
نے کہا۔

”ارے میں تو تجھے جیسی آوارہ اور دو فہر کی لڑکی  
کو اپنی بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھی جو آئے دن نت نئے  
لڑکے چھانسلے۔۔۔ ارے میں تو صرف اپنے بیٹے کی  
خوشی کے لئے مان گئی ورنہ۔۔۔“

”ایک منٹ۔۔۔ آپ کی ہمت کیسے ہوئی میری  
بیٹی کو آوارہ اور دو فہر کہنے کی۔“

گامتری نے کہا۔ ”اب دو فہر اور آوارہ لڑکی  
کو میں دو فہر اور آوارہ نہ کہوں تو کیا اسے میں شریف  
لڑکی کہوں۔۔۔ ارے اس لڑکی نے میرے بیٹے

کو پھانسا ہے۔“

”پوشٹ اپ۔“ ارجن کمار دھاڑے تھے۔  
”میری بیٹی نے آپ کے بیٹے کو نہیں پھانسا بلکہ  
آپ کے بیٹے نے میری بیٹی پر ڈورے ڈالے ہیں  
ارے اس وکرم نے دولت حاصل کرنے کے لئے  
شارٹ کٹ راستہ چنا ہے۔“

”بس بہت ہو گیا۔“ وکرم نے کہا۔  
”نمرتا تم نے مجھے بے عزت کیا۔۔۔ وہ تو میں  
برداشت کر رہی لیتا مگر اب تمہارا باپ میری ماں کو ذلیل  
کر رہا ہے۔۔۔ اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ آج  
سے میرا تمہارا رشتہ ختم۔۔۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میں اپنے  
دل سے تمہاری محبت نہیں نکال سکتا۔۔۔ لیکن محبت عزت  
سے زیادہ ضروری نہیں ہوتی۔“ گڈ بائے۔

سوشانت ایک طرف کھڑا سارا تماشا دیکھ رہا  
تھا۔۔۔ مگنی کینسل ہوئی۔۔۔ لوگ واپس چلے گئے۔  
سوشانت دل ہی دل میں اپنی جیت کا جشن  
منانے لگا۔

زندگی تیرے بن ادھوری ہے  
نجانے کیوں تیرے میرے بیچ نیہ دوری ہے  
سوچتا ہوں کبھی خود کو سنا دوں  
پر تجھ سے کیا ہوا وعدہ بھانا بھی ضروری ہے  
وکرم کی ہوتی ہوئی سگائی ٹوٹ گئی تھی۔۔۔ وہ خود  
بھی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔۔۔ اس نے نمرتا کو دل کی

گہرائیوں سے چاہا تھا۔۔۔ نمرتا سے مل کر اس نے محبت  
کے مفہوم کو جاننا اور سمجھنا تھا۔۔۔ لیکن پتا ہی نہ چلا کہ کب  
وہ محبت کی دیوی اس ظالم زمانے کی آواز میں بولنے  
لگی۔۔۔ پتا ہی نہ چلا کہ وہ نمرتا جو وکرم کے دل میں بہتی  
تھی اب وکرم کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے لگی۔  
وکرم سوچ سوچ کر پاگل ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ نمرتا  
ایسی تو نہ تھی۔۔۔ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔۔۔ کیا اس  
کے باپ نے اسے ایسا کرنے پر پریشور اڑا دیا ہے۔

نہیں یہ ممکن نہیں۔۔۔ کیونکہ نمرتا کے کسی بھی  
انداز میں اداکاری کا شائبہ تک نہ تھا۔

وکرم کو نمرتا کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی کہ  
کیسے نمرتا نے اسے ذلیل کیا یہ بات تو وہ نمرتا کی محبت  
میں برداشت کر لیتا لیکن وہ یہ بات برداشت نہیں  
کر سکتا تھا کہ اس کی ماں کی ذلت ہوئی تھی۔۔۔ اتنے  
زیادہ لوگوں کے سامنے نمرتا کے باپ ارجن کمار نے اس  
کی ماں کے ساتھ بحث کی تھی۔

اب وکرم کو ایک بار پھر یہ باتیں یاد آنے لگی  
تو اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

”نمرتا کو اس بات پر غور ہے نہ کہ میں اس پر  
مرتا ہوں۔ اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔۔۔ ہاں یہ سچ بھی  
ہے۔۔۔ لیکن میں اس سچائی کو اب تبدیل کر دوں گا۔ نمرتا  
اور اس باپ ارجن کمار پر یہ بات ثابت کر دوں گا کہ  
میری نمرتا سے محبت انہیں میری ماں کو ذلیل کرنے کا  
اوارڈ نہیں دیتی۔“

وکرم اسی وقت اٹھا اور گامتری دیوی کے کمرے  
میں آ گیا۔

”کیا ہوا ہے بیٹا؟ اس وقت، کوئی کام ہے  
”کیا؟“ گامتری دیوی نے سوال کیا۔

”ماں میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“  
”شادی؟“ گامتری دیوی حیران ہو گئی۔

”لیکن تیری تو نمرتا کے ساتھ سگائی بھی نہ ہوئی  
بکھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟“

وکرم بولا۔ ”نہیں ماں۔۔۔ نمرتا سے نہیں۔۔۔  
میں بھی لڑکی سے میری شادی کروادو جلد از جلد۔۔۔

لڑکی جیسی بھی ہو۔۔۔ ٹنکڑی لولی ان پڑھ، جاہل بھی  
ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”چل شکریہ نمرتا کا بھوت تیرے سر سے اترا  
میں کل ہی آئی کے رشتے کی بات کرتی ہوں۔۔۔ آرتی  
میری سیکھی کی بیٹی ہے۔ اور میں تو شروع سے ہی یہ  
اپنی تھی کہ آرتی میری بہو بنے۔“

گامتری کی بات سن کر وکرم اپنے کمرے  
میں آ گیا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو  
پہلے گئے۔

تو عالم ہے سمجھتا ہے کتابوں کی زباں  
میرا چہرہ بھی پڑھ، میرے حالات بتا  
بس ہو جائے تیری محبت حاصل  
تو کوئی ایسی دعا ایسے مناجات بتا  
کمال کرتے ہوئے دل تم بھی  
اسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

دو مہینے گزر گئے تھے۔۔۔ آرتی، وکرم کی سہاگن  
بن چکی تھی۔۔۔ نمرتا پر کئے جانے والے کالے جادو کا  
اثر اب تقریباً ختم ہو گیا تھا۔۔۔ سوشانت کی امریکہ میں  
کوئی امپورٹرز بزنس سٹنگ تھی وہ وہاں گیا ہوا تھا۔

نمرتا سب جانتی تھی کہ اس نے اپنے ساتھ کیا  
کر ڈالا کیسے اپنی محبت کا اپنے ہی ہاتھوں بلیڈان دے  
دیا۔۔۔ وہ محبت جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کتنی  
محنت کی کوشش کی تھی۔۔۔ کتنی دعائیں مانگی تھیں۔۔۔  
اور جب سے نمرتا کو یہ پتا چلا کہ وکرم شادی کر چکا ہے  
تو وہ مزید ٹوٹ گئی تھی۔۔۔ وکرم سے بات کی ہمت نہ تھی  
اس میں۔۔۔ بس اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

کشوری، بھی نمرتا کا حال دیکھ رہی تھی نمرتا کی  
دلی کیفیات اس کے سامنے روز وروشن کی طرح  
عیاں تھی۔

وہ شرمندہ تھی۔۔۔ اس روز جب ارجن کمار نے  
کشوری کو وہ ڈیالا کر دی تھی اور کہا تھا کہ اسے نمرتا کے  
جسم پر لگا دینا جب وہ سوئے۔ اس وقت کشوری کے  
دامع میں کالے جادو والی بات تھی لیکن اس نے یہ سوچ  
کر اپنے خیال کو چھٹک دیا کہ بھلا ایک باپ اپنی بیٹی  
پر کالا جادو کیسے کر سکتا ہے۔

کشوری ایک دودھ (بیوہ) عورت تھی۔۔۔ وہ  
شروع ہی سے ارجن کمار کے ہاں ملازمہ تھی۔۔۔ جب  
نمرتا کی ماں رچنا دیوی کینسر کا شکار ہو گئی اور اس کی مریتو  
کے بعد کشوری نے نمرتا کو ماں کی طرح پالا پوسھا تھا۔

ارجن کمار بھی اس حوالے سے ان کی بہت  
عزت کرتے تھے۔۔۔ نمرتا نے بھی کشوری کو کبھی ملازمہ  
نہیں سمجھا تھا۔۔۔ ہمیشہ کشوری کو ماں کی طرح سمجھا تھا۔

و کرم سے شادی کے لئے ارجن کمار کو منانا اور پھر سوشانت اور رشور یکے کا ایک امریکہ سے لوٹ آنا..... پھر ارجن کمار کا اپنی بیٹی پر کالا جادو کرنا..... پھر نمرتا کا اپنی سگائی کے دن و کرم سے لڑنا..... اور پھر سگائی کا لوٹ جانا..... سب کچھ کشوری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی..... لیکن اب نمرتا کی حالت دیکھ کر کشوری سمجھ گئی تھی کہ اس کا شک درست تھا..... نمرتا پر اس کے باپ نے کالا جادو کر دیا تھا صرف اور صرف اس لئے کہ وہ و کرم سے شادی نہ کرے اور ارجن کمار کو اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے..... آج کل ارجن کمار بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے..... نمرتا کا حال دیکھ کر شاید کہ بچھڑا رہے تھے۔

لیگن کشوری کے دل میں ارجن کمار کے لئے کوئی رحم نہیں آیا..... اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نمک حلائی کے بجائے نمرا کی محنت کو ترجیح دے گی۔ اس نے نمرا کو سب بچ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کشوری نے دروازہ ناک کیا۔

”پاپا دیکھیں نہ کشوری ماسی مجھ سے کہہ رہی ہیں  
کساپ نے کالا جادو کر دیا ہے مجھ پر..... کہیں ننان سے  
کہہ یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ غمزدانے بہت آس بہت  
ہی امید بھری نگاہوں سے ارجن کمار کی طرف دیکھا۔

جب تجھ سے ناطہ جوڑا ہے  
 مت بوجھ کیا کیا چھوڑا ہے  
 نمرتا عمرتی تھی اس نے اپنی کلائی کو کاٹ کر  
 خودکشی کر لی تھی۔ اگرچہ اسے اسپتال لے جایا گیا مگر وہ  
 بچا نہ سکی۔ نمرتا نے اپنے باپ سے کوئی سوال کرنے کے  
 بجائے موت کو ترجیح دی تھی..... اور یہی بات ارجن  
 کمار کو توڑی تھی..... ارجن کمار تو جیسے بیٹی کی موت  
 میں ٹوٹ کر بکھری ہو گئے تھے۔ وکرم، نمرتا کی موت سے  
 دو دن پہلے اپنی چچی آرتی کے ساتھ جرمنی جا چکا تھا۔  
 اس لئے وہ نہ جان پایا کہ نمرتا عمرتی ہے۔

دائرہ بنایا ہوا تھا اور صندوق کے آس پاس سوم بٹیاں لگائی گئی تھیں ارجن کمار دائرہ میں بیٹھتے تھے۔ لباس کے نام پر انہوں نے صرف ایک انڈونیر پہن رکھا تھا۔ اور اوچی آواز میں متروں کا جاپ کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سوم بٹیاں بجھ گئی۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندیرا اچھا گیا۔ اور ایسی آوازیں آنے لگی جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ جیسے بجلی چمک رہی ہو۔ اور پھر کمرے میں اچانک آواز گونجی۔

”کیوں بلا یا ہے مجھے۔“

ارجن کمار دونوں ہاتھ جھوڑ کر بولے۔ ”اے شیطان دیوتا۔ اے پوجے دیو۔ میں نے تیری وجہ سے اپنی بیٹی کو کھو دیا۔ میری نمرا مرگئی۔ مرکز ششان چلی گئی۔ اور اب تو مجھے میری نمرا لوٹا۔ بتا کوئی اوپائے۔ دیکھا کوئی راستہ کہ کیسے میں اپنی نمرا کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔“

ارجن کمار آج اس وقت ایک کامیاب بزنس مین نہیں بلکہ ملعون چادو گرد دیکھائی دے رہا تھا۔ وہ بی آواز دوبارہ آئی۔

”اے میرے غلام۔ اے شیطانیت کے نئے پیروکار۔ اس شیطانی دنیا میں تمہارا سوا گت ہے۔“

”تیری بیٹی مر گئی ہے۔ لیکن تو جانتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے۔ میں تجھے بتا دوں گا کہ نمرا تکب اور کہاں نیا جنم لے گی اور اس وقت بتاؤں گا جب نمرا نیا جنم لے کر اٹھارہ برس کی ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔“

ارجن کمار بولے۔ ”ہاں بول کیا شرط ہے تیری؟“

”تجھے اس سنسار کو چھوڑنا ہوگا۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر میری خدمت کرنی ہوگی۔ مجھے پوجنا ہوگا میں برس۔ شیطان منتر پڑھنے ہوں گے انسانوں کی بلی چڑھانی ہوں گی۔ بول منظور ہے۔“

ارجن کمار نے کچھ ہل سوچا اور پھر ایک ارادے سے بولے۔ ”ہاں منظور ہے۔“

ہم یہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے جن کی فکر پر بدلتی ہے وہ کیا کرتے ہیں

☆.....☆.....☆

پنڈت جگن ناتھ مندر کے پجاری تھے۔ وہ بہت ہنس کھادو یا لو انسان تھے ہر کسی کی مدد کرتے تھے گاؤں میں ہر کوئی پنڈت جگن ناتھ کے گن گاتا تھا۔ کسی کو کوئی بھی مصیبت پیش آتی تو وہ سیدھا پنڈت جگن ناتھ کے پاس جاتا تھا۔

پنڈت جگن ناتھ کی چٹی بھی ان کی طرح ہی بہت رحم دل تھیں ان کا نام سریتا تھا۔ سریتا کو اپنے دھرم سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ آئے دن اپنے گھر میں جگن کرواتی رہتی تھیں پنڈت جگن ناتھ کی اور سریتا کی آنکھوں کا تارا ان کی آنکھوں میں عالیہ تھی۔ عالیہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہائی اسکول پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

ان دنوں عالیہ بہت پریشان رہنے لگی تھی پریشانی کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی پر دھیان نہیں دے پارتی تھی اس کی پریشانی کا سبب وہ خواب تھے۔ جن کا مقصد وہ جان نہیں پارتی تھی۔ کل رات کو بھی عالیہ نے اپنے سننے میں دیکھا تھا کہ وہ ایک نہایت حسین و جمیل جگہ پر گھڑی ہے۔ چاروں اطراف میں سرسبز پہاڑ ہیں ان پہاڑوں سے آبشاریں بہہ رہی ہیں۔

ہر طرف رنگ برنگی پھول کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو فضا کو مسمور کر رہی تھی۔ عالیہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ اس لڑکے نے عالیہ کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے۔ اور پیار بھری باتیں کر رہا تھا۔

عالیہ بھی اس کی محبت بھری باتوں میں گم ہو رہی تھی کہ اچانک عالیہ کے ہاتھ جگن ناتھ کے آگے ان کے پاس ایک کمان تھی۔ عالیہ نے دیکھا کہ پنڈت جگن ناتھ نے کمان میں تیر کوئید کیا اور اس لڑکے کا نشانہ لے کر تیر کو چھوڑ دیا۔

تیر فضا میں سرسراتا ہوا آیا۔ اور سیدھا اس

لڑکے کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس لڑکے نے ایک بھیا نک چٹی ماری اور وہی پرم گیا۔ عالیہ کی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ سے کچھ پوچھتی۔ اس لئے وہ بھاگی اور آگے ایک بہت گہری کھائی تھی عالیہ کو ہاتھی نہ چلا کہ وہ اس کھائی میں گر گئی۔ پچھلے ایک مہینے سے عالیہ مسلسل یہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اب تو عالیہ کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اپنے خواب والے اس لڑکے سے عالیہ پیار کر رہی ہے نہ جانے کیوں عالیہ کا دل کرتا تھا کہ وہ اس لڑکے کو حقیقت میں دیکھے۔ قریب سے دیکھے۔

لیکن عالیہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس خواب کا مقصد جان کر رہے گی۔ اور اس کے لئے وہ مندر کے بڑے پجاری پنڈت شاستری کے پاس جائے گی۔ کیوں کہ وہ اپنے خواب کے بارے میں اپنے باپ پنڈت جگن ناتھ کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پریشان ہو جاتے اور عالیہ نہیں جانتی تھی کہ پنڈت جگن ناتھ ذرا بھی پریشان ہوں۔ آخر کیوں وہ اس کے پتا تھے۔

☆.....☆.....☆

ارجن کمار نے بیس برس تھا گزرا رہے تھے۔ صرف اور صرف شیطان کو پوجا تھا۔ لوگوں کی موت کے منتر پڑھتے تھے۔ شیطان کو خوش کرنے کے لئے کتنے لوگوں کی بلیاں چڑھاتی تھیں کہ کسی طرح انہیں ان کی نمرا واپس مل جائے۔

آج بھی وہ ایک بلی چڑھا چکا تھا۔ ایک سات سال کے معصوم بچے کا گلا کاٹ رہا تھا اور اب شیطان سے مخاطب تھا۔

”اے شیطان دیوتا۔ میں نے تجھے اپنا سب کچھ مانا ہے۔ تیرے لئے اپنے دھرم کو چھوڑا ہے۔ اے شیطانی طاقتوں والے لازوال دیوتا بیس برس گزر چکے۔ اپنا وعدہ نبھادو کہ اپنا وعدہ۔ کہاں ہے میری نمرا۔“

کہاں ہے میری بیٹی۔ کہاں اور کس روپ میں اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔

شیطان دیوتا کی آواز آئی۔ ”ہم اپنا وعدہ وفا کرنے آگئے۔ بیس برس پہلے ہم نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ نمرا کو دوسرا جنم دیں گے۔ نمرا دوسرا جنم لے چکی ہے۔ دوسرے جنم میں وہ پنڈت جگن ناتھ کی بیٹی عالیہ ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ نمرا ہے۔ جگن ناتھ گاؤں شاشنی گھر میں رہتا ہے۔ تو جلد از جلد شاشنی گھر چلا جا۔ عالیہ کی شکل ہو ہو نمرا کی طرح کی ہے۔ اور بہت جلد وہ بھی اپنی حقیقت جان لے گی۔“ اور وہ محسوس شیطانی آواز آئی بند ہو گئی۔

ارجن کمار بہت خوش تھے۔ انہیں ان کے تپسیا کا صلہ ملنے والا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے دوبارہ ملنے والے تھے۔

ارجن کمانے شاشنی گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

عالیہ پنڈت شاستری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پنڈت شاستری کو اپنے خوابوں کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اور اب پنڈت شاستری کوئی گمیاں کر رہے تھے ان کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

عالیہ نے پوچھا۔ ”پنڈت جی خبریت تو ہے نا؟“

پنڈت جی بولے۔ ”خبریت نہیں ہے عالیہ۔ شیطانی اور کالی طاقتیں تیری تلاش میں ہیں۔“

”میری تلاش میں کالی طاقتیں وہ کیوں؟“

عالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ یہ تیرا دوسرا جنم ہے؟“ پنڈت شاستری نے کہا۔

عالیہ پر جیسے جیتوں کے پہاڑ گرنے لگا۔ لیکن وہ ایک باہمت لڑکی تھی اس نے اپنے اعصاب پر قابو پا کر پوچھا۔

”تو کیا وہ کالی طاقتیں پچھلے جنم سے میرے پیچھے ہیں؟“



پنڈت شاستری بولے۔ ”میں تجھے ایک ہوت دے رہا ہوں یہ ہوت رات کو اپنے جسم کے ساتھ مل کر سو جانا اس بار تجھے تیرے سینے میں سب کچھ پتا چل جائے گا۔“

عالیہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے پنڈت جی..... لیکن میرے پتا جی سے اس حوالے سے کوئی بات نہ کرنا وہ میں نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“

پنڈت شاستری نے اثبات میں سر ہلادیا اور عالیہ کو وہ ہوت دے دیا۔

عالیہ نے سونے سے پہلے وہ ہوت اپنے بدن کے ساتھ لگائی اور سو گئی..... اور خواب میں اسے سب یاد آتا گیا..... سب سے پہلے اپنی ماں رچنا دیوی کی موت..... گھر میں وہ سوگ کا عالم..... پھر کشوری کا اس کی ماں کا رول ادا کرنا، ماں کی طرح اس کا خیال کرنا.....

سب یاد آ رہا تھا عالیہ کو..... اپنے باپ ارجن کمار کی اپنے بڑس میں مصروفیات یاد آ رہی تھیں۔ اس کے بعد پہلی دفعہ ہوں میں وکرم سے ملاقات..... پھر وکرم سے محبت..... سوشانت کا اس کی زندگی میں آنا..... اور پھر اسے گئے باپ ارجن کمار کا اس کی زندگی میں زہر کھولنا..... سگائی والے دن اس کی سگائی کا نہ ہونا..... اور پھر اس کا خودکشی کر لینا ایک ایک منظر وہ اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا باپ ایک بڑس میں نہیں ایک شیطانی جادوگر بن گیا ہے۔

رات کے دو بجے عالیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا اب اسے سمجھ آ رہی تھی کہ خواب والے اس لڑکے سے کیوں پیار کر رہی تھی کیونکہ وہ اس کا پیار تھا..... محبوب تھا..... اس کا۔

وہ سوچنے لگی۔ نہ جانے وکرم کہاں ہوگا اب تو اس کے بچے بھی ہوں گے اگر میں اس سے ملی تو کیا وہ مجھے پہچان پائے گا۔

نہ جانے کیوں عالیہ کو وکرم یاد آ رہا تھا حالانکہ اس نے حقیقت میں وکرم کو دیکھا نہ تھا۔

شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔  
ہوں تو شاخ سے پتے ٹکرائیں کرتے  
تھجڑ کر لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے  
☆.....☆.....☆

ارجن کمار شانتی مگر میں آگئے تھے..... وہ اس وقت مندر میں تھے..... شیطان نے ارجن کو بتا دیا تھا کہ اس مندر کا پجاری شاستری سب جانتا ہے اس لئے وہ شاستری سے ملنے کے لئے آئے تھے کہ شاستری سے پوچھ سکیں کہ ان کی بیٹی کہاں ہے۔

”آپ پنڈت شاستری ہیں۔“ ارجن کمار نے پوچھا۔

”جی اور آپ غالباً ارجن کمار ہیں۔ شیطان کے پیر وکار۔“ پنڈت شاستری نے طنز سے کہا۔  
”اگر تم سب جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ میں صرف اپنی بیٹی کے لئے شیطان کا پیر وکار بنا ہوں۔“ ارجن کمار نے کہا۔

پنڈت شاستری بولے۔ ”لیکن تم اپنی بیٹی کے قاتل تھے..... اس پر کالا جادو کروادیا..... چلو شور برکتہ اور سوشانت تو فیر تھے..... لیکن تم تو اس کے گئے باپ تھے..... تم ہی تھے وہ..... جو اپنی اکلوتی بیٹی کو اس حد تک لے گئے کہ اس نے خودکشی کر لی..... اس کے بعد تم نے کشوری کو مار ڈالا کہ اس نے تمہاری سچائی تمہاری بیٹی کو بتا دی تھی..... تم نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ وکرم کو مار ڈالا..... اس کی بیٹی کو سہاگن سے ابھار گن بنا دیا..... اور پھر شیطانی کھیل کھیلنے لگے۔ تمہاری بیٹی تمہیں کبھی نہیں مل سکتی..... چلے جاؤ یہاں سے۔“ چلے جاؤ۔“

ارجن کمار بولے۔ ”یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔“

”ہاں میں کون ہوتا ہوں یہ فیصلہ کرنے والا..... یہ فیصلہ تو عالیہ کرے گی..... میں نے اسے سندیرہ بھجوا دیا ہے..... وہ آتی ہی ہوگی..... لووہ آگئی۔“

پنڈت شاستری نے سامنے اشارہ کیا جہاں سے نمرتیا عالیہ آ رہی تھی۔

ارجن کمار کو لگا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ بالکل نمرتیا جیسی شکل تھی عالیہ کی۔

عالیہ نے ہاتھ جوڑ کر پنڈت شاستری کو نہسکار کیا اور پوچھا۔ ”پنڈت جی آپ نے مجھے بلایا۔“  
”ہاں بیٹا..... یہ دیکھ تیرا باپ آیا ہے تجھ سے ملنے۔“

عالیہ نے ارجن کمار کی طرف دیکھا۔ ارجن کمار کو نہ جانے ایک دم کیا ہوا..... انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ عالیہ کے سامنے جوڑ دیئے اور رونے لگے وہ بولے۔  
”بیٹا میں جانتا ہوں کہ سب میری غلطی ہے..... تو میری وجہ سے مری ہے..... تیری موت کے بعد میں پاگل سا ہو گیا تھا..... میں نے اسی پاگل پن میں کشوری اور وکرم کو مار دیا..... معاف کر دے مجھے بیٹا..... معاف کر دے۔“

عالیہ نے بولنا شروع کیا۔ ”پاپا آپ نے میری زندگی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلایا..... میں نے اس وقت ہی آپ کو معاف کر دیا تھا کیا میری خودکشی کے بعد یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی کہ میں آپ سے بھارت کرنے پر موت کو ترجیح دوں گی..... لیکن آج نہ سمجھ پائے..... میری ماسی کشوری اور میرے محبوب وکرم کے قاتل بن گئے..... میں اس کے لئے بھی آپ کو معاف کر دیتی..... لیکن پاپا آپ انسان سے شیطان بن گئے کتنے لوگوں کو شیطان کے قدموں میں قربان کیا اور آپ کا یہ جرم ناقابل معافی ہے..... میں آپ کو نہیں معاف کروں گی آپ جایں دوبارہ اس شیطان کے پاس..... اور اس کی پوجا کریں۔“

عالیہ نے اپنی بات ختم کی تو ارجن کمار کا ہاتھ اپنے سینے پر اٹھتا چلا گیا۔ وہ نیچے گر گئے پنڈت شاستری نے ان کی نبض چیک کی وہ مر چکے تھے انہوں نے عالیہ سے کہا۔ ”عالیہ یہ مر چکے ہیں۔“

عالیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ

بولی۔ ”آپ ان کا تم سنسکار کرو لیجیے گا۔ میں جاری ہوں۔“

عالیہ مندر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی کہ اسے کسی نے بلایا۔ ”سنو۔“

عالیہ نے مڑ کر دیکھا..... وہ خوابوں والا لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔  
”وکرم تم؟“ عالیہ حیرت زدہ تھی۔  
”تم تو مر چکے ہو۔“

وکرم بولا۔ ”ہاں میں مر گیا ہوں..... تمہارے باپ نے مجھے مار دیا تھا..... میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی نئی زندگی کے سفر میں تم جب بھی ہماری محبت کو شمار کرو تو اس میں اپنے باپ کی عداوت کو نہ شمار کرنا بھول جانا کہ ہماری محبت کے امرت میں تمہارے باپ نے کیسا زہر ملایا تھا..... انہیں ان کے کئے کی سزا مل گئی ہے اور تمہیں بھی نیا پریوار مل گیا ہے..... اپنی نئی زندگی خوشی خوشی جیو..... زندگی میں خوشیاں پانے کے بعد تمہیں موت کے بعد بھی خوشیاں ہی ملیں گی کیونکہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہاری زندگی میں بھی..... اور تمہارے مرنے کے بعد بھی۔“ وکرم اتنا کہہ کر غائب ہو گیا۔

عالیہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو..... لیکن اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے کیونکہ اس کا پریوار اس نئی زندگی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی..... یہ الگ بات تھی..... کہ اس کی نئی زندگی میں وکرم اس کے ساتھ نہیں تھا..... لیکن ابھی وکرم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اس کی زندگی میں بھی..... اور اس کے مرنے کے بعد بھی.....

عالیہ، وکرم کے ان الفاظ کو سوچ کر مطمئن ہو گئی۔



برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگردان انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدندان کر کے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک ناپیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روادولوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا تھا اور پھر بے اختیار میری نگاہیں رحیم بابا کی طرف گھوم گئیں۔ وہ پوری طرح ماں جی کی طرف متوجہ تھے، ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، وہ یقیناً کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ پہلے کی طرح ایک بار پھر ماں جی کا چہرہ بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اسی وقت رحیم بابا نے ماں جی کو مخاطب کیا۔ ”سنیں، بہن..... کیا آپ اسے جانتی ہیں؟“ ”کس کو؟“ ”انہوں نے رحیم بابا کو گھورا۔“ ”جان لیوا کو؟“ وہ پرسکون لہجے میں بولے۔ ”یہ جان لیوا ہے کون.....؟ کہاں رہتا ہے.....؟“ ”ارے..... آپ باہریوں کھڑی ہیں؟ اندر آ جائیں۔“ ”نہیں..... میں یہیں ٹھیک ہوں.....!“ وہ بولیں۔ ”کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے بہت سارے کام کرنے ہیں۔“

”اوہ اچھا.....“ رحیم بابا نے سر ہلایا۔ ”میں نے آپ سے جان لیوا کے بارے میں پوچھا تھا.....! کون ہے وہ.....؟“ ”جلد معلوم ہو جائے گا.....“ ماں جی نے سر ہلا کر کہا۔ پھر انہوں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور فوراً ہی دروازے سے ہٹ گئیں۔ وہ جا چکی تھیں، میں نے ہونٹوں کی طرح رحیم بابا کی طرف دیکھا وہ بھی خالی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ”رحیم بابا.....!“ میں نے ان کا ہاتھ ہلایا۔ ”آپ کہاں گم ہو گئے.....؟“ ”آں.....!“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ”گم کہاں ہوتا ہے؟ تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔“ ”دیکھا آپ نے.....!“ میں نے ان کی توجہ مبذول کروائی۔ ”بھئی بھئی یہ حال ہو جاتا ہے ماں جی کا.....“ ”ہاں..... میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں.....!“ انہوں نے سر ہلایا۔

”تم جلدی سے جا کر نہیں دیکھو۔ مجھے فوراً بتاؤ۔“  
 ”کہو کیا کر رہی ہیں اور کہاں ہیں۔“  
 ”جی اچھا۔“ میں فوراً اٹھا۔  
 ”جلدی کرو بیٹا۔“ انہوں نے کہا تھا۔  
 میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آیا، میں ادھر ادھر  
 جھانک تاک کرتا ہوا کچن میں جا پہنچا، ماں جی یہاں موجود  
 دھنیں اور بڑے مزے سے چوبے پر مٹی ہوئی ہانڈی میں  
 چچہ کھارہی تھیں۔  
 ”اماں جی۔“ میں نے انہیں پکارا۔  
 وہ فوراً اٹھیں اور بولیں۔  
 ”ارے نکلیں۔ تم بالکل صحیح موقع پر آئے  
 ہو۔۔۔۔۔۔ یہ لو۔۔۔۔۔۔ ذرا شک تو کچھ کرتاؤ۔۔۔۔۔۔ میری تو آج  
 کچھ میں نہیں آ رہا۔“  
 میں نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دی،  
 انہوں نے مجھے میں موجود شور بہ پر پھونک ماری اور میری  
 ہتھیلی پر پکڑا دیا۔  
 میں نے زبان سے شور بہ چاٹا اور سر ہلا کر بولا۔  
 ”بالکل ٹھیک ہے اماں جی۔۔۔۔۔۔ برابر ہے۔“  
 ”شکر ہے۔“ انہوں نے طویل سانس لی۔  
 ”میں آج تمہارا پسندیدہ قورمہ گوشت بنا رہی  
 ہوں۔ اور رحیم بھائی کو بھی جانے مت دینا۔“  
 ”جی ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔  
 پھر میں نے محتاط انداز میں ان کی طرف دیکھ  
 کر کہا۔  
 ”آپ ابھی کمرے کی طرف کیوں آئی تھیں؟  
 کوئی کام تھا۔؟“  
 ”کمرے کی طرف۔؟“ انہوں نے حیرت  
 سے مجھ دیکھا۔  
 ”نہیں تو۔۔۔۔۔۔ میں ایک گھنٹے سے یہاں موجود  
 ہوں۔۔۔۔۔۔ میں تو ایک پل کے لئے بھی باہر نہیں نکلی۔“  
 ”اچھا۔۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔ میں حیرت زدہ  
 رہ گیا۔  
 ”کیوں۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔؟“ انہوں نے مجھے غور

سے دیکھا۔  
 ”تم نے مجھے کہاں دیکھ لیا۔؟ میں تو سائن  
 بنانے میں مصروف ہوں۔ کہاں جاؤں گی۔“  
 ”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کھجایا۔  
 پھر میں کچھ کہے بغیر ہی دروازے کی طرف بڑھ  
 گیا۔  
 ”سنو۔۔۔۔۔۔ رحیم بھائی کو جانے مت دینا۔۔۔۔۔۔  
 ہاں۔۔۔۔۔۔“  
 ”اچھا۔۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ رحیم بابا نے پر معنی  
 انداز میں سر ہلایا۔  
 ماں جی نے جو کچھ کہا تھا، وہ بیان کے طور پر میں  
 نے رحیم بابا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔  
 ”لیکن رحیم بابا۔۔۔۔۔۔ اس کا کیا مطلب  
 ہوا۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے اچھ کر پوچھا۔  
 ”ماں جی تو صاف انکار کر رہی ہیں، جبکہ وہ یہاں  
 آئی تھیں۔“  
 ”لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ جھوٹ کیوں بولیں گی  
 ۔۔۔۔۔۔ رحیم بابا دھیرے سے مسکرائے۔  
 ”دوسری بات یہ ہے کہ جو دروازے پر آیا تھا،  
 اس کا چہرہ بھی تمہاری ماں جی سے کافی مختلف تھا، کیا تم نے  
 غور نہیں کیا تھا؟“  
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔۔ مجھے احساس ہے، ان کی یہ حالت  
 میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں میں نے آپ کو بتایا تھا  
 کہ اس وقت بھی انہوں نے کسی جاں لیوا کا ذکر کیا تھا!“  
 ”مجھے یاد ہے۔۔۔۔۔۔“ انہوں نے سر ہلایا۔  
 ”اور میں ایک نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں۔“  
 ”وہ کیا رحیم بابا۔“  
 ”یہ تمہاری ماں جی ہی تھیں۔“ رحیم بابا نے بتایا۔  
 ”لیکن ان پر کوئی ایسا تسلط جھالیتا ہے، ان  
 پر حاوی ہو کر انہیں اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔  
 ”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ بات ہے؟“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔

”اسی لئے تمہاری ماں جی کو ظلم نہیں ہوتا کہ وہ  
 کہاں ہیں۔۔۔۔۔۔ اور کیا کر رہی ہیں۔“  
 ”اوہ میرے خدا۔۔۔۔۔۔“ میں کانپ اٹھا۔  
 ”اس طرح تو وہ ماں جی کو نقصان بھی  
 پہنچا سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے رحیم بابا۔۔۔۔۔۔ کیا اب ہم  
 دونوں کی باری ہے۔؟ کیونکہ اس گھر سے پہلے ہی تین  
 لاکھ اٹھ سو پچاسی ہیں، اور اب میں اور ماں جی رہ گئے ہیں۔“  
 ”تم گھبراؤ نہیں۔“ رحیم بابا نے مجھے تسلی دی۔  
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر اس شے  
 کو نقصان پہنچانا ہوتا۔۔۔۔۔۔ تو اب تک نہ جانے کیا  
 ہو چکا ہوتا۔“  
 ”لیکن رحیم بابا۔ کیا مجرورہ ہے۔۔۔۔۔۔ کسی  
 وقت بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اعتراض کیا۔  
 ”دیکھو۔۔۔۔۔۔!“ وہ میری طرف پوری طرح  
 متوجہ ہو گئے۔  
 ”تمہاری ماں جی کو اپنے قبضے میں کر لینے کا مقصد  
 فی الحال اس کا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پیغامات تم تک  
 پہنچا سکے۔“  
 ”کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟“ میں نے چونک کر انہیں  
 دیکھا۔  
 ”بات سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔  
 ”اے اگر کسی سے کچھ کہنا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ  
 انسانی زبان کا سہارا لے گا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو جان  
 لیوا کے نام سے صرف ظاہر کر رہا ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ  
 اس کی ہستی جیتی جاگتی موجود ہے۔ البتہ وہ ہماری  
 آنکھوں سے اوجھل ہے۔“  
 ”لیکن اس کا کیا فائدہ۔؟“ میرے منہ  
 سے نکلا۔  
 ”وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔؟“  
 ”یہ بات تو وہی بتا سکتا ہے۔“ رحیم بابا بولے۔  
 ”تمہارے باپ دادا اور دیگر عزیز واقارب کی  
 موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کا کیا مقصد ہے۔  
 وہ کیا چاہتا ہے۔“

”اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے رحیم بابا۔“ میں  
 نے ہونٹ میکرے۔  
 ”وہ ہم دونوں کو بھی مار ڈالے گا۔“ ابھی وہ صرف  
 لطف لے رہا ہے۔ ہمیں بریشان کر کے اس کا دل خوش  
 ہوتا ہے۔ کیا آپ نے بھی مٹی اور چوہے کے مابین  
 تماشا دیکھا ہے؟“  
 ”کیسا تماشا۔۔۔۔۔۔؟“  
 ”میں دھیرے سے ہنسا اور پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔  
 ”مٹی جب زیادہ بھوکی نہیں ہوتی اور چوہے  
 کو پکڑ لیتی ہے تو اسے چیرنے پھاڑنے کے بجائے اس  
 سے کھاتی ہے۔۔۔۔۔۔ اسے بھگانے ہے اور پھر خود اس کے پیچھے  
 بھاگتی ہے۔ پھر جب اس کھیل سے اس کا جی بھر جاتا ہے  
 تو وہ اسے کھا جاتی ہے۔ کیا آپ نے بھی دیکھا ہے؟“  
 ”جو اب رحیم بابا خاموش تھے، میں نے ان کی طرف  
 دیکھا اور پھر بے تلی لہجے میں بولا۔  
 ”تو اس وقت میرے باپ دادا کا دشمن وہی کھیل  
 بھیل رہا ہے۔ اس نے میرے باپ کو ماں جی کے  
 ہاتھوں مر دیا تھا۔ اور میں بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہ  
 گیا۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے باپ  
 نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔ میری  
 دغوب صورت، بہنوں کی لاشیں اس کھیل میں ملیں، کہ  
 جس کو ان بے چاریوں نے بھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ کوئی  
 کچھ نہ کر سکا۔۔۔۔۔۔ سب نے ہی اسے حادثے کا نام دے دیا  
 ۔۔۔۔۔۔ اور وہ دونوں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میرے باپ  
 پر خنجر سے وار کیا گیا۔ لیکن پولیس آج تک قاتل کو گرفتار  
 نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل نے میری ماں  
 جی کے ذریعے انہیں قتل کروایا تھا۔ اف۔۔۔۔۔۔ یہ کتنا بڑا  
 ظلم ہے۔ لیکن اس ظلم کا جواب دینے والا کوئی نہیں  
 ہے۔ مجھے۔۔۔۔۔۔ انصاف دلانے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ میں  
 کسے پکاروں۔۔۔۔۔۔؟ کسے آواز دوں۔۔۔۔۔۔؟“  
 میں جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا۔ رحیم بابا  
 میری شکل تک دے رہے تھے۔  
 پھر وہ اٹھے اور انہوں نے قدرے جھکتے ہوئے



میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔  
میری آنکھوں سے آنسو چھلک آئے تھے، اس وقت نہ جانے کیوں میرے سارے ذمہ ابھر کر سامنے آ گئے تھے اور آج ان زخموں میں سخت تکلیف تھی۔  
رجیم بابا نے میرا چہرہ لوہا ٹھایا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

”میری بات سنو میرے بیٹے..... میں جانتا ہوں کہ تم پر بہت ظلم ڈھائے گئے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے اس گھر کو گویا آگ میں پھونک دیا گیا..... میں اس داستان سے اچھی طرح واقف ہوں..... لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... اور وہ یہ کہ عروج کو ہمیشہ زوال ہوتا ہے اور ظلم کبھی نہ کبھی ضرور اپنے انجام سے دو چار ہوتا ہے، کیونکہ مظلوم کی آہ و غصہ کو کبھی ملا دیتی ہے۔“  
”لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا.....“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیونکہ میں بہت بد نصیب ہوں..... بہت ہی بد نصیب اور کمزور انسان ہوں۔“  
”یہ تمہاری غلط فہمی ہے میرے بیٹے.....“ انہوں نے میرا کانٹا ہلایا۔

”ت..... تم..... ہرگز کمزور نہیں ہو..... تم اگر زمین پر ٹوکھ مارو تو اس میں سے پانی کا چشمہ نکل آئے..... نصیب کو برداشت کرو..... تم ہمت کرو..... اور اپنا نصیب خود بناؤ۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہو گے..... ہاں وہ وقت ضرور آئے گا۔“

”میں کیا کروں رجیم بابا.....“ میں نے پوچھا۔  
”اب آپ ہی بتائیں.....؟“  
”ضرور بتاؤں گا.....“ انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”لیکن سب سے پہلے تم اپنے دل سے ڈر نکال دو..... اور خود کو مضبوط کر لو..... اور تم نے خود کو کمزور سمجھا تو پھر ہر قدم پر ناکامی ہوگی..... پہلے یہ کام کرو..... پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔“

انتہا کہہ کر وہ چنگے اور جلدی سے بولے۔  
”ارے..... باتوں میں وقت کا خیال ہی نہیں رہا، مجھے واپس جانا ہے..... اچھا..... تو اب میں چلتا ہوں۔“  
”آپ کھانا کھا کر جائیں گے..... ماں جی نے بھی تاکید کی ہے۔“

”نہیں.....! میں اب چلوں گا، ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی..... یہ سنا ہو کہ بی بی صاحبہ کو شک ہو جائے۔“  
”اچھا تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کب آئیں گے؟“  
”جس دن قاسم میاں واپس آ گئے، میں اسی دن آ جاؤں گا..... ٹھیک ہے ناں.....؟ اب میں جا رہا ہوں۔“  
یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆  
ماں جی اس بات پر بہت خفا ہوئی تھیں کہ رجیم بابا کھانا کھا کر بغیر ہی چلے گئے۔ خیر..... میں نے پھر انہیں سمجھا دیا تھا۔  
دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سدو نازل ہو گیا..... ماں جی اس وقت آرام کر رہی تھیں۔

میں نے سدو سے کہا۔  
”آؤ گھر میں ہی بیٹھے ہیں۔“  
”ابے بھائی..... گھر سے تو نکل کر آ رہا ہوں.....“ اسنے منہ بنایا۔

”تم پھر ڈروں میں تمہیں دے رہے ہو۔“  
”اس دھوپ میں کہاں دھکے کھاؤ گے..... میں نے پوچھا۔  
”چلو..... آج پھر چشمے پر چلتے ہیں.....“ اس نے کہا۔

”لیکن برائے مہربانی آج وہ ڈرامہ مت کرنا۔“  
”کون سا ڈرامہ.....؟“ میں انجان بن گیا۔  
”یہی میں چکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“  
”اب بھولے مت بنو.....“ اس نے میرے

دھمکے پر ہاتھ مارا۔  
”تم ہر دفعہ یہاں بنا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔“

”اچھا..... میں ہنسا۔  
”چلو..... اب نہیں بھاگوں گا۔“  
”یار..... ایک بات بتاؤں.....“ سدو نے کچھ چپے ہوئے کہا۔

”ہاں..... بولو۔“  
”بات دراصل یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر نہانے کا راز ہی اور ہے..... یقین کرو..... یوں لگتا ہے جیسے وہ پانی ج میں اتر گیا ہو..... دماغ کی ساری نیس کھل جاتی ہے۔“

”یاد تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔“ میں بھنا اٹھا۔  
”میرا خیال ہے کہ اسٹریم لیتے ہوئے یہ حالت ہے۔ اور تم چشمے کے پانی میں ڈکیاں لگاتے ہو۔“  
”ہا ہا ہا.....“ وہ بڑھکتے انداز میں ہنسا۔

”تم کافی اچھا بولنے لگے ہو..... اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد تم میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو.....“ میں مسکرایا۔  
”کیونکہ تم میرے بچپن کے دوست ہو.....“  
”اچھا چھوڑو..... یہ بتاؤ کہ تمہارے لباچی کے لڑکا کچھ نہ لگا۔“

”نہیں.....“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔  
”ایسا کچھ نہیں ہوا.....“  
”بڑے انوس کی بات ہے.....“ سدو نے بھڑکے لہجے میں کہا۔

”یہاں مارنا تو بہت آسان ہے، لیکن مارنے کو مارنا بہت مشکل ہے۔ ہر طرف بے انصافی اور قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے بڑے بڑے حکموں میں ستانی کا کاروبار عروج پر ہے۔ نہ جانے اس ملک کا کیا حال ہے؟ لیکن آج وہ ان کے نیچے ہے اور اسے مارنے والا یقیناً اس وقت

کہیں مرے گا اور ہا ہوگا۔“  
”ہو سکتا ہے.....! میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔  
”لیکن میں کبھی کیا سکتا ہوں۔“  
”واقعی.....“ سدو نے سر ہلایا۔

”تم نے ممبر ہی کر لیا، یہی بڑی بات ہے۔ آؤ اب چلیں۔“  
راستے میں بھی اسی قسم کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں..... اور پھر ہم دونوں کافی مدت بعد ایک بار پھر چشمے کے قریب پہنچ گئے۔

یہاں کا منظر آج بھی وہی تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے گھنے سائے اور ان سے چمن کے آنے والی دھوپ میں چشمے کا ابلتا ہوا پانی چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔  
”میں تو اکثر یہاں آتا رہا ہوں.....“ سدو نے بتایا۔

”کیونکہ مجھے یہاں بہت سکون ملتا ہے۔ اور سنو..... ایک دفعہ تو زبردست واقعہ ہو گیا۔“  
”وہ کیا.....؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے ذرا فاصلے پر خانہ بدوش آ کر آباد ہو گئے ہیں۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔

”تم کو تو میری عادت معلوم ہے کہ میں بغیر کپڑوں کے نہاتا ہوں۔ اتفاق سے اس دن ان خانہ بدوشوں کی چند لڑکیاں اس طرف نکل آئیں۔ میں اسی وقت نہا کر باہر نکلا تھا..... وہ بے چاریاں جھپٹیں مارتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں۔“

”یہ سن کر میری بھی ہنسی نکل گئی..... تھوڑی دیر بعد دونوں چشمے کے گہرے حصے میں اتر گئے۔  
نہ جانے کیوں آج سدو میری طرف کافی غور سے دیکھ رہا تھا، میں خفیف سا ہوا گیا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو یار.....“ میں نے اسے گھورا۔

”وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔  
”تم اب جوان ہو گئے ہو..... میرے منے۔“  
”اور تم کون سا چھوٹے رہ گئے ہو.....“ میں بولا۔

”تم بھی تو جوان ہوئے شرم۔“  
 سدو ٹھسے مار کر ہنسا، پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں اس جگہ اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں، البتہ میں نے اس سے کہا۔  
 ”تم واقعی کافی بے غیرت ہو گئے ہو۔۔۔۔۔“  
 ”ارے مذاق کر رہا ہوں جانی۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔  
 ”تم تو میرے بچپن کے دوست ہو۔ اگر تم سے بے تکلفی نہ ہوگی تو پھر کس سے ہوگی۔ ورنہ تم مجھے بچوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھ لو گے تو پچھان نہ سکو گے۔۔۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔“  
 میں نے سر ہلا دیا، مین اسی وقت میری نظر سامنے اٹھ گئی۔۔۔۔۔ اور میں چونک اٹھا۔ درختوں کے درمیان ایک بار پھر وہی سیاہ ہیولہ دکھائی دیا تھا۔  
 حالانکہ کافی مدت بعد میں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہیولہ اسی صورت میں سامنے موجود تھا۔  
 میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا۔۔۔۔۔ اور پھر سر جھٹک کر سدو کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”سدو مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔“  
 ”کیا ہوا؟“  
 ”آں۔۔۔۔۔ میں چونکا۔“  
 ”کچھ نہیں؟“  
 ”جھوٹ مت بولو۔۔۔۔۔!“ سدو نے کہا۔  
 ”تمہارے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“  
 ”وہی ساری مجھے آج پھر دکھائی دے رہا ہے۔“  
 ”کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔  
 ”آخر یہ کیا ہے؟ اور تمہیں ہی کیوں دکھائی دیتا ہے۔“  
 ”خدا جانے۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ اُلجھا ہوا تھا۔  
 میں نے اس بار کن اکھیلوں سے درختوں کی جانب دیکھا، ہیولہ بدستور وہاں موجود تھا۔  
 مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔۔۔۔۔ اسی وقت مجھے رحیم بابا کی باتیں یاد آنے لگیں انہوں نے کہا تھا کہ

ڈرانسان کو کنزور کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ یہ ڈر۔۔۔۔۔ دل سے نکالنا ہوگا۔۔۔۔۔ اور اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہوگا۔  
 دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔  
 ”کہیں یہ وہی تو نہیں۔۔۔۔۔ جو میرے خاندان کا قاتل ہے۔۔۔۔۔ جس نے میرے سارے رشتے جھٹے چھین لئے اور مجھے تباہ کر دیا۔۔۔۔۔ باپ کا سایہ کتنا مضبوط ہوتا ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنی اولاد کو کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔۔ لیکن آج وہ میری دہانہ میں نہیں تھا۔۔۔۔۔ اسے مجھ سے چھین لیا گیا۔“  
 نہ جانے کیوں میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی، میں نے ایک جھٹکے سے اس ہیولے کی طرف دیکھا۔ جس پر کالے رنگ کی چادر تھی ہوئی تھی اور اسی میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔  
 ”کیا ہوا ٹھیک۔۔۔۔۔؟“ سدو میرے قریب آ گیا۔  
 ”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ زیر خند تھا۔  
 ”یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا، لیکن میں صاف طور پر اسے دیکھ رہا ہوں۔ سدو۔۔۔۔۔ یہ میرا دشمن ہے، میرے خاندان کا دشمن ہے اسی نے میرے پیاروں کو مجھ سے جدا کیا ہے۔“  
 ”اچھا۔۔۔۔۔“ سدو وہ فٹوں کی طرح سر ہلا کر بولا۔  
 اس غریب کو تو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔  
 ”آج میں ذرا اس سے معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا چاہتا ہے۔“  
 ”کیسے معلوم کرو گے؟“ سدو نے پوچھا تھا۔  
 ”ایسے۔۔۔۔۔!“ یہ کہہ کر میں جھٹکے کی گہرائی سے باہر نکل آیا، میں اس قدر جوش میں تھا کہ برہنہ حالت میں ہی اس سیاہ ہیولے کی طرف بڑھا۔  
 میرے قدم اس کی طرف اٹھ رہے تھے اور نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو رہی تھیں، لیکن میں خود ہی اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا تھا۔  
 ذرا سی فاصلہ رہ گیا تھا کہ اچانک وہ ہیولہ غائب

۔۔۔۔۔ درختوں کے درمیان وہ اب موجود نہیں تھا۔  
 میرے اٹھتے قدم رک گئے، میں نے ادھر ادھر لاپرواہی پر اسرار ہونے کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔  
 کچھ سوچ کر میں ذرا آگے بڑھ گیا، عین اسی لمحے اپنی برہنگی کا احساس ہوگا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔  
 چنانچہ سامنے سے آنے والی دونوں لڑکیوں کی دھڑکنوں سے گویا درخت تل گئے۔  
 وہ اچانک ہی سامنے آئی تھیں اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ہلچل مچ گئی۔  
 میں بھی ہلچلا کر درختوں کی آڑ میں ہو گیا۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں مٹکے تھے، وہ یقیناً خانہ بدوش تھیں جسے پرانی بھرتی آنی تھیں۔  
 میں نے گردن نکال کر جھانکا، وہ اسی جگہ کھڑی تھیں۔  
 انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔  
 ان میں ایک لڑکی کافی خوب صورت تھی، یوں لگتی تھی جیسے وہ چاند جنگل میں اتر آ یا ہو، مجھے اس وقت یہ سوچ بھی نہیں تھی۔  
 میں بلند آواز میں بولا۔  
 ”تم دونوں ابھی وہاں چلی جاؤ۔۔۔۔۔ جھٹے پر میرا ہاتھ بھی موجود ہے۔ وہ ابھی نہا رہا ہے۔“  
 ”یہ کیا حرکت ہے جی۔۔۔۔۔؟“ خوبصورت کے ہاتھ اٹھ کر ہاتھ نہا کر بولا۔  
 ”وہ ہمارے پینے کا پانی ہے، تم لوگ نہا کر اسے نہا کر دے۔“  
 ”جھٹے کا پانی گندا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ میں نے اسے دیکھا۔  
 ”تم کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے؟“  
 اب دونوں کی ہمت بڑھ چکی تھی، اسی لڑکی نے ہاتھ اٹھ کر کان میں کچھ کہا اور زور سے ہنس پڑی۔  
 خوب صورت لڑکی نے اس کے دو ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔  
 اور پھر وہاں ہی کے لئے محوم رہی تھیں کہ پہلی لڑکی نے اس کا بازو تھام لیا۔  
 ”تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔۔۔؟ کو۔۔۔۔۔ ہم پانی بھر کر ہی جائیں گے۔“ وہ بولی تھی۔  
 ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ ضرور بھر لیتا۔۔۔۔۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔  
 ”لیکن ہمیں کپڑے پہننے کا موقع تو دو۔۔۔۔۔“  
 ”ہم کیا کریں۔۔۔۔۔؟“ پہلی والی نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”ارے بھئی ذرا آگے پیچھے ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ تیز ہو گیا۔  
 ”تھوڑی دیر بعد ادھر آ جانا ہم لوگ بھی چلے جائیں گے۔“  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔“ پہلی بولی تھی۔  
 ”ہم جا رہے ہیں آؤ شالا۔“  
 ”شالا۔۔۔۔۔“ میں نے بے خیالی میں دھریا۔  
 ”نام تو اچھا ہے۔“  
 لڑکی جاتے جاتے چلتی اور بولی۔  
 ”تم نے کچھ کہا۔“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ اب جان بھی چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ میں نے درخت کے عقب سے ہی آواز لگائی۔  
 ”اگر اب تم نہیں نکلتی تو میں۔۔۔۔۔!“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ کیا کرو گے؟“ وہ شاید تنک کر بولی تھی۔  
 ”میں اسی حالت میں باہر نکل آؤں گا۔“  
 ”چلو چنچا۔۔۔۔۔“ شالا نامی لڑکی نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔  
 ”تم تو ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہو۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہاں آ جائیں گے۔“  
 اس کی آواز میں عجیب سی مٹھاس تھی میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی اور پھر وہ چند گھنٹے کی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی وہ دونوں درختوں کی آڑ میں اوجھل ہو گئیں۔  
 میں باہر نکل آیا، اب میں تیز رفتاری سے جھٹکے کی طرف قدم بڑھ رہا تھا۔

اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی، کیونکہ مجھے رجم بابا کی باتیں یاد آگئی تھیں۔  
میرے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا تھا۔ کد باب ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ڈر مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

”کون ہو تم..... سامنے آؤ۔“

کوئی جواب نہیں ملا، میں چوکنے والے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، لیکن کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پھر نکارا۔

”ہلولو..... جواب دو۔“

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

میں نے سوچا کہ دو قدم آگے بڑھوں، لیکن قدموں نے ساتھ نہ دیا حوصلہ پست سا ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت موٹا آدمی ہانپ رہا ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اب مجھ میں سکت نہ رہی کہ میں اس ماحول میں اکیلا کھڑا رہ سکوں۔

چنانچہ میں بھاگ کر اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے دیکھا، ماں جی بدستور سوئی ہوئی تھیں۔

بہر حال یہاں ان کے دجو دکا سہارا کافی تھا، میں نے اپنے بستر کا رخ کیا اور دبک کر لیٹ گیا۔

نہ جانے کب تک وہ پراسرار آوازیں بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجی رہیں اور پھر خود بہ خود ہی میری آنکھ لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح ہی صبح رجم بابا کی شکل دکھائی دی، ان کے عجیب تاثرات تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”کیا بات ہے رجم بابا؟“

”پرتوجہ دو۔ تاکہ اچھی نوکری مل سکے۔ مجھے جلد لگدھاری شادی کرنی ہے، میں اپنی زندگی میں ہی رکی بہاریں دیکھنا چاہتی ہوں۔“  
”یہ سب کچھ ضرور ہوگا اماں جی۔ آپ فکر مت میں نے کہا۔“

☆.....☆.....☆

رات کے وقت نہ جانے کیوں مجھے نیند آ رہی تھی۔ میں کافی دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا، اور پھر اکتا کر اٹھ بیٹھا۔

اماں جی اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھیں۔ میں اٹھ کر چیل پہنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

خندہ سی ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ اس گھر میں تھا ہی کون؟ چاروں طرف لے کر اراج تھا۔ ہوا کا عالم تھا۔ اس قدر خاموشی تھی

کی سرسراہٹ صاف طور پر گونج رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی، نہ جانے کیوں

ای لڑکی کا سر اٹھا، میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے وہ منظر بھی یاد آیا جب میں برہنہ حالت میں ان کے سامنے آ گیا تھا۔

مثلاً میں ضرور کوئی خاص بات تھی، وہ میرے سے چپ کر رہ گئی تھی اور اب دل میں صرف یہی تنہا

کے کسی بھی طرح اس سے مل بیٹھوں، خوب باتیں ان اور..... جس قدر ممکن ہو۔ اس کے ساتھ وقت

لڑوں..... لیکن یہ سب کچھ کس طرح لگتا تھا؟ ہاں۔ یہ بات غور طلب تھی۔

”کھیل..... کھیل.....“ چائیک ایک آواز نے

ایمانوں کی دنیا سے چونکا دیا۔ میں نے فوراً ہی ادھر ادھر دیکھا، لیکن کوئی بھی تونہ

اب میں نے کمرے کی طرف دیکھا کہ کہیں اماں نہ نکلا ہو۔ لیکن دروازہ بھی خالی پڑا تھا۔

”کھیل..... سنو کھیل.....“ ہوا کے دوش پر ایک

آواز ابھری۔ اب خوف مجھ پر طاری ہونے لگا، میں نے فوراً ہی

میں اس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں.....؟“  
”اوہ.....؟“ سہو کے منہ سے نکلا۔  
وہ میری طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔  
گھر واپس آیا تو ماں جی کو شدت سے اپنا منہ

پایا۔

”تم..... تم کہاں چلے گئے تھے.....؟“  
”سہو کے ساتھ تھا اماں جی۔“ میں نے کول

مول جواب دیا۔

”ہم دونوں ذرا کھیل میں مصروف تھے۔“  
”یہ تو ٹھیک ہے کہ تم سہو کے ساتھ

تھے۔“ انہوں نے مجھے گھورا۔  
”لیکن کھیل کون سا کھیل رہے تھے؟“

”جی..... میں سٹ پٹا گیا۔“  
”وہ..... اماں جی۔ وہ.....؟“

”بس رہے دو۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے

چپ کر دیا۔

”تم ضرور جھیل کی طرف چلے گئے ہو گے۔“  
”کیوں.....؟“

”قسم لے لو اماں جی۔“ میں جھٹ سے بولا۔  
”ہم جھیل پر نہیں گئے۔“

”جانتا بھی نہیں..... ہاں..... میں نے کہہ دیا ہے۔ اگر تم وہاں بھٹکے بھی تو مجھ سے برا کوئی نہ

ہوگا۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ میں وہاں بھٹکتا بھی نہیں ہوں۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔ پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

”میں نے محلے کی ایک عورت سے اپنے گھر کا ذکر چھیڑا ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”کس سلسلے میں اماں جی۔“ میں نے پوچھا۔  
”گھر کا ایک حصہ کمرے پر دے رہی ہوں۔“

”اوہ..... اچھا.....؟“  
”ہاں.....؟“ یہی کرنا ہوگا۔ تم اب صرف اپنی

اور اب میرے ذہن میں اس ہیولے کی جگہ مثلاً کا سر اٹھا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟  
راستے میں خاموش دیکھ کر سدھونے پوچھ ہی لیا۔  
”اب بتاؤ کہ تم کہاں گئے تھے.....؟“

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔  
”یار.....! میں تو اس کے تعاقب میں گیا تھا

جو مجھے بار بار دکھائی دیتا ہے، لیکن وہاں پہنچ کر کچھ اور ہی نظر آ گیا۔“

”اب اور کیا دیکھ لیا تم نے.....؟“ سہو نے حیرت سے پوچھا۔

”یار..... تمہاری آنکھوں میں خوردبین تو فٹ نہیں ہے.....؟ کیا کیا دیکھ لیتے ہو تم.....؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے..... جیسی تمہاری آنکھیں ہیں ویسی ہی میری بھی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ خانہ

بدشوں کی ہستی وہاں سے کتنی دور ہے.....؟“  
”کیوں.....؟ یہ کس خوشی میں پوچھ رہے

ہو.....؟“

”پوچی.....؟“ میں نے کندھے اچکائے۔  
”تم ضرور کچھ چھپا رہے ہو۔“ اس نے غور سے مجھ دیکھا۔

پھر اس کے اصرار پر مجھے زبان کھلنی ہی پڑی۔  
اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔

”تو تم کو انہوں نے نہ دکھا دیکھا.....؟“  
”ہاں یار.....“ میں نے کہا۔

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان سے مدھیڑ ہو جائے گی۔ میں تو غصے میں نکلا تھا۔ کیونکہ مجھے

وہاں جو اثر دکھائی دیتا ہے..... میں تو اس کے چکر میں بہرا رہا تھا۔“

”ایک تو تمہارے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”خیر..... یہ بتاؤ کہ اب تم خانہ بدشوں کا کیوں پوچھ رہے ہو.....؟“

”یار..... مثلاً نامی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔“



”بات تو خاص ہے بیٹا۔“ وہ پچھلے سے انداز میں مسکرائے۔

”تمہارے ماموں آگئے ہیں۔!“

”اوہ۔“ میرے منہ سے نکلا۔

اماں جی اس وقت وہاں موجود نہیں تھیں۔ وہ چائے بنانے میں مصروف تھیں۔

”ہاں۔“ وہ بولے۔

”وہ کل شام سے آئے ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے ایک بار بھی تمہارے والے کمرے کی خبر نہیں لی، اور نہ ہی مجھ سے کچھ پوچھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ممانی نے ان کے کان بھر دیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کچھ کہا ہو کہ قاسم ماموں شاید اب ہم لوگوں سے رابطہ بھی نہ کریں۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ وہ سر ہلا کر بولے۔

”کیونکہ اگر وہ عورت ایسا نہیں کرے گی تو خود اس کے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن میں قاسم ماموں کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اب میرے دل میں یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ میں واپس ان کے گھر میں جاؤں۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہوں گا کہ ان جیسا شخص بے وجہ کسی مشکل میں گرفتار ہو۔ کیونکہ اسی گھر میں ان کی موت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔“

”کیا میں قاسم میاں سے ذکر کروں۔“ رجیم بابا نے سادگی سے پوچھا۔

”ارے آپ یہ غضب مت کیجیے گا۔“ میں چونک کر بولا۔

”اگر انہوں نے غصے میں آ کر آپ کو کچھ کہہ دیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا، اور میں پھر بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ میں نے ہی آپ کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔“

”لیکن مجھے ہرگز افسوس نہیں ہوگا۔“ وہ بولے۔

”اور نہ ہی میں تمہیں کوئی دوش دوں گا، میں نے اپنے مالک کا نمک کھایا ہے اور میں یہی چاہوں گا کہ قاسم میاں کو ان خطرات سے آگاہ کروں کہ جن کی انہیں خبر ہی نہیں ہے۔“

”آپ خود کو اس معاملے سے الگ رکھ کر میری مدد کریں۔ مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“

اسی وقت اماں جی دروازے سے اندر داخل ہوئیں، ان کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی، رجیم بابا بول اٹھے۔

”ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی۔۔۔؟“

”اس لئے کہ آپ بھی شکیل کے ساتھ ہی ناشتہ کریں۔“ وہ مسکرائیں۔

”یہ بھی ہموکا ہے۔۔۔ اور شاید آپ بھی ناشتہ کر کے نہیں آئے ہوں گے۔“

یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئیں پھر اچانک ہی دروازے کے قریب جا کر پلٹیں اور رجیم بابا کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

”میرا بیٹا اپنے ماموں کے لئے بہت پریشان ہے۔۔۔ آپ اس کی مدد ضرور کریں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئیں، میں رنیم بابا کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولا۔

”یہ ماں جی کو اچانک کیا ہو جاتا ہے رجیم بابا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔! میں دیکھ رہا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولے۔

”یہ بعض اوقات اپنے آپ میں نہیں ہوتیں۔ ارے بیٹا۔ بہت سے معاملات ہیں، جن کو دیکھنا ہے اور ان کے ساتھ تیرا آواز ماموں ہے۔۔۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک طویل سانس لی۔

”کل رات کو مجھے میرے نام سے کئی بار کسی نے پکارا۔“ میں نے رات کا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔

”یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر وہ آواز کوئی رہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ قدرے فکر مند ہو گئے تھے۔

”جی ہاں۔۔۔“

”ضرور تم ڈرے ہو گے۔؟“

”کافی حد تک۔“ میں نے سر ہلایا۔

”بس یہی تمہیں اپنے دل سے نکالنا ہے۔“ وہ بولے۔

”کیونکہ ڈر کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں۔۔۔ جہاں خوف آ گیا وہاں ہار ہو گئی۔“

اب میں نے انہیں چشمے والا واقعہ بھی بتادیا، وہ سن لے کر ہنسنے لگے اور بول اٹھے۔

”یہ۔۔۔ یہی رویہ رکھو۔ یوں جیسے وہ صرف ہموکا ہو رہا ہو۔۔۔ تم اس سے دور بھاگنے کے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔“

”لیکن رجیم بابا وہ ہے کون۔۔۔؟ اور کیا چاہتا ہے۔۔۔؟“

”جس طرح وہ مجھے جگہ جگہ دکھائی دے رہا ہے۔ آواز سن دے کر پکار رہا ہے، اس سے تو اندازہ لگادہ مسئلہ، مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن تم ان سب باتوں کو نظر انداز نہ کرو۔“ وہ بولے۔

”اگر تم نے انہیں خود پر حاوی کر لیا تو پھر کچھ بھی ہو سکے گا۔“

”تو کیا۔۔۔ یہ وہی ہے جس نے اماں جی کا روپ میرے باپ کو مارا تھا۔ اور ان کی جان لی تھی؟“

”ہاں۔۔۔ شاید یہ وہی ہے۔“ رجیم بابا نے بولے۔

”اور تمہاری اماں جی کے مطابق اس کا نام جان۔۔۔“

”تو پھر وہ میری بھی جان لے سکتا ہے۔۔۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اس کے رحم و کرم سے بچ سکتا ہوں۔“

”میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“

”کرلوں گا۔۔۔“ وہ بولے۔

”جی الحال جو مسئلہ درپیش ہے، وہ تمہارے ماموں کا ہے۔ ان کے لئے کیا کرنا ہے؟“

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ وقار نامی آدمی کا گھر کہاں ہے۔؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

شام کے وقت میں ایک خوب صورت سی کوٹھی کے سامنے موجود تھا، یہ کوٹھی اسی وقار کی ملکیت تھی، جو ممانی کے ساتھ مل کر قاسم ماموں کے خاتمے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

میں نے کچھ سوچ کر دروازے پر کئی ہوئی تیل بجادی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قدموں کی آواز ابھری اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔

ایک دراز عمر کی موٹی سی عورت مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے وقار صاحب سے ملنا ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔

”کیا تو کوری چاہئے۔؟“ قدرے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

”جی نہیں۔۔۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بہت ضروری کام ہے۔“

”بھلا تمہیں اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔“

”یہ میں ان ہی کو بتا سکتا ہوں۔۔۔“ میں بھی اکر تے ہوئے بولا۔

”کیا آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔ زرار کو۔“

یہ کہہ کر اس عورت نے دروازہ بند کر لیا، جلد ہی دروازہ دوبارہ کھلا تھا اور ایک مردانہ چہرہ دکھائی دیا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، مجھے یقین تھا کہ اس شخص کا سراپا اور خدو خال قاسم ماموں کے گھر میں دیکھ چکا ہوں۔

یہ سو فیصد وہی تھا، جو رات میں چوری چھپے قاسم ماموں کے گھر آیا کرتا تھا۔

میں اسے پہچان چکا تھا۔  
 ”کون ہو تم؟“ وہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”مجھ سے کیا کام ہے تمہیں؟“  
 ”مجھے صبح صبح بیدار ہونے میں نے ممانی کا نام لیا اور ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔“  
 ”کیسا پیغام؟“ وہ چونک کر بولا۔  
 ”آپ آج وہاں نہیں جائے گا۔“ میں آہستہ سے بولا۔  
 ”کیونکہ قاسم صاحب آچکے ہیں۔“  
 ”اوہ۔“ اس کے منہ سے نکلا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ لیکن تم؟“  
 ”میں ان کے مالی رجیم بیا کاپیٹا ہوں۔“ میں نے صحت سے کہا۔  
 ”اور میں اس بات سے واقف ہوں کہ آپ وہاں آتے ہیں۔“  
 ”اچھا۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔  
 ”لیکن اگر تم نے یہ بات کسی اور کو بتائی تو اچھا نہ ہوگا۔“  
 ”آپ فکرمات کریں۔“ میں مسکرایا۔  
 ”کیونکہ میں صبح صبح کا وفادار ہوں۔“ اور وہ میرا ہر طرح سے خیال دیتی ہیں۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا نوٹ نکالا اور اسے میری طرف بڑھا کر بولا۔  
 ”اس ملاقات کو اپنی حد تک رکھنا۔ تم کافی کام کے معلوم ہوتے ہو۔ یہ رکھ لو۔“  
 میں نے فوراً ہی نوٹ ہاتھ میں پکڑ کر اسے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔  
 ”ٹھیک ہے صاحب۔ میں چلتا ہوں۔“  
 اس نے سر ہلا کر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے ہاتھ سے اپنی جیب کو ٹھٹھا اور اس میں رکھی ہوئی چیز

کو چھپتا کر مطمئن انداز میں گھوم گیا۔  
 پھر میں وہاں رکنا نہیں تھا، البتہ تھوڑی دور جا کر میں نے جیب سے اس چیز کو نکال لیا۔  
 یہ ایک چھوٹا سا شیپ ریکارڈ تھا، اب میرا رخ قاسم ماموں کے آفس کی طرف تھا۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری تھا۔  
 قاسم ماموں اپنے آفس میں موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر شدید غصہ اور نفرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔  
 ”چل جاؤ کھیل۔“ وہ بلند آواز میں بولے۔  
 ”اس سے پہلے کہ میرے منہ سے غلط الفاظ نکل جائیں۔ تم یہاں سے چل جاؤ۔“  
 ”میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا ماموں۔“ میری آواز میں دکھ تھا۔  
 ”لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کہہ سنانا چاہتا ہوں۔“ کیونکہ میں کچھ بتائیں سکتا۔ البتہ سنا ضرور سکتا ہوں۔  
 یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا شیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ میری اور وقار کی آوازیں گونجنے لگیں۔  
 قاسم ماموں کے چہرے پر اب حیرت کے تاثرات تھے۔ شیپ کی ہوئی گفتگو ختم ہوئی تو ان کے منہ سے نکلا۔  
 ”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“  
 ”میں ممانی صاحبہ کے بارے میں کچھ نہیں سکتا۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 ”لیکن وقار نامی یہ شخص اس سانپ کی طرح ہے، جسے آپ نے اپنی آستین میں پال رکھا ہے۔ میں جانتا کہ میرے اور اماں جی کے بارے میں آپ کو کیا ضرور جانتا ہوں کہ میں جس صبح کو گھر سے گیا ہوں۔ اس سے پیشتر گزرنے والی رات کو میں وقار کو۔۔۔ آپ کے کمرے میں دیکھ لیا تھا۔“  
 ”کھیل۔“ قاسم ماموں کی آواز میں نفرت کی

”ہاں ماموں۔۔۔ میں غم زدہ لہجے میں بولا۔  
 ”مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ ممانی صاحبہ نے وہاں سے نکال دیا، بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ آپ ان کو نہ صرف دھوکا دیا جا رہا ہے، بلکہ آپ کو راستے کی سازش بھی تیار کی جا رہی ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔  
 جواباً میں نے صحرمانی اور وقار کے درمیان ہونے والوں کے سامنے دہرا دئی۔ ان کا چہرہ دیکھنے سے گھٹا تھا، ایک رنگ آ رہا تھا، تو دوسرا جا رہا تھا۔  
 نہ جانے کیوں مجھے ان پر ترس آنے لگا، میں نے ان کہا۔  
 ”یقین کریں کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں کے علم میں لائے بغیر ہی اس معاملے کو دیکھ لیتا۔“  
 ”نرے ہوئے وقت نے جو کچھ مجھے دکھایا ہے۔۔۔“  
 ”میرے اعصاب کافی مضبوط کر دیئے ہیں۔“  
 ”میرا سب کچھ چھین لیا گیا۔ اور اب میں اس دنیا میں ہوں۔“  
 ”ایسا تم کو کھیل۔۔۔“ وہ تڑپ اٹھے۔  
 ”تمہاری ماں ہے، میں ہوں۔ ہم لوگ ہمارے پاس۔۔۔ تم تنہا نہیں ہو، اس عورت نے تم کو قوی طور پر ضرور تم سے دور کر دیا تھا، لیکن اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا ہے۔ میں تم سے منہ ہوں۔۔۔ اس نے تم پر الزام لگایا تھا کہ کے سناٹے میں تم نے اس کمرے میں ٹھننے کی کی تھی اور۔۔۔“  
 وہ بولتے بولتے رک گئے۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور بولا۔  
 ”ممانی نے اپنی سوچ کے مطابق ہی کام کیا۔ خیر۔۔۔ جو ہوا سو ہوا۔۔۔ اب آپ صرف اپنی جان کی پرواہ کریں۔ اور دشمنوں سے خود بچیں۔“  
 ”میں۔۔۔ میں کیا کروں۔ تم ہی بتاؤ۔۔۔ یہ کہ میرا ذہن ماؤف سا ہو رہا ہے، جس عورت

کو میں نے دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ کر دیں۔ اپنا آپ اس پر بھروسہ کر دیا۔ اس نے مجھے یہ صلہ دیا۔۔۔؟“  
 ”میں کیا کروں؟“  
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے انہیں حوصلہ دیا۔  
 ”بچہ تو آپ کے پاس ہے، بس ان دونوں بچیوں کو اس میں بند کرنا باقی ہے۔“  
 ”بچہ۔۔۔؟ کیا مطلب۔۔۔؟“ قاسم ماموں نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔  
 ”آپ کے گھر کا وہ کمرہ ہی ان دونوں کے لئے بچہ ثابت ہوگا۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”میں آپ کو بتانا ہوں کہ۔۔۔ کرنا کیا ہے۔“  
 میں نے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا، اس کے بارے میں مجھے رجیم بابا سے بگے بگے معلوم ہوتا رہا۔ کیونکہ وہ اکثر ہمارے گھر پر آ رہا کرتے تھے۔  
 اس دوران اماں جی نے آدھا مکان کرائے پر اٹھا دیا تھا، بابا جی والے حصے میں اب کرائے دار آچکے تھے اور وہ حصہ بادو گیا تھا۔  
 دونوں حصوں کے درمیان جو غلام تھا، اس دروازے کو پھاٹ دیا گیا تھا اور اس دیوار کی وجہ سے ہمارا گھر اب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔  
 رجیم بابا بھی اب ہمارے ساتھ شریک تھے، چنانچہ اسی بٹنے میں ایک دن شام کے وقت وہ قاسم ماموں کے ساتھ گھر پر آ گئے۔  
 انہیں دیکھ کر اماں جی سارے گلے شکوے بھول گئیں۔ بہن اور بھائی اپنے مقدس رشتے کا پاس رکھتے ہوئے گلے ملے۔۔۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
 قاسم ماموں نے ممانی صاحبہ کے سلوک اور اپنی بے انتہائی کی معافی بھی مانگی تھی۔  
 اماں جی کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ قاسم ماموں اور رجیم بابا آج گھر میں ہی رکھیں گے۔

وہ فوراً ہی کھانے پکانے کی فکر میں جھٹا ہو کر کچن کی طرف چلی گئیں اب میں قاسم ماموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”جی ماموں..... کیا حال چال ہیں.....؟“  
”پتا نہیں.....“ انہوں نے مزاحیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

”کیونکہ میں آج شہر سے باہر گیا ہوا ہوں.....“  
”بھئی..... کاروباری سلسلے میں.....“

”اوہ..... گڈ.....“ میں مسکرایا۔  
”یعنی آج رات کافی اہم ہے..... اور شاید انجام خیر بھی.....“

”ہاں.....“ انہوں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔  
”انہوں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔“

”میں نے سارا انتظام کر دیا ہے..... اور مجھے یقین ہے کہ وہ آج ضرور وہاں آئے گا..... کیونکہ میں نے اس دوران سحر کو بالکل موقع نہیں دیا کہ وہ جہاں کہیں جائے..... میں پورے ہفتے کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا ہوں.....“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”رات کے وقت ہم یہاں سے نکلیں گے.....؟“  
”انہوں نے بتایا۔“

”میں نے اپنے ایک ذمہ دار دوست کو سب کچھ بتایا ہے وہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے..... ظاہر ہے کہ ہمیں ایسے معاملات کے لئے تحوش ثبوت کے ساتھ ساتھ گواہ کی بھی ضرورت ہے.....“

”بالکل ٹھیک.....“  
”ویسے سحر مجھے پتک کے پروگرام کے لئے اکساتی رہی ہے.....“ انہوں نے بتایا۔

”میں نے تو صاف منع کر دیا مجھے یقین ہے کہ اسی پتک میں کچھ گزیر کا امکان ہے..... ہو سکتا ہے کہ وہاں وقار خود بھی موجود ہو.....“

”ممکن ہے ماموں.....“ میں نے سر ہلایا۔

”اور کچھ بعید نہیں کہ وہ لوگ اسی پروگرام میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے.....“

”ہاں.....“ وہ بولے۔  
”مگر تم نے میری آنکھیں نہ کھولی ہو تیس تو شاہ مجھے کسی گہری کھائی میں دھکیل کر گتائی کی سوسہ مار دیا جاتا.....“

☆.....☆.....☆

آدھی رات کے وقت قاسم ماموں کی کاروبار پر رُک پر وہاں دوں تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر ان کا دوسرا براجمان تھا، جبکہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

ان کے دوست کا نام ریحان احمد تھا، اور وہ پولیس کے مجھے سے تعلق رکھتا تھا، چونکہ آدھی رات ہو رہی تھی، اس لئے کچھ جگہوں پر پولیس کی گاڑیوں نے ہمیں روکا، لیکن ریحان احمد کی بدولت فوراً ہی ہماری کار ہمارے منزل پر وہاں دوں ہو گئی تھی۔

پھر قاسم ماموں کے گھر سے ذرا فاصلے پر کار کو روک دیا گیا تھا، سب سے پہلے ریحان صاحب اترے، ان کے پیچھے میں اور قاسم ماموں بھی باہر نکل آئے۔

صدر دروازے کے قریب پہنچ کر قاسم ماموں نے اسے دھکا دیا، وہ آہستگی کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولے۔

”یہ رحیم بابا کا کام ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قاتل موجود ہے.....“

”جی.....؟“ میں نے اتنا ہی کہا تھا۔  
”تینوں اندر داخل ہو گئے، چاروں طرف تاریکی اور نیم تاریکی کا راج تھا..... اور چاروں طرف کا ماحول سناتے میں ڈوبا ہوا تھا۔“

عین اسی وقت ایک سایہ ہماری طرف بڑھا، سایہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا، ریحان احمد نے فوراً ہی ہاتھ پٹل نکال لیا، لیکن اسی وقت سایہ بول اٹھا۔

”میں رحیم ہوں..... آپ لوگوں کا انتظار.....“

”اوہ.....“ قاسم ماموں کے منہ سے نکلا پھر وہ

”جی ہاں صاحب.....“ رحیم بابا نے جواب دیا۔  
”دوسرے دوکانی دیر پہلے ہی یہاں آچکا ہے.....“  
”ٹھیک ہے رحیم بابا.....“ قاسم ماموں نے مدغم کیا تھا۔

”آج کا کام ختم ہو گیا..... اب آپ آرام لیں.....“

”جی بہتر.....“ وہ بولے اور پھر فوراً ہی ایک لڑائی۔

اب ہمارے قدم گھر کے اندرونی حصے کی طرف گئے تھے پورچ سے ہوتے ہوئے ہم برآمدے میں گئے، جلدی قاسم ماموں کا کمرہ ہمارے سامنے

ایسے میں ریحان احمد نے سرگوشی میں پوچھا۔  
”قاسم..... یہی کمرہ ہے؟“

”ہاں.....“ انہوں نے سر ہلایا۔  
”اس کا کوئی اور دروازہ تو نہیں ہے.....؟“

”نہیں.....“  
”جی.....؟“

”نہیں..... ٹھیک ہے.....؟“ ریحان احمد نے اشارے سے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر قاسم ماموں کے بڑھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

کوئی جواب نہ ملا تو قاسم ماموں نے ایک بار پھر گھبراہٹ سے ڈال دیا۔

”تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی.....“  
”کون ہے.....؟“ یہ سحر ممانی کی آواز تھی۔

”لوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں ڈوبی ہوں.....“  
”ہمارے جھٹک رہا تھا میں ان کی ذہانت کی دلدور دینے لگا۔“

”دروازہ کھلو کھو.....“ ماموں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

میں کہا۔

”میں ہوں.....“

”آ..... آپ.....“ ان کی گویا آواز ہی پھٹ پڑی۔

”آپ تو..... شہر سے باہر گئے تھے.....“  
”ہاں..... لیکن جس کام سے گیا تھا وہ ہونہر کا..... جلدی دروازہ کھلو.....“

”جی..... میں کھلتی ہوں.....“ ممانی کی آواز میں صاف لغزش تھی۔

”ذرا رہیں.....“  
”پھر شاید وہ واپس چلی تھیں قاسم ماموں نے پلٹ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا، ریحان صاحب نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تھا۔“

”تھوڑی دیر اور گزری، لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا، اب قاسم ماموں نے دوبارہ دستک دے ڈالی اور بلند آواز میں بولے۔“

”کیا ہوا سحر..... کیا دوبارہ سو گئیں.....؟“  
”کوئی جواب نہیں ملا، اتنی دیر میں تیز قدموں کی چاپ ابھری اور پھر ملازم نصیر اور اس کی بیوی کی شکلیں دکھائی دیں۔“

”ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں..... صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے نصیر نے بولکھا ہٹ میں کہا۔“

”صاحب..... آپ.....؟“  
”ہاں..... میں..... کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ وہ اس پر اٹھڑے۔

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”ہماری کیا عیال کوئی اعتراض کریں.....“  
”تو پھر.....؟“

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”جی..... جی..... نہیں..... اعتراض کیوں ہوگا بھلا.....؟“ وہ جلدی سے بولا۔



”کیوں.....؟“  
 ”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”رات کو دوپہائی کھا کر سوئی ہیں۔“  
 ”اوہ.....“ قاسم ماموں نے اسے گھورا۔  
 ”خوب..... دواؤں اکثر سے لی تھی؟“  
 ”جی ہاں.....“ وہ پٹاخ سے بولی۔  
 ”میں بھی ساتھ گئی تھی۔“

”اچھا.....“  
 ”جی ہاں.....“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ لوگ دوسرے کمرے میں آ جائیں۔“  
 ”میں صاحب سے مل لیجے گا۔“  
 ”ہاں..... بالکل.....“ نصیر نے لقمہ دیا۔  
 ”آپ ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔ میں کھانا بھی لگا دیتا ہوں۔“

”اچھا..... تم کھانا لگاؤ.....“ قاسم ماموں بھی موڈ میں تھے، میں ذرا تمہاری میم صاحب کی طبیعت پوچھ کر آتا ہوں۔“  
 ”ان دوڑوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بادل نا خواستہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔“  
 ”ریحان احمد نے معنی خیز نگاہوں سے قاسم ماموں کی طرف دیکھا قاسم ماموں نے اس بار زوردار اندازہ دواڑہ پیٹ ڈالا۔“

”سحر.....“ دروازہ کھولو.....“ وہ ذہاڑے۔  
 ”ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔“  
 ”نورانی دروازہ کھل گیا اور رمانی کی متوش شکل دکھائی دی، مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کا رنگ مزید پیکا پڑ گیا۔“  
 ”قاسم ماموں نے انہیں دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔“  
 ”قصہ مختصر یہ کہ وقار رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس کے سمیت سحر رمانی کو جو ذلت اور خفت اٹھانی پڑی اسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔“

نصیر اور اس کی بیوی بھی ان دونوں کے ساتھ شامل تھے۔ قاسم ماموں نے ان سب کے ساتھ صرف اتنا کیا کہ انہیں اسی وقت گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔  
 اس کے علاوہ اور کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی تھی، قاسم ماموں نے سب کے سامنے رمانی صاحبہ کو طلاق دے دی تھی۔

سحر رمانی کے ساتھ ساتھ وقار کا بھی بہت برا حال تھا ان دوڑوں کی کیفیت ایسی تھی کہ ان کو تو بیدار نہیں ہو سکتے۔ گویا زمین بٹنے اور دوڑوں اس میں ساں جائیں۔ ریحان احمد نے کہا بھی تھا کہ کم از کم وقار کو جیل کی ہوا کھانی چاہیے۔ لیکن قاسم ماموں نے منع کر دیا۔ اور پھر بولے۔

”ان لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں ان سب کو اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں۔“ مزید کوئی اور سزا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ان لوگوں کو اہمیت دے دی۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے انہیں کھن میں سے بال کی طرح نکال پھینکا ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ لوگ بھی مجھے اپنی صورت بھی نہیں دکھائیں گے۔“

چاروں ہارے ہوئے جوار یوں کی طرح سر جھکائے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے اسی وقت میری نظر رجیم بابا پڑی۔  
 وہ ایک کونے میں غمگین انداز میں کھڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

”قاسم ماموں کے بے حد اصرار کے باوجود میں ان کے گھر واپس نہیں گیا تھا، اماں جی کو جب حالات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آ گئیں۔“

”قاسم ماموں اس وقت حویلی میں ہی موجود تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ مجھے اور اماں جی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”لیکن میں پہلے ہی اماں جی کو سمجھا چکا تھا چنانچہ وہ بولیں۔“

”قاسم..... تم ہماری فکر مت کرو۔ تم یہاں

آؤ..... ہم بھی ضرور آئیں گے لیکن اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے۔“

”ہاں.....“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔“ قاسم ماموں بولے۔  
 ”میں ہمیشہ اس بات پر نادم رہوں گا کہ سحر کے پریشان نے آپ لوگوں سے کنارہ کشی کر لی تھی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے قاسم.....“ اماں جی نے

”ہمارے دل بالکل صاف ہیں، بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ وہاں جانے اور پھر وہاں سے نکلنے میں حقیقت کا پتا لگایا خدا نہ کرے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا تو ہمیں کدھ ہوتا۔“ اب تم جلد سے جلد شادی کر لو اور ایک نئی

”شادی.....“ ماموں کے منہ سے نکلا۔  
 ”ہاں.....“ اماں جی سکرائیں۔

”جب سحر اس موٹے سے شادی کا کھیل رچا سکتی تو تم کیوں اپنی زندگی برباد کرو.....؟ تمہیں بھی پورا

”بات تو ٹھیک ہے آپ کی.....“ قاسم ماموں

”لیکن اب عورت ذات سے میرا بھرورہ ہی اٹھ

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ اماں جی نے

”دنیا میں اگر سب ایک جیسے ہو جائیں تو دنیا بھٹک جائے گی یا پھر جنم۔“ ساری عورتیں بھی ایک

”اب تم جاؤ اور جلدی سے اپنے لئے

”اس مدت میں اگر تم نے کوئی لڑکی پسند نہ کی

”اور پھر واقعی قاسم ماموں کسی لڑکی کی تلاش میں

سرگرداں ہو گئے..... اماں جی کی باتوں نے ان پر بھرپور اثر کیا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

”میں کافی دنوں سے سوٹ کر رہا تھا کہ اب اماں جی پر کسی قسم کا کوئی ”دورہ“ نہیں پڑ رہا تھا.....“ وگرنہ ہر دوسرے دن وہ کسی ”جان لیوا“ کا کوئی نہ کوئی پیتھام سناری ہوتی تھیں۔

”اس دوران رجیم بابا کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا.....“ سحر رمانی کے معاملے سے فارغ ہوتے ہی مجھے

”وہی مثالا.....“ جو مجھے جسے کے قرب و جوار میں ملی تھی..... اور پھر اس کا وجود میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا..... اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش اب بھی میرے دل میں جاگ رہی تھی..... اور اب تو اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

”چنانچہ ایک دن میں اپنے دوست یعنی سدو کے پاس جا پہنچا..... میں اس سے پہلے بھی مثالا کے بارے میں بات کر چکا تھا، اس نے ایک بار پھر میری خواہش سنی تو فوراً بول اٹھا۔

”ارے یار..... تم نے دل بھی دیا تو کہاں دیا.....“

”جنگل میں نہیں..... لڑکی کو دیا ہے.....“ میں نے تھج کی۔

”رہتی تو وہ جنگل میں ہے نا.....“

”تو کیا ہوا.....؟“ میں نے کہا۔

”میں اسے اماں جی سے ملاؤں گا، اور پھر شادی کر کے گھر لے آؤں گا.....“ یوں بھی اماں جی جلد سے جلد میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

”ہوں.....“ اس نے سر ہلایا۔

”لیکن اگر انہوں نے اسے دیکھ کر انکار کر دیا.....“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“  
 ”ہاں..... یوں سمجھ لو کہ کوئلے کی کان میں ہیرا ہے..... اور جب اسے نکال کر تراشہ جائے گا تو اس کی چمک دکھ کا کیا عالم ہوگا۔“  
 ”میں سمجھ گیا..... لیکن میرے دوست..... وہ لوگ خانہ بدوش ہیں، بھری گری بھرنا ان کا کام ہے..... اور پھر نہ جانے وہ لوگ کس دماغ کے ہوں..... ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہو۔“  
 ”تم کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ ہمارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“ وہ مجید کی سے بولا۔  
 ”ان کا علاقہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“  
 ”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔  
 ”لیکن پھر میں کیا کروں.....؟ مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے۔ بات کرنی ہے۔“  
 ”ہوں.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔  
 ”ایک ترکیب ہے۔“  
 ”وہ کیا.....؟“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔  
 ”تم صبح سویرے میرے ساتھ چشمے پر چلو..... میری معلومات کے مطابق اس وقت وہاں لڑکیاں پانی بھرنے آتی ہیں..... مجھے امید ہے کہ شالا سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔“  
 ☆.....☆.....☆  
 اور پھر اماں جی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔  
 سدو کو جگانے میں کافی وقت کا سامنا ہوا، لیکن بہر حال یہ معاملہ بھی طے ہوا..... وہ بے چارہ ناشتے کے بغیر ہی میری خاطر گھر سے باہر آ گیا تھا۔  
 ”چلو..... تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے۔“ سدو بولا۔  
 ”لیکن واپسی میں کالے بھائی کی حلوہ پوری سے

ناشتہ کریں گے۔“  
 ”ضرور.....“ میں مسکرایا۔  
 ”ناشتہ میری طرف سے ہوگا۔“  
 ”نہیں.....“ وہ جلدی سے بولا۔  
 ”ناشتہ میں دوں گا کیونکہ کل ہی ٹیوشن کی فیس ملی ہے..... اس کی تم فکر مت کرو۔“  
 ”میں بھی اب لین لارڈ ہوں.....“ میں نے مذاقاً کہا۔  
 ”اماں جی نے مکان کرائے پر سود دیا ہے۔“  
 ”میں جانتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔  
 ”جب کرایہ ملے تو اس دن میری دعوت کرو دینا۔“  
 ”ٹھیک ہے.....! میں نے حامی بھری۔  
 اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں جلدی چشمے کے قریب پہنچ گئے۔ جنگل کے اس حصے میں بھی جنگلی پرندوں کی آواز اور چھبھاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔  
 صبح کا حسین منظر آنکھوں کے سامنے تھا، اور میں نے دور سے ہی ہے تابی کے عالم میں ادھر ادھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔  
 ”یہ آنکھیں..... بڑی بے چینی سے شالا کو ڈھونڈ رہی تھیں..... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس دن کی طرح آج بھی اچانک میرے سامنے آ جائے گی۔“  
 ابھی چشمہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن ہوا کے دوش پر نسوانی قہقہوں اور ہنسی کی آوازیں کانوں سے نکلنے لگیں۔  
 سدو نے متنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔  
 ”دیکھا بیٹا..... میری بات کتنی سچی ہوتی ہے۔ لڑکیاں وہاں پانی بھرنے آ چکی ہیں۔“  
 ”انتا ہوں استاد.....“ میں نے تسلیم کیا۔  
 ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم ان کی ٹوہ میں کیوں رہے ہو.....؟ جبکہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کا چکر چلا رہے ہو۔“

”ارے یار..... یہ بات نہیں ہے.....“ سدو نے  
 ”مجھے تو واقعی اپنی ستارہ کے علاوہ کوئی لڑکی اچھی نہیں۔“ تم مانو یا نہ مانو..... لیکن میری ستارہ کی فکر میں ہے۔“  
 ”اچھا.....؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔  
 ”ہاں..... وہ مسکرایا۔  
 ”لیکن میرے لئے..... ہو سکتا ہے کہ وہ جنہیں محبت دکھائی نہ دے، لیکن میں نے تو محبت کی ہے۔“  
 ”میرا دل اس محبت میں ہوتا ہے..... کسی انسان کو.....“  
 ”غلطی ہو گئے ہو۔“  
 ”یہ بھی محبت کا کمال ہے..... ورنہ میں.....“  
 ”تو یہ کہہ کر..... محبت کی کویتا دیتی ہے اور کسی کو.....“  
 ”تم بات کو ل کر گئے۔“ میں نے یاد دلایا۔  
 ”نہیں..... بات تو خود ہی گھوم گئی۔ بات یہ ہے کہ ان ہی خانہ بدوشوں میں سے کچھ لڑکے اپنے میں آتے ہیں۔“  
 ”کیوں.....؟“  
 ”بھئی وہ بھی کھیلتے ہیں.....“ اس نے بتایا۔  
 ”ان ہی میں سے دیان نامی ایک لڑکے سے.....“  
 ”اگلی اچھی ہائے پہلو ہوگی ہے اس کے ذریعے مجھے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔“  
 ”اوہ..... تو یہ بات ہے.....!“  
 ”ہاں.....“ سدو بولا۔  
 ”وہ ذرا مختلف قسم کا ذہن رکھتا ہے..... عام خانہ بدوشوں سے کافی مختلف ہے۔ وہ اپنی طرز زندگی کو بدلنے کا ہے..... وہ کچھ کرنا چاہتا ہے..... اس کا زیادہ پسند علاقے میں ہی گزرتا ہے۔“  
 ”اچھا..... اس سے مجھے ملوانا۔“  
 ”ضرور.....“ سدو بولا۔  
 ”لو بھئی..... یہاں تو کافی لڑکیاں موجود

ہیں..... تم اپنی والی کو ڈھونڈو۔“  
 میں نے بھی وہیں رک کر ایک درخت کی آڑ سے جھانکا، ذرا ہی فاصلے پر چشمہ موجود تھا، اور کئی لڑکیاں پانیوں میں گھڑے اور مٹکے لئے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔  
 وہ پانی بھرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں خوش گپیوں میں بھی مصروف تھیں۔  
 مجھے ان میں شالا دکھائی نہیں دی، البتہ دوسری لڑکی چندا ضرور موجود تھی، میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔  
 میں نے خالی خالی آنکھوں سے سدو کی طرف دیکھا۔  
 ”کیا ہوا.....؟“  
 ”وہ..... ان میں نہیں ہے.....“ میرے منہ سے نکلا۔  
 ”ہمت تیرے کی.....“ وہ جھل کر بولا۔  
 ”قسمت ہی خراب ہے..... بولو..... اب کیا کرتا ہے.....؟“  
 ”میں کیا بتاؤں.....!“  
 ”تو پھر کس سے پوچھوں.....؟“ اس نے حیرت سے کہا۔  
 ”ان لڑکیوں سے.....؟“  
 ”تم تو بات پکڑ لیتے ہو.....“ میں جھل گیا۔  
 ”ارے میرا یہ مطلب ہے کہ اب میں کیا کروں.....؟ جب وہی نہیں ہے تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔“  
 ”ویسے میرا آئیڈیا اچھا ہے.....“ سدو نے کچھ سوچ کر کہا۔  
 ”کون سا.....؟“ میں چونکا۔  
 ”آؤ..... ان لڑکیوں سے پوچھتے ہیں۔“  
 یہ کہہ کر سدو نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر جمعیت سے ان لڑکیوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔  
 لڑکیوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا..... پانی بھرنے والے ہاتھ رک گئے تھے۔ بھران میں سے ایک

لڑکی نے کرکڑ دار آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم دونوں؟“

”انسان“ ”سردو نے پرسکون انداز میں جواب

دیا۔

”جنگل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں انسانوں کا داخلہ منع ہے۔“

”وہ تو ہم بھی ہیں۔“ لڑکی نے منہ بنایا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو۔۔۔؟“

میں نے فوراً کہا کہ چندا مجھے گھور رہی تھی، ادھر سردو کی زبان کو لگا مہی نہیں لگ رہی تھی۔

”ہم کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔۔۔؟“

”کسے؟“ لڑکی نے اسے گھورا۔

”کیا نام ہے تمہاری اس کا۔۔۔؟“ ”سردو نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”بتا دوں۔۔۔؟“ میں نے الٹا سوال کیا۔

”ہاں بھئی۔۔۔؟“ اس نے سر ہلایا۔

”میڈم پوچھ رہی ہیں۔“

”دیکھو۔۔۔؟“ اسی لڑکی نے سخت لہجے میں کہا۔

”اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے آئے ہو تو کسی خام خیالی میں مت رہنا۔ ہم سب مل کر تم دونوں کی چٹنی بنا دیں گے۔“

”اور میں چٹنی ہرگز نہیں کھا سکتا۔۔۔۔۔“ ”سردو نے سر ہلایا۔

”کیونکہ مجھے چٹنی سے نفرت ہے۔ گھر میں بنتی ہے تو میں گھر سے باہر ہوتا ہوں۔ خیر بات یہ ہے کہ

ہمارا کوئی بھی غلط ارادہ ہرگز نہیں ہے۔ میں تو بہت نیک کام کے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔۔۔۔۔“

”کون سا کام۔۔۔؟“ لڑکی پوچھ بیٹھی۔

”میرے اس دوست کا دل جنگل میں کہیں کھو گیا ہے۔“ ”سردو نے میری طرف اشارہ کیا۔

”میں وہ ڈھونڈنے آیا ہوں۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب ہوا۔۔۔؟“ لڑکی نے اسے گھورا۔

”تم کیا میرا اثر دینے لڑکھے کو دیکھ رہی دینے والی

ہو۔۔۔۔۔؟“ ”سردو جھلا گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، میں بول پڑا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ میں شالا سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

”شالا۔۔۔۔۔؟“ لڑکی حیرت سے بولی۔

”کون شالا۔۔۔۔۔؟“

”وہ جانتی ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔

”ایک دن میں یہاں آیا تھا، تو وہ اس کے ساتھ تھی۔“

”میرے ساتھ لیلیٰ تھی۔۔۔۔۔؟“ چندا خود ہی بول اٹھی۔

”تم وہی ہونا، جو اس دن۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔؟“ میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

”میں بالکل وہی ہوں۔۔۔۔۔ اور تم چندا ہونا۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔؟“ چندا نے مجھے غور سے دیکھا۔

”تمہیں میرا نام بھی یاد ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”کیونکہ شالا نے تمہیں اسی نام سے پکارا تھا۔“

”لیکن میں تو اس دن لیلیٰ کے ساتھ تھی۔“ چندا نے جواب دیا۔

”اور تب ہی میں کسی شالا سے واقف ہوں۔۔۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔۔۔؟“ لیلیٰ گون ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ رہی۔۔۔۔۔؟“ اس نے فوراً ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، یہ ایک موٹی سی کالی رنگت والی

لڑکی تھی، جو کسی بھی صورت میں شالا نہیں ہو سکتی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ لیلیٰ نہیں بلکہ شالا تھی۔“

”لیکن اس نام کی کوئی لڑکی ہماری بستی میں نہیں

ہے۔“ اس لڑکی نے دخل دیا، جو پہلے سردو سے مخاطب تھی۔

”تمہیں ضرور کوئی دھوکا ہوا ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔

ان دونوں کے لہجوں میں جو چالنی تھی اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔۔۔۔۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ

بھوت نہیں بول رہیں۔

تو پھر۔۔۔۔۔؟ کیا میں نے وہ خواب دیکھا تھا۔۔۔۔۔؟

لیکن جاگتے میں خواب کون دیکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں سوچ

میں ڈوب گیا۔

سردو نے مجھے ٹھوکا دے کر چو لکا دیا تھا۔

”اب کیا کریں۔۔۔۔۔؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”یہ تو معاملہ ہی الٹا دکھائی دے رہا ہے۔“

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور چندا سے مخاطب ہو گیا۔

”تمہیں یاد تو ہے نا کہ میری تم سے ملاقات ہو چکی ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہاں بابو۔۔۔۔۔؟“ وہ قدرے شرماتے ہوئے

”تم ملے ہی اس طرح تھے کہ بھلائے نہیں

یہ سن کر لیلیٰ نامی لڑکی نے اپنا دوپٹہ منہ پر ڈال لیا،

بٹائی وہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی تھی۔

میری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ چندا کے بیان

کے مطابق اس کے ساتھ اس دن یہ لڑکی تھی۔ جبکہ

میں نے لیلیٰ کے بجائے شالا کو دیکھا تھا۔

چند ا نے تو باقاعدہ شالا کو نام لے کر مخاطب کیا تھا،

بہاوت یاد آتے ہی میں چونک اٹھا اور بولا۔

”لیکن چندا۔۔۔۔۔؟ تم نے تو اسے شالا کہہ

کر پکارا تھا۔۔۔۔۔؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

چند ا ہنسی اور بولی۔ ”میں نے کوئی نشہ کیا ہوگا، میں

بھری ہوئی گھڑی بیتی ہوں۔“

ساری لڑکیاں ہنس پڑیں، سردو سے رہنا گیا۔

”ارے۔۔۔۔۔؟ تم لوگ کیوں میرے دوست کا مذاق

اڑا رہی ہو۔۔۔۔۔؟ یہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔“

”تمہارا دوست بات ہی ایسی کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”چند ا بولی۔

”ہم کیا کریں۔۔۔۔۔؟ ایسی کوئی لڑکی ہماری بستی

میں ہرگز نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنا منکا بھرنے میں مصروف

ہو گئی، دوسری لڑکیوں نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔

سردو نے مجھے کندھے سے پکڑا اور دوسری طرف

گھوم گیا۔ چندا دم چلنے کے بعد اس نے کہا۔

”کیوں مذاق کا نشانہ بن رہے ہو۔۔۔۔۔؟ اور وہ بھی

ان جاہل جھپٹ لڑکیوں سے۔۔۔۔۔؟“

”ارے یا سردو۔۔۔۔۔؟ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔؟ میں

شالا سے ملا ہوں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ حسین

ذہیل چہرہ اور اس کا سراپا دیکھا ہے۔“

”میں مانتا ہوں۔۔۔۔۔؟ لیکن بستی کی یہ لڑکیاں

تو صاف منحہ کر رہی ہیں۔“

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”تمہیں۔۔۔۔۔؟“ ”سردو کچھ سوچ کر بولا۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”ابھی تم یہاں سے چلو۔۔۔۔۔؟“ ”سردو نے مجھے

سمجھایا۔

”میں آج شام میں تمہیں دیان سے

ملوا دیتا ہوں۔۔۔۔۔؟ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری کوئی مدد کر سکے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔؟“ ”میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں۔۔۔۔۔؟“ ”سردو نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ اسے شالا نامی لڑکی کا علم ہو۔۔۔۔۔؟

اور۔۔۔۔۔؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکیاں ہمیں بے وقوف

بنادیں ہوں۔“

میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا، بولا کچھ نہیں۔

☆ ☆ ☆

وعدے کے مطابق سردو نے کالے کی لذیذ طلوہ

پوری سے میری ”تواضع“ کی تھی، لیکن میں زیادہ نہ

کھا سکا۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے مجھے شدید الجھن میں



ڈال دیا تھا۔

سرد نے میری کیفیت بھانپ لی تھی، چنانچہ وہ بول اٹھا۔

”ارے میری جان..... کیوں فکر کرتے ہو.....؟ میں تمہیں تمہاری مثال سے ملوا کر ہی دم لوں گا..... تم پریشان نہ ہو.....!“

”یار میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“  
”تم حلوہ پوری کھاؤ..... ابھی سے اسنے پریشان ہو جاؤ گے تو آگے کیا کرو گے۔ عشق کی منزل تو بہت دشمن ہوتی ہے..... یہ رکاوٹیں اور الجھنیں تو محبت کی مصراع ہیں۔ اگر یہ آسانی سے حاصل ہو جائے تو کیا خاک مزہ.....؟“

”تم پھر فلسفہ بھارنے لگے.....“ میں نے اسے گھورا۔  
”یہ فلسفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے.....“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”میں ایک آوارہ اور ادبش انسان تھا، لیکن جب مجھے محبت ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو یکسر بدل ڈالا میں اب بھی اپنے دوستوں سے ملتا ہوں، لیکن کسی غلط ایکٹیوٹی میں ہرگز نہیں ہوں..... اب میں یہ برائی سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں..... تو کیا یہ سب اتنا آسان ہے..... ہرگز نہیں..... کیونکہ خود کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں..... یہ تو ہے.....“ میں نے غٹھڑی سانس بھری۔

”بس..... تو پھر خود کو مضبوط کرو..... اور اس مشکل راستے پر چلنے کے لئے کمر باندھ لو..... کیا تمہیں اس لڑکی سے واقعی محبت ہوئی ہے.....؟“

”ہاں..... کاش تم نے بھی مثالا کو دیکھا ہوتا.....“  
”دیکھ لوں گا.....“ اس نے سر ہلایا۔

”ضرور دیکھوں گا..... ابھی تو تم پیٹ بھر کر ناشہ کرو..... چلو.....“

☆.....☆.....☆

گھر میں داخل ہوا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی، اماں جی کافی پریشان دکھائی دیں۔  
”کیا ہوا اماں جی.....؟“ مجھ سے رہانہ گیا۔

”کیا بات ہے.....؟“  
”کرائے دار جا رہے ہیں.....؟“ انہوں نے بتایا۔

”جا رہے ہیں.....؟ کہاں.....؟“ میں نے پوچھا۔  
”گھر خالی کر کے جا رہے ہیں.....“ اماں جی بولیں۔

”فرامت علی آئے تھے، اور مجھے پیغام سنائے ہیں کہ وہ اسی مہینے میں مکان خالی کر دیں گے کیونکہ یہاں رہنا ان کے بس کی بات نہیں ہے..... انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بیٹیوں والے ہیں..... خدا نہ کرے کوئی مسئلہ ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا۔“  
”خبر ہوا کیا ہے ماں جی.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایسا کیوں بول رہے ہیں.....؟“  
کرائے دار کا نام فرامت علی تھا، اور میں سرسری طور پر ہی ان سے ملا تھا..... مجھے یہ تو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ اور کتنے افراد ہیں۔  
اماں جی نے ایک محلے کی عورت کے توسط سے خود ہی سارے معاملات نٹائے تھے۔

میں نے پوچھا تھا۔ ماں جی نے کہا۔ ”لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا..... بس یہ کہہ گئے کہ ان باتوں کو رہنے دیں..... ہمیں ہر صورت میں یہ مکان خالی کرنا ہے۔“

”کمال ہے.....“ میں بڑبڑایا۔  
”ایسی کون سی بات ہے جو وہ بتانا نہیں چاہتے کیا آپ ان کے گھر گئی تھیں.....؟“  
”نہیں.....“

”آپ کو وہاں جانا چاہئے.....“ میں نے کہا۔  
”گھر میں اور لوگ بھی ہوں گے..... آپ ان

سے معلوم کریں کہ وہ لوگ کیوں یہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں.....؟“

”بات یہ ہے کہ میں ابھی تک ان کے یہاں نہیں گئی ہوں.....“ اماں جی بولیں۔  
”اور اب جاؤں گی تو وہ لوگ سوچیں گے کہ میں مطلب سے آئی ہوں۔“

”تو کیا ہوا..... بات تو واضح ہو جائے گی.....“ میں نے جواب دیا۔  
”نہیں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی، البتہ مجھے اس سلسلے میں روجی سے بات کرنی پڑے گی۔“  
”یہ روجی کون ہے.....؟“  
”جس نے انہیں ہمارا گھر دلوا دیا تھا.....“ وہ بولیں۔

”میں اس کے گھر جاؤں گی اور پھر وہی ان لوگوں سے اگوائے گی۔“  
”یہ بھی ٹھیک ہے.....“ میں نے سر ہلایا۔  
”آپ ان سے بھی مل لیں.....“

”ہاں..... ذرا کھانا بنالوں..... پھر جاتی ہوں.....“

یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں..... میرا ذہن ایک بار پھر مثالا کی طرف چلا گیا..... چند ہی لمحوں کی وہ ملاقات میرے لئے گویا سوہان روح بن گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ساتھ جو لڑکی دکھائی دی تھی..... وہ خود اس بات سے انکاری تھی کہ وہ مثالا نامی کسی لڑکی سے واقف نہیں ہے۔

حد تو یہ تھی کہ کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا..... مجھ کو خود چندا اس سے باتیں کر رہی تھی..... آخر یہ کیا تھا..... اگر چندا کسی مثالا کو نہیں جانتی تھی تو پھر اس نے مثالا کا نام کیوں پکارا تھا.....؟

میں اس معاملے میں جتنا سوچ رہا تھا..... اتنا ہی الجھا جا رہا تھا..... آخر کار میں نے گھبرا کر اپنے سر کو جھٹک لیا..... فی الحال اس بارے میں سوچنا فضول تھا..... دیانہ ملنے کے بعد ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکلنے کی امید تھی..... اسی سلسلے میں مجھے اب سدا کا انتظار کرنا تھا۔

کیونکہ وہی میری ملاقات دیانہ سے کروانا۔  
دو پہر کے کھانے کے بعد اماں جی روجی کے پاس چلی گئی تھیں..... میں اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔

میں نے وقت گزاری کے لئے ایک موٹا سا ناول اپنی شیلٹ سے نکال لیا کتابیں پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا، اور اس شوق کو اسکول والوں نے بیدار کیا تھا..... اسکول کی لائبریری سے ہمیں ہر طرح کی کتابیں پڑھنے اور گھر لے جانے کی اجازت تھی..... لیکن گھر لے جا کر پڑھنے کی صورت میں اس کتاب کی انٹری کروانی پڑتی تھی..... بہر حال میں اپنے ساتھ ہی کتابیں لے کر آ جایا کرتا تھا۔

یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا..... اب میں اکثر اچھے اور معیاری ناؤ ذخیرہ لیتا تھا..... میں نے کتاب کھولی اور کہانی میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے قریب آ کر کھڑا ہو۔

میں نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور دروازے کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے اسے اٹھا دیا، ہم خیال کیا اور دوبارہ کتاب پر میری توجہ مرکوز ہو گئی..... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تسلسل پھر نوٹ گیا۔

اس بار کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

مجھے یاد تھا کہ اماں جی کے جانے کے فوراً بعد ہی میں نے بیرونی دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا، پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کر اس کمرے تک پہنچ سکے۔

لیکن اس دستک کی آواز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں صدر دروازہ کھلا نہ رہ گیا ہو..... ممکن تھا کہ میں بیرونی میں ایسا کر بیٹھا ہوں۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ پھر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اس بار میں اٹھ کھڑا ہوا کتاب میں نے

بستر پر کھدی تھی۔

”کون ہے؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔  
کوئی جواب نہیں ملا، البتہ پھر سے دستک دی تھی  
تھی، اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا، میں نے بلند آواز  
میں کہا۔

”کون ہو؟ منہ سے تو بولو۔“  
”تم ڈرو گے تو نہیں؟“ ایک انجانا بھرائی  
ہوئی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

نہ جانے کیوں میرے روٹنے کھڑے  
ہو گئے۔ اس بھاری سی آواز میں ایسا ہی کچھ اڑتا تھا۔  
میں نے اپنی ہمت جمع کی اور کہا۔  
”نہیں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ آواز آئی۔  
”مجھے یقین ہے کہ تم ڈر جاؤ گے۔“

”مجھے چھوڑو۔ تم اپنا نام بتاؤ۔“ میں نے اپنے  
آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”میں وہی ہوں۔“ کہا گیا۔

”جو برس باہر سے تمہارے باپ دادا سے  
جنگ لڑتا ہوا آ رہا ہے۔ میں وہی ہوں۔ جس نے  
تمہارے ان آباؤ اجداد کو شکست دی اور انہیں اپنے انجام  
سے دوچار کیا۔ میں۔ میں جان لیوا ہوں۔“

”جان۔ لیوا۔؟“ میرے منہ سے نکلا۔  
پھر میں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میرے  
سامنے وہی کالے لمبا دے والا ہیولا موجود تھا، جو مجھے جنگل  
میں دکھائی دیتا تھا۔

اب بھی اس کے چہرے پر چادر پھیلی ہوئی تھی  
اور میں اس کی شکل دیکھنے سے محروم تھا۔  
اچانک ہی کالے لمبا دے سے دو ہاتھ برآمد  
ہوئے اور انہوں نے میری گردن کو اپنی گرفت میں لے  
لیا۔

خوف کے مارے میرے حلق سے ایک  
زوردار چیخ بلند ہوئی۔  
”کیا ہوا۔؟ کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔

کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ انہوں نے میرے  
جسم کو چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ  
میں نیند سے جاگا ہوں۔ اور اس نیند کے ٹوٹنے کی وجہ  
بھی امان جی تھیں جو مجھ پر چمکی ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا میرے بچے؟“ تم میری بری طرح  
چلا رہے تھے۔ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟  
کوئی ڈراؤنا خواب؟“

”خواب۔؟“ میں بڑبڑایا۔  
پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا، میں اس وقت بستر  
پر تھا۔

”خواب ہی دیکھا ہوگا۔“ امان جی میرے  
قریب بیٹھ گئیں۔

”اچھا ہوا کہ میں واپس آ گئی اور تمہیں نیند سے  
جگا دیا۔“

میں نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”جی امان۔ شاید میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔“  
”تم دوپہر میں تو سوئے نہیں ہو، پھر آج کیسے  
بستر پر لیٹ گئے۔ اور آج تو دروازہ بھی کھلا پڑا تھا۔“

”ہمارے گھر میں آتا تو کیا ہوتا۔؟“  
”ہمارے گھر میں آنے کے بعد وہ بے چارہ بھی  
پریشان ہی ہو جاتا۔“ میں طنز پر انداز میں مسکرایا۔

”جیسے ہمارے کرائے دار مکان چھوڑ کر جا رہے  
ہیں۔“

”تو کیا ہمارا گھر آ سیب زدہ ہے۔؟“ امان جی  
نے مجھے گھورا۔

”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔؟“  
”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ امان جی۔“

”میں نے طویل سانس لی۔“  
”خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس عورت نے کیا  
کہا۔؟“

”وہ آج ان لوگوں کے پاس جائے گی اور پھر کل  
مجھے بتا دے گی۔“ انہوں نے کہا۔  
پھر انہوں نے غور سے مجھے دیکھا اور بولیں۔ ”تم

لے گھر کو برا کیوں کہہ رہے ہو۔؟“

”امان جی۔ یہاں اس کا راج ہے۔۔۔۔۔  
جو خود کو جان لیوا کہتا ہے۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔  
”جان لیوا۔؟“ انہوں نے حیرت سے مجھے  
دیکھا۔

”یہ کون ہے بھلا۔؟“  
”یہ وہی ہے جس کی کہانیاں آپ نے بھی مجھے  
سنائی تھیں۔ اس خاندان کے لوگوں کو صفحہ ہستی سے  
مٹانے والا خود کو جان لیوا کہتا ہے۔ اور اب وہ میری  
ہاک میں ہے۔“

یہ سن کر امان جی خوف زدہ ہو گئیں۔ انہوں نے  
مجھے اپنے سینے سے چٹالیا اور وہی آواز میں بولیں۔  
”یہ تو کیا کہہ رہا ہے میرے بچے۔ خدا کے  
لئے ایسی باتیں مت کر۔“

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میری  
آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ اب مجھے انہوں  
پر ہاتھ رکھنے میں نے اپنی زبان کیوں کھولی۔ بقول رحیم  
”اے، وہ نادیدہ ہستی بعض اوقات امان جی پر مسلط  
ہو جاتی تھی۔ لیکن درحقیقت تو وہ میری ماں تھی۔ مجھ  
پر محبت کرنے والی۔ مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے  
والی مہربان ہستی۔ اسے ہرگز علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا  
لڑ رہی ہیں اور کیا کہہ رہی ہیں۔“

اس لئے بہتر تو یہ تھا کہ میں ان معاملات کو امان  
جی سے چھپانے کی کوشش کروں۔

بہر حال آج اس خواب نے مجھ پر ظاہر کر دیا تھا  
کہ میرے باپ دادا کا دشمن اب میری تاک میں ہے۔

ان۔۔۔۔۔  
وہ مجھ سے کھیل کیوں رہا ہے۔ اگر وہ اب مجھے  
گرتا چاہتا ہے تو اس کے لئے کیا مسئلہ ہے۔ وہ  
ان کی آن میں میرا صفایا کر سکتا ہے۔ پھر وہ اس  
آنکھ کو کھول کیوں دے رہا ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور امان جی کو اپنے  
سے لگا کر بولا۔

”ماں جی۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ سب ٹھیک  
ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆ ☆ ☆  
شام کے وقت دیان سے ملاقات ہو گئی، قد کاٹھ  
میں لمبا چوڑا اور جسکے نقوش والا یہ لڑکا شکل و صورت سے  
کافی بڑا اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے کافی  
لہک کر ملتا تھا۔

تینوں جائے کے ہوٹل میں جا پہنچے، ایک میز کے  
گرد گھیر ڈالنے کے بعد سرد نے فوراً ہی دودھ پتی چائے  
کا آرڈر دے ڈالا، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔  
”ہاں بھی ٹھیک صاحب۔ اب تم دیان سے  
اپنا مدعا بیان کرو۔“  
”کوئی خاص بات ہے۔؟“ دیان نے میری  
طرف دیکھا۔

اس کا انداز اپنا نیت بھرا تھا۔  
”میرے لئے تو بہت ہی خاص ہے۔“ میں  
نے ایک طویل سانس لی۔  
”کیونکہ زندگی میں پہلی بار یہ موقع مجھے ملا ہے۔“  
”دیکھ کر بتاؤ دوست۔“ دیان نے سر ہلایا۔  
”اگر میرے لائق کوئی کام ہوا تو میں  
ضرور کروں گا۔“  
”میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق تمہاری  
بستی سے ہے۔“  
”کوہ۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ تو پھر بتاؤ۔“  
اتنی دیر میں چائے آ گئی۔ میں نے کپ اٹھا کر  
ایک بھر پور چٹکی لی اور بولا۔  
”تمہاری بستی میں شالا نامی ایک لڑکی ہے۔  
میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”شالا۔؟“ دیان نے آہستہ سے دہرایا۔  
پھر یوں لگا جیسے وہ اپنے ذہن پر زور دے رہا  
ہو۔۔۔۔۔ تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے نفی میں  
سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
”نہیں۔۔۔۔۔ میرے علم میں تو ہرگز اس نام کی کوئی

لڑکی نہیں ہے۔“

”اچھا“ میرے منہ سے نکلا۔

مجھے چندا کی بات یاد آگئی۔ اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔

”ہاں“ وہ دیر سے مسکرایا۔

”اور اگر میرے علم میں نہیں ہے تو پھر یہ لڑکی وہاں ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ میں بستی میں ہرول عزیز شخصیت رکھتا ہوں۔ خاص طور پر لڑکیاں تو مجھ پر جان چھاور کئے رکھتی ہیں۔ سب ہی مجھ سے واقف ہیں اور میں خود بھی سب کو جانتا ہوں۔ لیکن یہ نام میرے لئے اچھی ہے۔“

”مجھے حیرت ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ میں اس لڑکی سے مل چکا ہوں۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”اور اسے اپنا دل دے بیٹھا ہوں۔“

”اوہ۔ تو یہ بات ہے۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”ہاں بھائی۔“ سدو نے دل دیا۔

”یہ مسئلہ تو حاتم طائی کے سوال کی طرح ہے یعنی ایک بار دیکھا ہے۔ اور بار بار دیکھنے کی چاہت میں خون خشک ہوا جا رہا ہے۔“

میں نے سدو کو گھور کر دیکھا تو فوراً ہی اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کر دی اور عاجز انداز میں بولا۔

”ارے میرے یار۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

پہلی نظر کی ہونے والی محبت کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جانے گا۔ میں تو خود ہی اس مرض میں مبتلا ہوں۔“

”خیر۔“ دیان بولا۔

”میں دیکھتا ہوں۔ ویسے میری معلومات کے مطابق اس نام کی کوئی لڑکی بستی میں موجود نہیں ہے۔“

”لیکن میں اس سے مل چکا ہوں۔ اور اس وقت چندا اس کے ساتھ تھی۔“ میں نے بتایا۔

چندا کے نام پر وہ چونک اٹھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ وہ تو بہت نٹ کھٹ لڑکی ہے۔۔۔۔۔ اس

نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کا کچھ اور نام ہوگا۔ اور اس وقت چندا نے تم سے غلط بیانی کی ہوگی۔“

”لیکن اس نے تو باقاعدہ نام سے پکارا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اعتراض کیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”مگر یہ بات ہے تو اس کا بھی حل موجود ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور اسے ہونٹوں سے لگا کر ایک چمکی بھرنے کے بعد بولا۔

”میں تمہیں بستی میں لے چلوں گا۔ تم خود اسے ڈھونڈ لیتا۔ کیا خیال ہے؟“

اندھا کیا چاہے۔۔۔۔۔ دو آکھیں۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

اسی وقت سدو بول اٹھا۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھیک کو کوئی پریشانی ہو۔ وہاں نہ جانے کیا ہو۔ وہ بستی تو اس کے لئے بالکل نئی جگہ ہوگی۔“

”کوئی ہال بھی بیک نہیں کر سکتا۔“ دیان نے کہا۔

”کیونکہ میں بستی کے سردار کا بھانجا ہوں۔ وہ میرے ماموں ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”میں بھی ساتھ چل سکتا ہوں۔“ سدو نے پوچھا۔

”نی الحال میں ٹھیک کو ساتھ لے جاؤں گا۔“ دیان نے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اکیلے میں ٹھیک ذرا توجہ سے اپنا کام کر سکتا ہے۔ اگر تم چلنا چاہو تو بعد میں کسی وقت ساتھ چل سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے حامی بھری۔

”میں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔“

☆ ☆ ☆

واپسی میں سدو کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس بات کو دیان نے بھی محسوس کر لیا تھا چنانچہ اس نے کہا۔

”کیا تم بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ سدو فوراً بولا۔

”لیکن تم دونوں نے ہی مجھے کاٹ دیا ہے۔۔۔۔۔ اب میں کیا کروں؟“

”اسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دیان بولا۔

”دراصل وہاں غیر کا جانا ممنوع ہے۔ بستی کے لوگوں کے علاوہ کوئی اور وہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں بستی والے فوراً ہی پوچھ گچھ اور پھر مار کٹائی کا شکار آتے ہیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ تو پھر تم ٹھیک کو کیسے لے کر جاؤ گے۔“

”میں ایک بندے کا معاملہ سنبھال سکتا ہوں۔“

دیان بولا۔

”ٹھیک کو وہاں لے جانا اور پھر خیریت کے ساتھ وہاں سے واپس لے کر تا میرا کام ہے۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ وہاں ٹھیک کو لے جانے سے پہلے میں ساری بات سمجھا دوں گا۔ اور تم بالکل غرمت کرنا۔ جیسے یہ تمہارا

گہری دوست ہے، بالکل اسی طرح یہ اب مجھے بھی اتنا ہی عزیز ہے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ یہ میرا

بندہ ہے۔“

یہ سن کر سدو نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ ورنہ میں اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ یہ اکیلا

ہال جائے۔“

”بے فکر رہو۔“ دیان نے اسے تسلی دی۔

پھر وہ میری طرف گھوما اور بولا۔

”تم مجھے اپنا گھر دکھاؤ۔ کل صبح نوبے میں

میری محبت کا شاخسانہ ابھی اہل جی سے قطعی پوشیدہ تھا چنانچہ مجھے کالج کا کہانہ کر کے صبح سویرے نکلتا ہوا۔

دیان وقت اور سدو کے کا پابند ثابت ہوا، ٹھیک نوبے وہ گئی کے کو نے پر میرا انتظار تھا۔

عادت کے مطابق وہ مجھ سے گلے ملا اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں صاحب۔۔۔۔۔ مثالا نامی کوئی لڑکی ہماری بستی میں موجود نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”کمال ہے۔۔۔۔۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ دیان نے سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ چندا نے اس لڑکی کا غلط نام لیا ہوگا۔“

”لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔؟“ میں نے کہا۔

”وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی کچھ ہی دیر کی تھی۔ چندا کو کیا پتا کہ مثالا میرے دل میں بس جائے گی۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ دیان نے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم ساتھ تو چلو۔ کچھ نہ کچھ تو سامنے آ جائے گا۔۔۔۔۔ ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ مثالا کے نقش و نگار کیسے تھے۔“

”بہت حسین۔۔۔۔۔ بہت خوب صورت تھی وہ۔۔۔۔۔ میں نے جواب دیا۔“

”لہذا قد۔۔۔۔۔ چاند جیسی رنگت۔۔۔۔۔ لمبے اور قدرے سنہرے بال۔۔۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس کے داہنے گال پر سرخ رنگ کا تل بھی تھا۔“

یہ حلیہ سن کر نہ جانے کیوں دیان بے ساختہ مسکرایا میں اس مسکراہٹ کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

”یہ تو تم۔“ دیان بولتے بولتے رک گیا۔

”ہاں کہو۔“ میں نے ٹوکا۔

”کیا کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔“ دیان بولا۔





آنکھوں دیکھی، ایسی مافوق الفطرت سچی کہانی سناؤں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے اور آپ جب یہ کہانی اپنے بڑے والوں کے لئے لکھیں گے تو وہ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔

میں نے اس سفیدی والے سے کہا تھا۔ ”تم کسی اتوار کے روز میرے گھر آ کر مجھے اپنی آپ بیتی سنانا۔“ اس نے حامی بھر لی اور پھر وہ ایک اتوار صبح کے وقت میرے گھر آیا تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے اپنی کہانی یوں بیان کی کہ۔

میرا نام تیز الدین ہے لیکن یہ بگڑ کر بچا پڑ گیا ہے، ہم جدی پشتی سفیدی کرنے والے پیشے سے وابستہ ہیں۔ میرے مرحوم باپ کا نام شہرانی تھا وہ اپنے زمانے کا بڑا مشہور چونا مسٹر یعنی سفید کرنے والا تھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر سفیدی کیا کرتا تھا بعض دفعہ اس کے بہت سے گاہک اپنے گھروں، کوشیوں میں سفیدی، چونا کے ساتھ رنگ وغیرہ اکٹھا کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے میرے باپ نے ایک ہندو رنگ ساز جس کا نام تلواری رام تھا، کو اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا یہ نوجوان اپنے کام میں بڑا دیکھا اور تیز کام کرنے والا مشہور تھا۔ خاص طور پر اس کی یہ بات بڑی قابل تعریف تھی کہ اس کے ہاتھ کے کسے گئے رنگ میں صفائی کے علاوہ چمک بہت اچھی ہوتی تھی یہ مختلف رنگوں میں صفائی کے تال میل سے ایسے ایسے ڈیزائن بنایا کرتا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار اس کی تعریف ضرور کیا کرتے تھے۔

میرے باپ نے شاہ جہاں پور کی ایک مارکیٹ میں چھوٹی سی دکان ٹھولی ہوئی تھی جس کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں قلعی کرنے والے، رنگ ساز اور لیا پوتی کرنے والے کی سہولت موجود ہے۔ ماشاء اللہ دکان اچھی چلا کرتی تھی میرے باپ نے مجھے تلواری رام کے ساتھ رنگ وروغن کا کام سیکھنے اور اس کی مدد کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، میری عمر اس وقت بہ مشکل سولہ سال ہوئی۔ اس زمانے میں سفیدی کرنے والے مزدور

کوڑھائی روپے روز ملا کرتے تھے۔

ایک دن ہماری دکان میں ایک لڑکا، ہانپتا بوڑھا شخص پرانی سی سائیکل پر آیا اور اس نے ابا کے بارے میں پوچھا، میں نے اسے بتایا کہ وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں آتے ہی ہوں گے..... اس نے کہا چلو میں تھوڑی دیر انتظار کر لیتا ہوں۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا۔ ”بیٹا، میری مالکن نے اپنے گھر کی سفیدی اور گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں کو پینٹ کروانا ہے۔ تم ذرا ہمارے ساتھ چل کر کام دیکھ لو کہ چونا اور رنگ پر کتنا خرچ آئے گا اور کام میں کتنے دن لگیں گے؟“

ابھی وہ مجھ سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ اس دوران ابا نماز پڑھ کر آ گئے۔ اس بوڑھے کو وہ اتفاق سے جانتے بھی تھے علیک سلیک کے بعد انہوں نے اس بوڑھے سے کہا۔

”تمہاری مالکن بہت عرصہ بعد اپنے مکان میں سفیدی اور پینٹ کروا رہی ہیں، خیریت تو ہے؟“ اس پر اس بوڑھے نے بتایا کہ ”بہن سہیلی سے مالکن کی بڑی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آ رہی ہیں، گھر کی حالت بہت خراب ہے، اس کے دروازے بہت میلے اور پیاسے ہیں۔“

ابا نے مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اس بوڑھے کو کہا۔ ”تم اپنی سائیکل پر گھر پہنچو، ہم پیچھے آتے ہیں۔“ ہم جب تانکے پر بیٹھ کر اپنی منزل پر پہنچے تو لمبائی میں تین منزلہ اونچا ایک حویلی نما مکان ہمارے سامنے تھا جبکہ دروازے پر لٹائی بے رونق، بے رنگ تھے۔ جگہ جگہ سے پلستر چھڑا ہوا تھا۔ بہر حال جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب سی نحوست، سلین اور پراسراریت کا ماحول پایا۔ چچی منزل جہاں سے ڈیوڑھی شروع ہوتی تھی وہ بالکل ویران، آدم بیزار خالی تھی۔ اسے پار کیا تو ہمارے سامنے اوپری منزل کی جانب جانی سیڑھیوں کا طویل سلسلہ تھا، ہم اس پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے دوسری منزل کے پہلے کمرے تک پہنچے تو وہ خالی تھا۔

”گلتا ہے کہ یہاں لوگ نہیں رہتے؟“ ابا نے اس بوڑھے سے خود ہی سوال کیا۔

”ہاں اب اس گھر کی مکانیت صرف دو افراد مالکن اور مجھ پر مشتمل ہے۔“

”تو کوئی کرایہ دار کیوں نہیں رکھ لیتے؟“

”وہ جی کئی دفعہ اسے کرایہ پر چڑھانے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں کوئی اس مکان میں کوئی کرایہ دار نہیں آنے کو تیار نہیں ہوتی، میرا خیال ہے کہ اس مکان کی ہوا نکل گئی ہے۔“ اس بوڑھے نے بڑا چونکا دینے والا جواب دیا تھا۔

”یہ بری ہوا سے تمہارا کیا مراد ہے؟“ ابا نے اس سے حیرانگی سے پوچھا تھا لیکن وہ چپ رہا تھا۔ پھر ایک کمرہ آیا تھا، وہ بھی خالی تھا۔

جب ہم تیسرے بڑے کمرے میں پہنچے تھے تو وہاں خاصا اندھیرا تھا اور کونے میں لگی چار پانی پرایک اچھی خاصی عمر کی بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی ہم نے اسے بغور دیکھا یقیناً اس کی عمر اس وقت 90 برس کے لپیٹ میں ہوئی۔ برف جیسے سفید بال اور اس پر جھریوں زدہ چہرے پر پلکیں بھی اچلی روئی کی مانند تھیں۔

”مالکن، یہ سفیدی کرنے والے شہرانی ماسٹر آ گئے ہیں۔“ اس بوڑھے نے معمول کے لہجے سے ہٹ کر کہا۔

”اچھا منوں بابا، ذرا باورچی خانے سے موم بتی لے آؤ، وہ لائن چلی گئی ہے پھر ان سے بات کرنی ہوں۔“ اس بوڑھی عورت نے آہستگی سے کہا۔ (لائن درحقیقت ہندوستان میں بجلی کو کہتے ہیں)

وہ بوڑھا موم بتی لے آیا، اسے جلایا تو اس کی روشنی میں اور بھی پراسرار لگنے لگی تھی۔ جب میں دروازے پر اس کا سایہ دیکھا تو بچی بات ہے، مجھے خوف آئے لگا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد بجلی آ گئی تھی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

میں اور ابا سارے گھر کے کام اخراجات اور کام کی مدت تکمیل کا حساب لگانا چاہتے تھے۔

”آپ نے گھر کی حالت تو دیکھ لی ہے۔ کتنی گندی ہے۔ برسوں ہو گئے ہیں اس کی چھت، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں کو چونا اور رنگ وروغن کو دیکھتے ہوئے۔“

”ہاں بیگم صاحبہ انظر آ رہا ہے۔ لیکن میں نے گھر کی حالت سرسری دیکھ لی ہے۔ یہ بابا جی مجھے اوپر نیچے سے صحیح معنوں میں آپ کو بتلا سکوں..... کہ اس کی سفیدی اور پینٹ میں کتنا عرصہ لگے گا اور سربے بات مزدوری کی تو وہ آپ جو چاہیں گی، لے لوں گا۔“

”نہیں بھائی! ہم کسی کا حق نہیں مارتے۔“ اس بڑھیا نے فوراً ہی ابا کی بات کا ٹیٹھی۔

”تم اس کی پرواہ نہ کرو ہم تمہیں تمہارا پورا حق دیں گے۔“

ابا نے مجھے کہا۔ ”بیٹا تم بیگم صاحبہ کے پاس ٹھہرو، میں ذرا کام دیکھتا ہوں۔“ حالانکہ میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا لیکن کیونکہ یہ ابا کا حکم تھا ہذا میں نے اس کی تعمیل کی تھی درحقیقت میرے ابا بہت سخت مزاج کے تھے وہ ہمیں جو حکم دیتے تھے اس کی تعمیل ہمارے لئے اولین فریضہ ہوتی تھی۔

میں اس بڑھیا کے پاس بیٹھا رہا تھا اور میں نے اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہونے کے ساتھ اتنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی قوت گویائی اور ساعت اچھی حالت میں تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ابا اس بوڑھے کے ساتھ کام دیکھ کر آ گئے تو انہوں نے اس بوڑھی عورت کو کہا۔

”بیگم صاحبہ! گھر کے دروازے کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے ان کی سفیدی اور پینٹ کے کام میں کم از کم مہینہ بھر لگے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ پہلے دیواروں وغیرہ پر جو جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا ہے، اسے ٹھیک کر والیں اس سے سفیدی اور پینٹ اچھا ہوگا۔ ویسے

آپ کی مرضی، جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گا۔۔۔۔۔ اور ہاں، یہ منوں بھائی کی ٹانگیں چلتے ہوئے لرزتی ہیں، کون پلستر وغیرہ کے لئے مستری مزدور لائے گا کون ان سے کام لے گا۔۔۔؟ آپ ایسا کریں مجھے مستری کی دیہاڑی علیحدہ دے دیں، میں اپنی نگرانی میں آپ کا یہ کام کروا دوں گا۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہو تو۔۔۔؟“ ابا نے انہیں اپنا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

”اے بیٹا ایتنا باریک بات نہ کرنا تم میرے بیٹے کی طرح ہو، روپے پیسے کی کون سی بات ہے، ایسا کرو، منوں بھائی نے راج مزدوری کے لئے جتنے پیسے لینا چاہو، لے لو اور میرا یہ کام کروا دو۔ یہ مجھ بڑھیا پر تمہارا احسان ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ! آپ ہماری ماں کی جگہ ہیں، میں آپ کا یہ کام کروا دوں گا، ویسے میں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ پلستر صرف نیچے زیادہ اکھڑا ہوا ہے، ایک دودن کا کام ہے۔“

اباجی نے پلستر والا کام بہت اچھا اور سستا کروایا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر جو پیسے اس بڑھیا ماں جی سے بوڑھے منوں بابا کے ذریعے گھر کی مرمت پلستر وغیرہ کے واسطے لئے تھے اس میں سے آدھے سے زیادہ بچا کر جب واپس گئے تھے تو اماں جی بہت خوش ہوئی تھیں۔

ابا نے تیسرے دن مجھے اور تلوارا رام کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ٹنگی منزل سے سفیدی اور پینٹ کا کام شروع کیا جائے، میں پہلے پونٹن بھرتا اور دیواروں کو صاف کرتا، پھر ابا دیواروں پر سفیدی کرتے اور سب سے آخر میں تلوارا رام پینٹ کرتا۔

کام بڑی تیزی سے جاری تھا کہ۔۔۔۔۔ ایک روز اچانک کام کے دوران ابا میٹھی پھسل جانے سے گر گئے تھے، ان کی کمر میں کچھ ایسی چوٹ آئی تھی کہ وہ کام کے قابل نہیں رہے تھے اور انہوں نے اپنی جگہ ایک ہندو کام کرنے کے لئے بلا لیا تھا جو چونے کی کچی پھیرنے لگا تھا۔

ایک روز کام کے دوران مدھوسنگھ نے مجھ سے کہا تھا۔ ”یار مجھے سمجھ نہیں آتی کہ۔۔۔۔۔ اتنے بڑے گھر میں صرف دو بوڑھے رہتے ہیں یہ گھر بڑا پر اسرار ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس مکان کی اوپر والی خالی منزل میں بھی کوئی رہتا ہے۔“

”تو یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہا ہے؟“ میں نے سوال کیا تھا۔ اس نے جواباً کہا تھا کہ ”میں نے خود اپنے کانوں سے آج صبح اوپر کسی کے چلنے کی آہٹ سنی ہے۔“

”اودھ یہ، تیرا اودھ ہوگا، اچھا خیر اگر ایسا ہی ہے تو میں یہ راز منوں بابا سے جاننے کی کوشش کروں گا۔“ میں تلوارا رام کے جواب میں یہ کہا تھا۔

شام ہوئی یہ تو ہم نے دیہاڑی کا کام ختم کیا تھا اور اپنے گھر کے کپڑے پہننے کے علاوہ رنگ اور چونے سے سے برش اور کوچیوں کو صاف کیا اسی دوران میں جب منوں بابا میرے پاس آئے تو میں باتوں باتوں میں ان سے پوچھا۔

”آپ یہاں اتنے بڑے گھر میں دو ہی انسان رہتے ہیں یا کوئی تیسرا بھی ہے؟“ انہوں نے خفیف سا غصہ اپنے ماتھے کے ٹھکنوں میں نمایاں کیا۔۔۔۔۔ اور مجھے قدرے ڈانٹتے ہوئے بولے۔

”بیٹا، اپنے کام سے کام رکھو تمہیں ہماری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ میں اپنا سامنے لے کر رہ گیا پھر انہوں نے مجھے یہ تاکید بھی کی کہ تم نے بھی کسی قیمت پر اوپر کی منزل کی چھت پر نہیں جانا اور ہاں، جب پہلی دو منزلوں کا کام ختم ہو جائے تو تمہیں کم از کم دودن پہلے مجھے اس کے بارے میں بتلانا ہوگا۔

بھرت، میں نے اس مکان کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے زبان دی ہوئی ہے، بے وقوف عقل کے کچے، میں نے یہ کام تلوارا رام سے ٹھیکے پر کروانا ہے اگرچہ کہ وہ دیہاڑی پر کام کر رہا ہے لیکن میں اس سے اپنا حساب مکا چکا ہوں ابا! ہمیں کیا کہہ ہاں کوئی اوپر کی سایہ ہے یا وہاں کوئی گھسرا بھی ہے بس تو اپنی بچکانہ فطرت اور ڈر کو پرے ڈال اور کل صبح اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کام پر جا لو وہاں یہ بات بھول کر آئندہ ان کے سامنے نہ کرنا ورنہ وہ دونوں بدک کے بھاگ جائیں گے۔“

دودن بعد میں نے منوں بابا سے کہا تھا کہ مجھے کچھ کھانے کے لئے بڑا ڈرم چاہئے اسی دن اتفاق سے ابا جہاں پور کے بازاروں میں کسی وجہ سے تمام دکانیں بند تھیں۔

منوں بابا نے کہا۔۔۔۔۔ ”بڑا ڈرم ہمارے پاس موجود ہے لیکن وہ سب سے اوپر والی چھت کے اسٹور میں ہے اور وہ اتنا وزنی اور سامان میں پھنسا ہے کہ اسے اٹانے کے لئے کم از کم چار آدمی درکار ہوں گے کیونکہ ابا کو عام سے دوسرا سامان لگانا پڑے گا۔“

”تو پھر کیا پروگرام ہے؟“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں خود ہی یہ کہا تھا کہ اوپر کی منزل میں کسی قیمت پر انہیں تھلائے بغیر نہیں جانا۔

منوں بابا نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر گہرا سانس اپنے اندر پھینچتے ہوئے بولے۔ ”تم تینوں میری مدد کے لئے اوپر آؤ۔“

وہ آگے آگے اور ہم ڈرتے ڈرتے ان کے پیچھے بیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب ہم اوپر کی منزل کی مدد کی آخری میٹھی پر پہنچے تو ہمیں انہوں نے ایک ٹکے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”اوپر ذرا احتیاط سے آنا وہ اصل چھت پر چھوٹی بی بی رہتی ہیں۔“

”وہ چھت پر ہی رہتی ہیں؟“ تلوارا رام کے بے بسا سچی سوال لگا تھا۔ ”تم یہاں مزدوری کرنے نہیں، شاید ہمیں

کھوجنے آئے ہو؟“ ”معافی چاہتا ہوں بزرگوا“ تلوارا نے فوراً معافی مانگی تھی۔

جب ہم تینوں چھت پر پہنچے تھے تو وہاں یہ منظر دیکھا۔۔۔۔۔ کہ ایک دیہی ٹنگی عورت جو کہ شکل و صورت سے حسین ناک نقشب کی مالک تھی اس کا قد بھی بڑا اچھا تھا وہ بڑی خاموشی سے لیکن بے چینی کے عالم میں چھت پر ٹھٹھنے والے انداز میں مسلسل یوں چکر لگاتے جاری تھی جیسے کوئی پھری والی موٹر اس کے پاؤں میں لگی ہوئی ہو اس کی آنکھیں مسلسل اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ ہم نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی اور منوں بابا کے ساتھ اسٹور کے اندر گھس گئے تھے اور وہاں سے پہلے وہ سامان لگانا شروع کیا تھا جس میں ڈرم پھنسا ہوا تھا۔

منوں بابا، تلوارا رام اور مدھوسنگھ اسٹور کے اندر تھے جبکہ میں باہر تھا اور بہانے بہانے سے اس عورت کی جانب دیکھ رہا تھا وہ یقیناً بڑی پر اسرار لگ رہی تھی وہ ایسی کیوں تھی یہ سوال میرے لئے تجسس کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن سچی بات ہے میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں منوں بابا سے اس پر اسرار عورت کے بارے میں پوچھوں۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے بعد میں بھی ایسا موقع نہیں ملا تھا۔

مدھوسنگھ، ابا کی جگہ سارا کام اور حساب کتاب دیکھ رہا تھا، وہ کیونکہ ابا کا ہم عمر اور پرانا دوست تھا اس لئے جیسا وہ کہتا ویسا ہی مجھے اور تلوارا رام کو ماننا پڑتا تھا دوسری جانب منوں بابا بھی جو ہماری مزدوری بن رہی تھی وہ بغیر جھٹ کے نہیں دے رہے تھے جب کے ابا کی کمر میں خلاف توقع زخم ہو گئے تھے اور پھر ایک دن بوڑھی مالکن اماں نے مجھے خصوصی طور پر دوسری منزل پر اپنے پاس بلا کر کہا تھا

”بیٹا تمیز الدین! مجھے تو آج ہی تلوارا رام نے بتلایا ہے کہ تمہارے ابا جو میٹھی پھسلنے کی وجہ سے گرے تھے اب ان کی حالت بہت بری ہو گئی ہے اس



## مسلسل کامیابیوں کا تیسواں سال

## شمع جنتری

2018

مؤلف۔ اقبال احمدی

شائع ہوئی ہے

قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

قیمت -/150 روپے



پاکستان کی واحد منفرد اور مستند جنتری جس میں دیئے گئے مستقل اور نئے عنوانات آپ کو ہر وقت چمکا دیتے ہیں اور جسے پڑھ کر آپ پر حیرت طاری ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں چھپنے والی جنتریوں اور نقادیم میں سارے مضامین یکساں نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو بھی اس سے قارئین مکمل استفادہ حاصل نہیں کر سکتے ان کے علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ اس سال کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔ جنتری اولیات، (جبری رئیس کا نقشہ) مذہبی تقریبات و تعلیلات، خواتین کے مزاج پر چاند کے اثرات، اثرات قمر، قوارخ ماہ، آج کا دن کیسا گزرے گا، ہر کام میں کامیابی یا ناکامی کے لئے سحر اور خس تاریکیوں، قمر و عرق اوقات داخلہ کی جدول، 2018ء میں یہ کام کریں یا نہ کریں، نقشہ محر و افکار تاریخی عیسوی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، تاریخ جبری سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، 176 سالہ شہمی جبری کیلنڈر، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، تسویت اہلیوت مختصر، تسویت اہلیوت پاکستان، تعارف رفتار سیارگان، یونانی رفتار سیارگان کو ہندی رفتار سیارگان میں تبدیل کرنا، جدول نظرات سیارگان، انعامی باطنی انعامی انکسوس سے لکھ جی یا کر پڑتی ہے یا نہیں، 2018ء علم الاعداد کی روشنی میں، نوروز عالم افروز (عالمی چٹکولیاں) نوروز جبری کا پھل، نوروز عددی کا پھل، نورانیہ کا پھل، نوروز کا پھل، نوروز جی کا پھل، جینی سال کیسا رہے گا۔ آیات قرآنی سے مشکلات کا حل، خواب اور تعبیر خواب، دانش اپ اپنے موبائل نمبر کے بغیر استعمال کریں، ٹرڈ کا لرا پہلی کیشن کیسے کام کرتی ہے، اسات فون کے لئے کچھ حفاظتی طریقے، کچھ مہد جات کے تین راز جو آپ نہیں جانتے ہیں۔ رجعت سیارگان کے اثرات، نقشہ یا تحلیلات کو اک، آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، اپنے اسم اعظم اور اسمائے نبوی کے حروف باطن معلوم کیجئے، سات دن میں مہزاد کو قابو کرنے کا عمل، شرف و مہبوط سیارگان، شرف و مہبوط قمر و رجعت و استقامت سیارگان، صحت مند بننے کے لئے کیجئے 13 مضمعی مہی جہلیاں، عالم اسباب، اسات فون اور ٹیبلٹ کے لئے 360 سیکورٹی ایپ، ہر شے میں ہے جلدہ گرہے نام محمد، چاند کے طلوع و غروب کے اوقات 2018ء، بارہ برجوں کے حالات 2018، مجھے امید ہے کہ اتنے سارے عنوانات سے آپ کے علم کی پیاس یقیناً بجھ جائے اور آپ مزید مفید مشوروں سے مجھے فو ازیں کے تاکہ جنتری کو بہتر سے بہتر خطوط پر استوار استوار کیا جائے اور آپ کے استفادوں کا کارواں یونانی رواں دواں رہے۔

دماغ

اقبال احمدی

شمع ایک ایجنسی نوید اسکوائر گراچی اردو بازار

021:32773302

نہیں صرف موت کا انتظار ہے لہذا میں صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کے لئے درد کش دوائیں تجویز کر دوں۔“

ڈاکٹر کی اس بات سے مجھے بڑی ذہنی اذیت ہوئی تھی اور پھر اپنے گھر کا کام ختم ہونے، ہمارا تعلق ختم ہو جانے کے باوجود مالکن اماں نے صرف میرے دل کی تسلی کے لئے شہر در شہر اچھے ڈاکٹر و جیکسوں سے ابابا کا مہنگا ترین علاج کروایا لیکن ڈاکٹر و مفضل کا کہا جی ثابت ہوا کہ..... ابابا کا علاج صرف موت ہی تھی۔

ابا مر گئے..... ان کے مرتے ہی ایسا لگا جیسے ہماری زندگی کے سمندر میں مدوجز آ گیا ہو، میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، ساری ذمہ داری مجھ پر آ گئی تھی۔

زندگی میں آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ پریشانی وقتی ثابت ہوئی..... ہوا یوں کہ ابا کی فونکلی کے چند روز بعد اماں مالکن صاحبہ! منوں بابا کے ساتھ موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ہمارے گھر آئیں ہمیں اور ہماری بہت ہی زیادہ مالی مدد کی تھی وہ جانے سے پہلے میری ماں سے معافی مانگتے ہوئے بولی تھیں۔ ”ہم تمہارے خاندان کے قاتل ہیں۔ کاش ہم ماسٹر شہزادی کو اپنے گھر چونے اور پیٹ کے لئے نہ بلواتے۔“ انہوں نے بار بار روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تھی۔

”بیٹا مجھ دبی بڑھیا کو معاف کر دینا کہ ہمارے گھر میں تمہارے نیک باپ کی بلا وجہ موت ہوئی۔“

”نہیں اماں! اس میں آپ کا کیا دخل ہے۔ ان کی موت آئی ہوئی تھی آگئی اور ویسے بھی ان کی موت تو حادثاتی طور پر میزمری سے بچنے کی وجہ سے ہوئی۔“

”نہیں بیٹا! بچ پوچھو تو تمہارے باپ کو ایک نادیدہ چلو نے ہم سے دشمنی میں دھکا دیا ہوگا۔“

”اماں جی! یہ جو آپ کافی دنوں سے عجیب سی باتیں کر رہی ہیں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی کیا

گھوڑے منوں بابا نے مجھے کچھ بتلایا تک نہیں۔ بیٹا ہمیں معاف کرنا ہم تو پہلے ہی اپنی زندگی کے ایک عذاب جیسے امتحان میں مبتلا ہیں۔ خدا ہمیں موت بھی آسانی سے نہیں دیتا۔“

”جی آپ تو بہت محبت کرنے والی بزرگ خاتون ہیں، اللہ آپ کو طویل زندگی دے۔“ میں نے کہا۔

”زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کی عمر تو تمہاری ہے بیٹا، خدا تمہیں لمبی اور صحت والی زندگی دے، میرا کیا ہے بیٹا برسوں سے اس گھر کے اس کونے میں پڑی بیٹی کی صحت اور اپنی موت کی دعا مانگ رہی ہوں۔ خدا میری بیٹی پر رحم فرمائے دعا کرو اس بے قصور کی سزا کسی طرح ختم ہو جائے۔“

انہوں نے جب اپنے منہ سے یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ..... ”خدا میری بے قصور بیٹی کی سزا ختم کر دے۔“ تو میرے کان کھڑے ہو گئے تھے اور پھر میں نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔ ”آپ کی بے قصور بیٹی کی سزا والی بات سے کیا مراد ہے؟“

میرے سوال پر اماں نے تو پہلے چپ لگالی تھی..... اور پھر انہوں نے بات نالتے ہوئے مجھے کہا تھا۔ ”تم ابابا کا علاج صحیح طریقے سے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے کرواؤ اور تم اس کے لئے خرچے کی فکر نہ کرنا بلکہ تم ایسا کرو کہ مشہور گورے ڈاکٹر و مفضل سے ابابا کا علاج کراؤ وہ بدر پور میں بیٹھتا ہے وہاں جانے کے لئے موٹر گاڑی کا بندوبست ہم کروادیں گے۔“

اور پھر انہوں نے منوں بابا کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے ابا کے اچھے علاج کے لئے فوری اقدامات کریں اور ان کے حکم کے مطابق منوں بابا نے ابا کو خصوصی طور پر کرائے کی موٹر گاڑی میں بدر پور لے جا کر ڈاکٹر و مفضل کو دیکھا یا تھا جو بڑا تجربہ کار اور وچ گوتھا، اس نے مجھے اور منوں بابا کو ایک طرف لے جا کر صاف صاف بتلادیا تھا کہ میزمری سے گرنے کی وجہ سے بابا کی کمر کے دو مہرے مکمل طور پر ٹوٹ چکے ہیں اب ان کا علاج کوئی

آپ کے گھر میں کوئی اوپری مخلوق ہے؟ اور آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ خدا نہیں موت دے دے اور میں نے آپ کے گھر کی تیسری منزل پر ایک پریشان حال، بے چین عورت دیکھی ہے آخر ماجرہ کیا ہے؟

مالکن اماں میرا سوال سن کر ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد بولیں۔ ”بیٹا تمیز الدین دراصل ہمارے گھر کی خوشیوں کا قاتل کوئی ایک نہیں کئی کردار ہیں لیکن میں تمہیں اس گھر کی بربادی کی کہانی اپنی زبانی نہیں سناسکتی، اس کی کچھ وجوہات ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”ایسی کون سی وجوہات ہیں جو آپ اپنے گھر کی کہانی سنانے سے گریز ان ہیں؟“

”بس بیٹا کچھ عروں اور ناٹوں کا فرق اور تقدس والی مجبوری ہے جو تمہیں تمہارے دل کے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی، تم ایسا کرو میرے گھر کی کہانی اور اپنے باپ کی موت کا کارن منوں بابا سے سن لیتا۔“

”منوں بابا نے مجھے ایک بار ایسا سوال کرنے پر ڈانٹ دیا تھا وہ تو مجھے کچھ نہیں بتلائیں گے۔“ میں نے فوراً ہی کہا۔

”بیٹا میں منوں بابا سے کہوں گی کہ تمہارے تجسس کو ختم کر دے کیونکہ اب وقت کا تقاضہ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ تمہیں اس گھر کی حقیقت بتادی جائے کیونکہ میرا ضمیر کوارا نہیں کرتا کہ تمہیں اس گھر کی بھانک کہانی نہ سنائی جائے جہاں تمہارے ابا کی موت ہوئی تم کل صبح آنا، منوں بابا تمہارے دل میں اٹھنے والے سوالات کا جواب ایک کہانی کی صورت میں دیں گے۔“

دوسری دن صبح کے وقت میں مالکن اماں کے گھر پہنچ گیا تھا انہوں نے مجھے بیٹھا کر منوں بابا کو آواز دی تھی وہ آئے تو انہوں نے مجھے کہا۔

”تمیز الدین تم ایسا کرو میرے ساتھ چھت پر آؤ لیکن پہلے تم مالکن کے ساتھ چائے پانی کرلو۔“

چائے پینے کے بعد منوں بابا نے مجھے اوپر بیڑھیوں کی جانب آجانے کا اشارہ کیا تھا اور میں جب

ان کے ساتھ چھت پر پہنچا تو وہاں اس عورت کو اسی طرح بے چین، مسلسل ٹھٹھے دیکھا تھا۔ اس کے چلتے قدموں میں ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ تھا۔ میری نگاہیں اس عورت کے خبط الخواص سراپے کا طواف کر رہی تھیں کہ منوں بابا نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا تھا۔

”پہلے تو میں تم سے اس گزشتہ رویے کی معافی مانگتا ہوں جب میں نے تمہیں ڈانٹا تھا..... کہ تم ہماری ذاتی زندگی میں دخل نہ دو۔“

میں نے کہا۔ ”منوں بابا آپ میرے لئے قابل احترام ہیں، آپ اس بات پر پشیمان نہ ہوں۔“

منوں بابا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔ ”میں کبھی، کسی قیمت پر اس گھر کے تاریک گوشوں سے پردہ نہ اٹھاتا لیکن مالکن کے حکم نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بیٹا! تم جو یہ سناتے سے بھرا پراسرار گھر اور اس شگفتی خاموش لڑکی کو دیکھ رہے ہو بخدا پہلے ایسی نہ تھی یہ تو بہت شوخ چٹپلا، ایم اے پاس پڑھی تھیں ہاشور لڑکی تھی اور اس گھر میں تو خوشیاں رقص کرتی تھیں اس لڑکی کا نام رانی ہے یہ اپنی بڑی بہن پروین کے بعد دوسرے نمبر پر اسی ان دونوں سے پہلے ان کے باپ سیٹھ اسماعیل اولادیں پیدا ہو کر جوانی کی حدود کو چھونے سے پہلے ہی راہ عدم ہو گئی تھیں۔ بہر حال اس گھر میں تین بھائی رہا کرتے تھے ان تین بھائیوں میں اس کا باپ سیٹھ اسماعیل سب سے بڑا تھا دوسرا چھوٹا بھائی مختار کے بیٹے طفیل سے اور رانی کی بھتیجی حکیم الدین کے بیٹے رؤف سے ہوئی تھی تینوں بھائیوں اور بھادجوں میں اتفاق بہت تھا یہی وجہ تھی کہ تینوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کی شادیاں آپس میں کر لیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

پروین نے جب ایف اے کیا تو اس کی شادی طفیل سے ہو گئی جبکہ رانی کی شادی اس لئے رکی ہوئی تھی کہ اس کا مگھیر رؤف انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا..... اسی دوران مختار یعنی پروین کے سرکوبہ بیٹی میں اچھا مکان مل

ایسا لہذا پروین کو وہاں جانا پڑا تھا۔ ادھر رانی نے بھی تعلیم کو جاری رکھا تھا وہ ایم اے کرنے کے بعد کسی کام میں لپکھار بننا چاہتی تھی رؤف اس سے بہت محبت کرتا تھا وہ دیباغیر (انگلینڈ) سے اس کو نہ صرف محبت تھی بلکہ تحائف بھی بھیجتا تھا۔ رانی اپنے چچاؤں کے باپ کی بیٹی اور مرز گنگا گھی۔

اس گھر کے تمام باسی انتہائی سکمی اور خوشگوار لگتے تھے اور پھر اس خاندان کی بربادی کا ان کچھ اس طرح ہوا تھا..... کہ ایک دن رانی کی بہن ان کا خط بہن سے آیا کہ وہ شاہ جہاں پور آنا چاہتی دراصل اس کے ہاں اولاد نہیں ہو رہی تھی اس نے تین سالوں میں بہت سے ٹوٹے ڈاکڑی، جھکی کے کتے لیکن سب سے بے فائدہ رہا تھا اولاد آنے کی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی دوسری جانب اس کی بہن اور خاندان طے تھے دے رہے تھے پروین نے بطور پرکھے اس خط میں لکھا تھا کہ ”میرا خاندان میری اولاد کے باعث سوتن لانا چاہتا ہے مجھے کسی نے دے دیا ہے کہ شاہ جہاں پور میں ایک کرچن تعویذ سے کرنے والا ہے میں اس سے ملوں وہ اولاد کے لئے بارے میں بہت مشہور ہے، اس کے علاج اتنی لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے میں اس غرض سے آنا چاہتی ہوں۔“

پروین جب شاہ جہاں پور اپنے گھر آئی تو اس کے والدین نے ابتدا ہی طور پر اس کرچن عامل کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو انہیں پتہ چلا کہ اس کے عمل کے باعث بے اولاد جوڑوں کے ہاں

لوگ جنم لے رہے ہیں۔

پروین کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو اجازت دی تھی کہ وہ مذکورہ کرچن عامل کے پاس چلی جائے یہ ہوا تھا کہ پروین کے ساتھ اماں جائیں

اسی روز اتفاق سے اماں بیمار ہو گئی تھیں سوان کی

نہیں نے رانی کو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو۔

پروین اور رانی جب اس کرچن عامل کے

پاس پہنچی تھیں تو وہاں بقول پروین کہ..... ان کی نگاہوں کے سامنے اللہ معاف کرے بد شکل چمک زدہ کالی سیاہ رنگت والا ادھیڑ عمر کا آدمی موجود تھا وہ شکل و صورت سے عورت پرست قسم کا لگ رہا تھا اس نے پروین کو کہا کہ..... وہ اسے ایسا موثر ٹوکنا بتائے گا جس کی بدولت اس کے ہاں اولاد ضرور پیدا ہوگی اور وہ بھی جڑواں لیکن اس کی قیمت اسے پیسے میں نہیں کسی اور صورت میں دینی ہوگی۔

پروین نے پریشانی کے عالم میں پوچھا تھا کیا قیمت؟

اس بد شکل کرچن عامل نے رانی کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اولاد ہونے کی صورت میں اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔“

پروین اس وقت اپنی غرض میں اتنی تھمتھی کہ اس نے عامل کی اس بات کا دھیان نہ دیا تھا دوسری جانب رانی نے اس بات کو عامل کا مذاق سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہاں میں تم سے شادی کر لوں گی تو بس میری بہن کی ماں بننے کی تمنا پوری کر دے۔“

عامل نے پروین کو ٹوکنا بتاتے ہوئے کہا تھا۔ ”میری اس شرط کی کسی کو کالوں کا ان خبر نہ ہو، اس سال خداوند نے چاہا تو تیری کوکھ سے دو خوبصورت لڑکے پیدا ہوں گے یہ میری طرف سے گارنٹی ہے۔“

اس کی یہ بات سن کر پروین نے اپنے پرس سے اس زمانے کا لحاظ سے سو روپے جب کرچن عامل کو دیئے تو اس نے اسے واپس کر دیئے اور پھر رانی کی طرف عاشقانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھ سے شادی والے اپنے وعدے پر قائم رہنا۔“ پروین جو ٹوکنا لینے کے بعد عامل کی جانب سے دو بیٹوں کی خوش خبری سن کر پاگل ہو رہی تھی اس نے عامل کے منہ سے نکلے ہوئے رانی کے بارے میں الفاظ پر ذرا رابر بھی غور نہ کیا۔

اور پھر ٹھیک دس ماہ بعد واقعی پروین کے ہاں دو خوب صورت جڑواں بیٹوں نے جنم لیا..... اور وہ

صبح ہوئی تو ویسے والے دن گھر کے تمام افراد یعنی سرال اور میکے والے افسردگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

اس رات رؤف کو بزرگوں نے سمجھا بچا کر رانی کے کمرے میں بھیجا۔ رانی کے جسم پر کئی قیمتی خوشبو اور عطریات کی بوتلیں انڈیل لی گئیں پورا کمرہ دلکش خوشبوؤں سے مہک گیا حساب کو امید تھی کہ بگڑی بات بن جائے گی لیکن اس بار بھی رؤف کو رانی بدبو سے بھرا کمرہ لگی تھی۔ اس نے بہت مجبوری والی کیفیت میں رانی سے رخ موڑ کر کہا تھا۔

”میں تمہیں دل سے اپنی بیوی مانتا ہوں، یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کے باوجود مجھے تم سے محبت ہے لیکن میں تمہیں زوجیت کا حق نہیں دے سکتا اور نہ تمہارے ماتھے پر طلاق کا ٹکٹ لگاؤں گا۔“ یہ کہہ کر رؤف کمرے سے یوں نکلا تھا جیسے رانی کے دل سے نکلا ہو۔

رانی تو یہاں ہی، ان بیانی سی ہو گئی تھی۔ ارد گرد کی عورتیں اور باتیں بنانے والے اسے آدمی دلہن کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ ان حالات کے باعث سیٹھ اسماعیل اور عبدالحکیم کی لڑائی ہو گئی رؤف واپس انگلینڈ چلا گیا۔ خوشیوں بھرے گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال لئے۔

پروین اور اس کے شوہر نے رانی کو جگہ جگہ ڈاکٹروں، حکیموں اور مولویوں تعویذ گنڈے والوں کو دکھا سب نے مشترکہ طور پر یہ ہی جواب دیا تھا کہ رؤف کے دماغ میں شاید کوئی جادو کر دیا ہے ورنہ تو رانی بظاہر میڈیکل طور پر ٹھیک ہے البتہ ایک کالے علم کرنے والے نے یہ بتایا تھا کہ رانی پر اس کرکچن عامل نے کچھ ایسا عمل کر دیا ہے کہ جو بھی مرد اس کے قریب جائے گا وہ اس کے جسم سے لٹکنے والی بو سے نفرت کرے گا اور یہ بدبو صرف اس کے قریب جانے والے مرد کو ہی محسوس ہوگی۔

رانی اب سارا وقت اس دن کو کوئی اور پروین سے لڑتی رہتی کہ ”کاش میں تمہارے ساتھ اس حرام

موڑا اور چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھو میں گلاب ان جیسی خوشبوؤں سے نہائی ہوں تم کیسی پاگلوں جیسی کر رہے ہو؟“ وہ بری طرح چیخنے چلانے لگی تھی۔ رانی کیونکہ اسی گھر میں بیاہ کر اسی گھر کے کمرے پرورش میں آ گئی تھی اس لئے اس کی جج و پکار رانی اور رؤف دونوں کے گھر والوں کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔

سب لوگ جلد عروسی کے دروازے پر بہت کان کن انداز میں پہنچے تھے۔ جہاں عذاب پڑا تھا۔ بڑی بیگم اور سیٹھ اسماعیل نے گھبرا کر رؤف سے لاکھا کہ ”آج تمہاری خوشیوں والی سہاگ رات بھر یہ کیا ماجرہ ہے؟“

اس پر رؤف نے بہت مایوس کن انداز میں کہا ”رانی کے جسم سے بہت بری بدبو آ رہی ہے۔“ ”بیٹا، تم کتنی بھونڈی اور عجیب بات کر رہے ہو؟“ انے ہوئے ہوئے ہوئے ”رؤف کی ماں نے اسے غصے سے لٹکے ہوئے کہا تھا۔

”میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں، میں یہ بات بے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ رانی کے وجود سے آ رہی ہے۔“

رؤف کی یہ بات سن کر بڑی مالکن نے جنونی انداز میں سب کو دھکا دیا تھا اور آگے بڑھ کر پاگلوں طرح رانی کے جسم کو اپنی ناک لگا کر سونگھتے ہوئے کہیں۔

”ارے بے وقوف..... اس کے جسم سے تو حنا، گلاب اور دیگر چیزوں کی خوشبو آ رہی ہے رؤف..... تم نے کیوں اپنی سہاگ رات کو مٹا دیا؟“

”نہیں، نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ رؤف نے اپنی بات پر قائم تھا۔

”اچھا بیٹی تم ایسا کرو کہ میرے کمرے میں چل جاؤ اور رؤف مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم بیمار ہو تم بھی ماتے ملجھہ سو جاؤ صبح کچھ فیصلہ کریں گے۔“

کر لے تو میرے دل کو بھانگی ہے اور اگر تو نے مجھ سے شادی نہ کی تو یاد رکھ میں تجھے کسی مرد کے قابل نہ سمجھوں گا دینا تجھ پر حقوے کی۔ وہاں موج، دکانداروں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی تو وہ چلا گیا تھا۔ ادھر رانی کی بہت بدنامی ہو گئی تھی۔ اس نے انگلینڈ رؤف کو خط لکھا تھا کہ ”خدا کے لئے سب کچھ ہوا کے فوراً آؤ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا ہے۔“

رؤف فوراً ہی انگلینڈ سے آ گیا تھا۔ وہ بڑے دل والا، پڑھا لکھا اور شریف انسان تھا۔ اس نے تمام حالات جاننے کے باوجود رانی اور رؤف کے گھر والوں نے طے کیا تھا کہ شادی کے فوراً بعد رانی انگلینڈ چلی جائے گی ان کے اس اقدام سے رانی اس شخص کو کچھ سے دور ہو جائے گی۔

رانی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی لیکن رؤف جب رات کو دلہن کے کمرے میں گیا تو اس نے کھوکھٹا اٹھاتے ہی اسے بوسہ محبت دینے کے بجائے اپنی ناک پر دو مال رکھ لیا تھا۔

رانی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے دلہن کوئی سمجھن ہوں جو آپ نے اس طرح اپنی ناک پر دو مال رکھ لیا ہے؟“

رؤف خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن نہاں سے کچھ نہ بولا۔

رانی نے تنگ آ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”کیا بات ہے تم یکدم جھکے سے میرے دماغ سے علیحدہ کیوں ہو گئے ہو؟“

اب رؤف نے آہستہ سے لب کھولتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے تمہارے وجود سے عجیب سی بدبو آ رہی ہے۔“

”یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟“ رانی نے رد کر دیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں رانی تمہارے دل سے.....“

رانی تو جیسے جنوں میں آ گئی تھی اس نے رات

اپنے سرال، خاوند اور خاندان میں سرخرو ہو گئی تھی۔ وہ جب اپنے دونوں نومولود لڑکوں کو لے کر شاہ جہاں پور آئی تھی تو سیٹھ اسماعیل اور پروین نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کرکچن عامل کو اس وقت کے لحاظ سے ہزار روپے اور کچھ تحائف دیں گے اس کام کے لئے وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے ہم جب اس کرکچن عامل کے گھر پہنچے تھے تو وہاں اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں کہا تھا۔

”مجھے یہ سب نہیں چاہئے مجھے تو رانی سے شادی کرنی ہے وہ تو مجھ سے وعدہ کر کے گئی تھی۔“

سیٹھ صاحب، پروین اور مجھے اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر شدید غصہ آیا تھا۔

”منہ سنچال کر بات کر بے غیرت۔“ سیٹھ صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس نے بڑے آرام سے جواب دیا۔ ”آپ مجھے یہ الفاظ نہ کہیں، میں نے تو اپنے کام کا معاوضہ مانگا ہے اور ویسے بھی تمہاری بیٹی نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا پوچھ لو یہ سنائے کھڑی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ پروین نے اسے لٹاؤتے ہوئے کہا۔ ”ذلیل انسان، میری بہن کی بچا کے بیٹے سے منگنی ہو گئی ہے۔“ اور پھر پروین نے اپنی برداشت کے دائرے سے نکلتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور اسماعیل صاحب نے اس کو بہت مار لگائی۔

”تمہیں میری بے عزتی بہت تنگی پڑے گی، دیکھنا میں تم لوگوں کا کیا حال کرتا ہوں۔“ کرکچن عامل نے اپنا خون آلودہ چہرہ صاف کرتے ہوئے ہمیں یہ دھمکی دی تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ بھی کی تھی لیکن تھانے والوں نے اپنی مٹھی گرم کر کے اسے فارغ کر دیا تھا۔

وہ عامل بہت جنونی انسان تھا۔ اس نے پھر یہ کیا کہ ایک روز بھرے بازار میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ ”تو مجھ سے وعدے کے مطابق شادی





## نیا گھر

نینا خان - کراچی

رات کے بارہ بجے جب خوب صورت لڑکی کی نظر سامنے اسٹور پر پڑی تو وہ انتہائی خوفزدہ انداز میں چیخنے لگی مگر اس وقت اس کی آواز دوسروں کو سنائی نہ دی اس کی سانسیں رک گئیں اور پھر.....

کیا عقلمند لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے کہ نیا گھر دیکھ بھال کر لیں، حقیقت کہانی میں پہاں ہے

ہو۔ آج کل کے ماحول سے مطابقت نہ رکھنا اب کافی مشکل ہے۔ بہر حال ماموں کی مرضی کے عین مطابق لڑکی پسند آئی گئی اور فوراً ہی رشتہ بھی طے ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ماموں کو گھر میں کونسا کمرہ دیا جائے۔ کیونکہ سب ہی ماموں کی شادی ہو چکی تھی اور گھر کے تمام کمرے پورشن سمیت ماموں ممانی کے پاس تھے جن میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔

یہ بات آج سے چھ سال پرانی ہے۔ جب سب سے چھوٹے ماموں واحد خان کی شادی لڑکیاں تلاش کی جانے لگیں اور کافی لڑکیوں ان کے بعد آخر کار ایک مناسب لڑکی پسند آئی۔ سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کچھ ڈیمائڈز ماموں کی کہ لڑکی آج کے ماحول سے اندر رکھتی ہو۔ شریف خاندان کی پڑوسی لڑکی

اس کے ساتھ ہی سیٹھ اسماعیل بیٹی کے صدمے میں مر گئے تھے رانی کو عدالت نے عامل کے چال چلن میں خراب سے واقف ہونے کے بعد اس کے گم کے جرم میں سزائے موت کے بجائے دس سال کی سزا سنائی تھی وہ جیل کی سزائیں ہی پامل ہو گئی تھی چچا حکیم اور ان کا کنبہ اس محوں مکان سے چلے گئے تھے۔

اب اس گھر میں بڑی مالکن اور رانی بی بی ہیں اور بیٹا..... ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا ہم اگرچہ تمہارے ابا کی بے وقت موت کے ذمہ دار تو نہیں ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ گھر اس کا باعث بنا۔ وہ غیبت عامل تو مر گیا لیکن اس کی روح اب بھی اس گھر کے در و دیوار میں ہمارا سکون اور خوشیوں کو برباد کرنے کے لئے ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس کی بھگتی روح جب بھی ہمیں نظر آتی ہے کہ اس گھر کو چھایا جا رہا ہے یا اس کی خوشیوں کا کوئی سامان ہو رہا ہے تو وہ کسی خیلے بھانے اسے پامال کر دیتی ہے اس روز جب تمہارے ابا تم اور تلواری رام چولے اور پیٹھ کا کام کر رہے تھے تو میں بڑی مالکن کے کمرے میں موجود ان کی معمول کی دوائی بنا رہا تھا تو اچانک میرے ہاتھ سے دوائی کی شیشی بے اختیار گر کر ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے در و دیوار میں جواسراخ س ہوا تھا یہ سب کچھ بس میں محسوس کرتا ہوں اور کبھی جاتا ہوں کہ..... اس غیبت عامل کی روح کوئی شیطانی حرکت کرنا چاہ رہی ہے بس اسی لمحے نیچے سے تمہارے ابا کی سیڑھی گرنے کی آواز آئی تھی۔ ظالم کرکچن عامل کی روح اپنا کام کر چکی تھی۔

منوں بابا نے یہ کہانی مکمل کرنے کے بعد مجھ سے کہا تھا..... ”بیٹا..... میری تم سے استدعا ہے کہ تم اپنے اتر کر اب کبھی رنکا نہیں سیدھے اپنے گھر جانا..... اور کسی اس طرف لوٹ کر نہ آنا۔“ میں نے اس گھر سے نکلے ہوئے جب آخری بار بے چین چلتے رانی کو دیکھا تو وہ اپنے بازوؤں کو مسلسل سونگھے جا رہی تھی۔

زاوے عورت پرست عامل کے پاس نہ جاتی اور اس سے مذاق میں یہ نہ کہتی کہ میں تجھ سے شادی کروں گی کاش، میں اس کے منہ پر اسی لمحے پتھر سید کر دیتی۔“ رانی کے حالات دن بدن بدتر ہونے لگے تھے۔ رؤف اپنی تعلیم وغیرہ مکمل کر کے مکمل طور پر انگلیڈ میں سیٹ ہو گیا تھا لیکن اس نے رانی کو نہ طلاق دی تھی نہ ہی اپنے پاس بلایا تھا۔ اب رانی تقریباً روزانہ اسے خط لکھتی تھی کہ ”رؤف مجھے تم سے شدید محبت ہے دیکھو میرے وجود سے اب بدبو نہیں آتی۔ خدا کے لئے لوٹ آؤ لیکن اسے وہاں سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔ بلا خروہ تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی۔

اور پھر ایک روز رانی نے شدید مایوسی اور پریشانی کے عالم میں یہ شرمناک حرکت کی تھی کہ ”اس نے محلے کے ایک بچے کو بلا کر اپنا جسم چپک کرنے کی خاطر اسے اپنا وجود دکھایا اور سنگھایا تھا..... لیکن اس بچے نے بھی شدید گھبراہٹ کے عالم میں یہ کہا تھا۔

”بابی..... مجھے تمہارے بدن سے مرے ہوئے چوہوں کی بو آ رہی ہے۔“ پھر ایک دن یہ ہوا کہ رانی گھر سے غائب ہو گئی، اسے بہت تلاش کیا اور پولیس میں رپورٹ درج کروائی تو پتا چلا کہ وہ اس کرکچن عامل کے گھر چلی گئی تھی اور اس کو قتل کرنے کے لئے تیز چھری سے اس پر وار کئے تھے رانی کو پولیس نے عامل پر حملہ کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا جبکہ شدید ڈھی عامل نے چوتھے روز یہ کہہ کر دم توڑ دیا تھا کہ ”رانی..... تو نے مجھ سے شادی نہیں کی تو وعدہ خلاف ہے دیکھ تو اب ساری زندگی کسی مرد کی قربت کو ترسے گی جو بھی مرد تیرے قریب آئے گا وہ تجھے دھکا کرے گا تو اور تیرے گھر والے ساری زندگی مصائب کا شکار رہیں گے تم موت مانگو گے بھی تمہارا مذاق اڑا کر چلی جائے گی اور میں مرنے کے بعد بھی تمہارے گھر کے در و دیواروں میں بس کر بدروح کی شکل میں تمہیں بے سکون کرتا رہوں گا۔“

”بس بیٹا یہ سب کہہ کر وہ عیسائی عامل مر گیا

اور فیملی بھی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی اس لئے چھوٹے ماموں کے لئے الگ سے پورشن بنانا مشکل ہو گیا تھا۔ گراؤنڈ فلور میں ڈرائنگ روم تھا اور ساتھ والا کمرہ نانی کا تھا۔ امی کیونکہ نانی کی اکلوتی بیٹی اور چھ بھائیوں کی اکلوتی بڑی بہن تھیں جس کی وجہ ہم سب بہن بھائی نانی ماموں سے بہت گور تھے اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ تمام ممانیوں کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے نانی کے گھر کے ہر پروگرام میں ہم پہلے سے ہی رکنے چلے جاتے اور خوب انجوائے کرتے ماموں ممانیوں اور کزن کے ساتھ۔

جب ماموں کی شادی کے دن نزدیک آئے تو بڑے ماموں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نا وہ ایک بڑا گھر خرید لیں جس میں تمام بھائی آرام سے مل کر رہیں۔ لیکن نانی پرانا گھر چھوڑ کر نئے گھر میں جانے کے لئے قطعی راضی نہیں تھیں۔ کیونکہ اس گھر سے نانا کی یادیں بڑی تھیں وہ شادی ہو کر اسی گھر میں آئی تھیں تمام ماموں نانی کو راضی کرنا چاہتے تھے مگر نانی کسی بھی قیمت پر راضی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں دوسری طرف واحد ماموں کی شادی ایک مسئلہ بن کر رہ گئی تھی پہلے لڑکی بڑی مشکل سے ملی اب گھر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

آخر کار امی کی مدد سے بڑے ماموں نے نانی کو راضی کر لی لیا۔ بات یوں طے ہوئی کہ تین ماموں نانی کے ساتھ پرانے گھر میں رہیں گے اور تین بھائی الگ گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ اور اسی گھر میں واحد ماموں کی شادی بھی کریں گے بڑے ماموں ایک بزنس میں ہیں اپنے بزنس کے سلسلے میں کبھی ملک سے باہر تو کبھی شہر سے باہر جاتے آتے رہتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے وہاں اپنے دوستوں سے گھر خریدنے کی بات کی کہ اپنے ایریا کے قریب کے ایریا میں ہی کوئی گھر خریدنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے ایک دوست نے جھٹ سے کہا۔

”یار میں بھی تو اپنا گھر فروخت کر رہا ہوں اور میرے گھر کا ایریا تمہارے گھر سے قریب ہے۔ یہ پیدل بھی آیا جاسکتا ہے پھر تو تم سب بھائیوں نے پاس بائیک ہے گاڑی ہے کیا پروہم ہے کراچی میں گریمر اگھر دیکھ لو اور اگر پسند آجائے تو لے ہو۔“

دوست کی بات سنتے ہی ماموں نے اس اشاپ نزدیک ہونے کی وجہ سے گھر کی لوکیشن کا پوچھ کر ٹوکن مٹی اسی وقت دوست کو دے دی اور گھر نے پیچھے اپنے نام کروانے کا بھی کہہ دیا ساتھ ہی چھوٹے ماموں کو کال کر کے دوست کے گھر سے چابی لے کر کہہ کا کھر کروانے کا کہہ دیا۔ بڑے ماموں کے آنے پہلے ہی چھوٹے ماموں اس نئے گھر میں کھر کر واپس آئے تھے ساتھ ہی تھوڑا بہت سیٹ بھی کر دیا تھا۔

بڑے ماموں کے آتے ہی بڑے ماموں کی فیملی کے ساتھ ہی دوسرے نمبر کے ماموں سعید خان اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نئے گھر کے سیکنڈ فلور پر شفٹ ہو گئے تھے جبکہ فرسٹ فلور پر بڑے ماموں اور واحد ماموں کے کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر بکلی لاؤنچ ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم کے ساتھ والا روم بڑے ماموں کے بڑے بیٹے حسن کا تھا۔ گھر والی طرز کا بنا ہوا تھا انٹرنس ایک پتلی سی گلی نما تھی اسی ساتھ ہی فرنچ رکھا ہوا تھا۔ لاؤنچ میں ہی بیٹھ بنا رکھی تھی درزی چادر بچھا کر وہاں کھانا کھاتے تھے سامنے ہی بچن اور بچن کے ساتھ اٹیچڈ ہال تھا۔ بیٹھک کے ساتھ دو کمرے ایک ڈرائنگ روم اور دوسرا حسن کا روم تھا روم کے ساتھ ہی میڑمیاں تھیں میڑمیاں کے پہلے اسٹپس کے ساتھ ہی ساٹھ ایک اسٹور بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا اسٹپس تھے پھر دو کمرے جس میں ایک بڑے ماموں اور دوسرے میں واحد ماموں رہتے تھے اسٹور ساتھ ہی اٹیچڈ ہال تھا بھی بنا ہوا تھا۔

اب اس نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی واحد ماموں کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی

ماموں نے سیٹ ہونے کے بعد ہماری اور نانی کی دعوت کی تاکہ ہم سب گھر بھی دیکھ لیں مگر ماموں کی شادی کی تیاری بھی مل کر ممانیوں کے ساتھ کریں۔ دعوت کا سن کر کہہ نئے گھر میں دعوت امی اور میں مارکیٹ سے نئے گھر میں جانے کے لٹ کے طور پر وال کلاک لے کر آئے۔ امی بہن ہیں جس کی وجہ سے تمام بھائی بہت اہمیت ہیں اور ہر پروگرام میں پہلے سے انہیں بلایا ہے اور بہت سے کاموں کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی ہیں۔

بہر حال جب ہم سب ماموں کے نئے گھر میں کزنز کے ساتھ مل کر گھر دیکھنے لگے بڑے ماموں نے نمبر کے ماموں کے بچوں سے بہت دوستی ہے اب جب گراؤنڈ فلور دیکھنے کے بعد اوپر میں جانے کے لئے میڑمیاں کے پہلے اسٹپس پر کھتے ہی اوپر اسٹور جس کا لوہے کا گیٹ تھا جب فلور پر میری نظر پڑی تو مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا میں نے اس خوف کو اتور کر دیا اور ہم سب کسی مذاق سے ہوئے فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر گئے۔ سیکنڈ فلور دو کمرے ایک کھانا کھانا تھا اور بچن ایک کمرے میں نے نمبر کے ماموں ان کی بیوی اور چھوٹا بیٹا قاسم کے ساتھ دوسرے کمرے میں بڑی بیٹی اقرا کا تھا ہم میں شادی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کسی میں معروف ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس اسٹور سے عجیب سے احساس کا خیال آ رہا تھا سے ہٹ کر میں جب اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

”عظمتی پتا نہیں کیوں مجھے اس اسٹور سے خوف ہوا ہا بار اس کا خیال آ رہا ہے۔“

میری بات سن کر ہنستے ہوئے اس نے کہا۔

”آپنی یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تم خیالوں میں ہی چیزیں لاؤ۔ ایسی ہی چیزوں کے بارے میں اس۔“

بہن کی بات سن کر میں مسکرا کر چپ ہو گئی کیونکہ بار بار ہم سب بھی اوپر جاتے تو کبھی نیچے آتے اور پتا نہیں کیوں میری نظریں اس اسٹور کے گیٹ پر ٹھہر رہی تھیں اور اس کے سامنے سے گزرنے پر میرے رونکنے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں گراؤنڈ فلور میں پہنچی تھی کہ عظمتی میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”آپنی تم ٹھیک کہہ رہی تھیں بار بار اوپر پورشن میں آنا جانا کرنے پر جب میں نے بھی غور کیا تو اسٹور کا گیٹ دیکھ کر مجھے بھی خوف سا محسوس ہوا عجیب سی وحشت آ رہی ہے گیٹ دیکھ کر۔“

میں نے اسے فوراً کہا۔ ”عظمتی ہم تو یہاں سے چلے جائیں گے بس اس بات کا ذکر کسی کزن سے مت کرنا۔ ان لوگوں کو تو رہتا ہے یہاں فضول میں ڈرنہ جائیں اور حسن تو خوب مذاق بنائے گا چپ رہنا۔“ میری بات سن کر عظمتی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم سب بھی بہن بھائی اور ایوانی نماز پڑھنے کے پابند ہیں۔ اور گھر میں ذکر وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھٹی حس تیز ہو گئی ہو۔ بہر حال رات میں دعوت کا کھانا کھا کر ہم اپنے گھر واپس آ گئے۔ لیکن اکثر ماموں کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جانا آنا ناگاہی رہتا تھا۔ اب وہ دن آئی گیا جب ماموں کی شادی کے دن قریب آ گئے اور ہم سب وہاں رکنے کے لئے چلے گئے۔

جس دن ہم اس گھر میں پہنچے تو رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بڑی ممانی اپنے پورشن میں سب کو شادی کے سوٹ وغیرہ دکھانے لگیں۔

بڑے ماموں نے کہا۔ ”بھینا بیٹا آج جائے تم بناؤ۔“ وہاں سب چائے کے حدود پر شوقین ہیں تینوں ناگم کھانے کے بعد چائے لازمی پانی جاتی شام میں الگ اور اس کے علاوہ بھی آنے جانے والوں کے ساتھ چائے پینے کا سلسلہ چل رہا تھا۔

اب میں بڑے ماموں کی بات سن کر اوکے کر کے گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ گزرتا مجھے اسٹور کے

سامنے سے ہی قہاسب تو اوپر پورشن میں تھے اور مجھے اکیلے نیچے چائے بنانے آنا تھا۔ میں چند اسٹپس اتر کر اسٹور کے سامنے کھڑی ہو گئی اسے دیکھنے لگی تو میرے روکنے کھڑے ہونے لگے، خوف محسوس ہوا، میں فوراً ہی دوسرے اسٹپس سے اتر کر نیچے کچن میں آ کر چائے بنانے لگی اور انتظار کرنے لگی کہ جلدی سے چائے بن جائے۔

اللہ اللہ کر کے چائے تیار ہوئی تو میں سب کے لئے چائے ٹرے میں سجا کر اوپر جانے لگی پہلے سیرمی کے اسٹپ پر قدم رکھتے ہی میری نظر سامنے اسٹور پر گئی اور میں وہیں ساکت کھڑی اسے دیکھنے لگی پھر بہت ہمت کر کے چائے لے کر روم میں پہنچی تو کچھ جان میں جان آئی۔

اس وقت رات کے تقریباً 12 بجے ہوں گے اور ہم سب چائے پی رہے تھے کہ سب کو چینی کم لگی اور مجھے پھر سے سب کے کنبے پر چینی لینے بھیجا گیا۔ میں بھی اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہوں۔ ڈر محسوس ہونا ایک فطری عمل ہے مگر ایک اشرف المخلوقات میں سے ہونے کی وجہ سے ڈر پر قابو پانا ہی عقلمندی ہے۔ میں ڈر کو خود پر حاوی نہیں کرتی۔ مگر ج تو یہ تھا کہ میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر اس اسٹور کے بند گیٹ پر ٹھہر رہی تھی اور میرے روکنے کھڑے ہو رہے تھے۔

چینی لینے کی غرض سے میں کچن میں آ کر واپس اوپر جانے کے لئے پہلے اسٹپ پر قدم رکھا تو میری نظر پھر سے اسٹور کے بند گیٹ پر ٹھہر گئی میں اوپر جانے کے لئے قدم بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ میرے قدم آگے نہ بڑھے میں پسینے سے شرابور ہو چکی تھی اور میری نظر اب بھی اسٹور کے گیٹ پر ساکت تھی۔ میری ہارٹ بیٹ تیز ہو چکی تھی میں پورے فلور پر اکیلی تھی۔

میرے پیٹ میں اچانک ایک عجیب سا درد اٹھا اس درد کی نوعیت کو مجھ پانا بہت مشکل تھا۔ اچانک میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور میں چکرا

کر گر گئی۔ میں گری بیڑیوں پر تھی جب مجھے اٹھ آیا تو میں کمرے میں تھی اور میرے ارد گرد ای ماہوں ممانیاں کزنز وغیرہ موجود تھیں۔ جب سب نے مجھ کو چھو کر دیکھا تو ہاتھیں تم بے ہوش کیسے ہو گئیں۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ”پیٹ میں درد اٹھا۔“ چکر آیا تو میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

امی نے کہا۔ ”اندرونی کمزوری سے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔“ اور اس طرح بات آتی گئی ہوئی۔ پھر تو مجھے بھی ایک خدسی ہو گئی تھی کہ میں ضرورت سے زیادہ اب اس اسٹور کے سامنے گزروں گی اور اسے محسوس کی۔ پھر شادی کی تیار ہوں تو چل ہی رہی تھیں ماہوں مہندی بارات ویسے کی رخصتی ہم نے خوب انجوائے کی۔ نئی ممانی کے ساتھ بھی اچھی دوستی ہو گئی تھی تمام رسوں سے فارغ ہو کر ہم آگے گھر آ گئے۔ مجھے بہت جرات تھی اس بات پر کہ کسی سے کزنز وغیرہ نے ایسی کوئی بات ڈسکس نہیں کی اس لئے میں نے بھی کبھی کسی سے کچھ ڈسکس نہیں کیا۔ وقت گزر رہا تھا ہم سب آتے جاتے ہی رہتے۔ حسن تو اس اسٹور سے سامان نکالنا اور رکھنا ہوتا تھا ایک قرآن حافظ لڑکا ہے شاید جب ہی اسے نول محسوس نہ ہوتا ہو۔

دوسرے نمبر کے سعید ماموں نے اچھے چھوٹے بیٹے قاسم کا حقیقہ کیا تو ہم ایک دن پہلے ہی گئے کافی رات گئے گائے اور انجوائے کیا۔ بھی وہیں تھیں میں اور عظمیٰ اقراء کے ساتھ اس کے میں سونا چاہتے تھے۔

نانی نے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ رہو گراؤ فلور میں سو جاؤ۔“

اب مجبوراً نانی کی بات ماننی پڑی، امی تو کمرے کے روم میں چھوٹی بہنوں کے ساتھ سو گئیں، امی اور عظمیٰ کچن کے ساتھ جہاں درمی چادر چھٹی تھی لیٹ گئی پھر نانی بھی وہیں لیٹ گئیں، پھر نانی ان کے برابر میں عظمیٰ لیٹ گئی لیٹ نائٹ ہم سونے کے

کمرے یا تیسرا پھر تھا کہ ابھی آنکھیں بمشکل بند کی کہ کچن کی چھت سے موٹے موٹے پتھر

پتھر چھت سے کھڑی ہوئی اور لائٹ آن کی آواز نانی سے میں نے کہا۔ ”اتنے موٹے پتھر کون پھینک رہا ہے گرنے اور پھینکنے ہوتا ہے نانی۔“

نانی کہنے لگیں۔ ”اوپر ڈک بنا ہوا ہے کچن کی کچن کچن پتھر پھینکتے ہیں۔“ نانی نے کہا۔ ”نانی کچن پتھر رات کو جگاتے اتنے موٹے بڑے پتھر ان کے بچوں میں کیا

کئی کہنے لگی۔ ”بھئی میں یہاں نہیں سوؤں گی بھئی پاس امی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ رو گئی میں بے چاری تو نانی نے ڈانٹ کر اپنے کمرے میں اور میں اسی جگہ کچن کے ساتھ ہی لیٹی رہے پتھر گر رہے تھے۔ میں ساری رات نہ اب عقیقے کا پروگرام قہاسب اگلے دن اسی کی میں معروف تھے۔ میں شاور لینے کے لئے پورشن کے انچھڑا تھ میں جانے کے لئے پورٹی تھی جیسے ہی نانی شاور لے کر نکلیں تو میں نے تو تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی نے آ کر کہا۔

”آپی آپ فرسٹ فلور کے باتھ روم میں چلی گئے یہاں نہانے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”معتقلہ تم جاؤ وہاں میں کب سے پورٹی تھی میں تو جا رہی ہوں شاور لینے۔“

معتقلہ نے مجھے بتایا کہ ”سب سے نیچے گراؤنڈ باتھ روم خالی ہوتا تو میں وہاں چلی جاتی فلور کے باتھ روم میں نہیں جاؤں گی مجھے لگتا ہے۔“

معتقلہ کی اس بات پر میں چونک گئی کیونکہ تین دن پہلے سے آج تک مجھے اس طرح کی کوئی

بات سننے کو نہیں ملی پہلی بار ایسی بات سن کر میں حیران رہ گئی معتقلہ چونکہ تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی تھی وہ لوگ تو پرانے گھر میں ہی رہتے تھے۔ میں نے اس سے فوراً پوچھا۔

”معتقلہ تمہیں ڈر کیوں لگتا ہے فرسٹ فلور کے باتھ روم میں شاور لینے سے۔ کچھ بات ہے کیا؟“

میرے پوچھنے پر معتقلہ نے بتایا۔ ”آپی میں یہاں رکنے کے لئے آئی ہوئی تھی تو شاور لینے کے لئے فرسٹ فلور کے باتھ روم میں چلی گئی میں شاور لے رہی تھی کہ میں نے صابن یوز کر کے صابن دانی میں رکھا جب مجھے دوبارہ صابن کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے دیکھا صابن تو صابن دانی میں ہے ہی نہیں میں نے ہر طرف صابن دیکھا مگر صابن مل کر نہ دیا اور میں تو خوف زدہ ہی ہو گئی میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ابھی تو میں نے صابن رکھا ہے اچانک سے صابن کہاں غائب ہو گیا۔

میں پریشان ہو رہی تھی کہ کسی نے میرا نام لیا۔ معتقلہ یہ رہا صابن اور زور سے کسی نے صابن میری طرف پھینکا۔ میں انتہائی ڈر گئی جلدی سے کپڑے پہن کر باہر آ گئی میں نے اقراء آپی کو بتایا یہاں تو کوئی یقین نہیں کر رہا اور سب مذاق اڑا رہے ہیں۔

”آپی پلیز! آپ وہاں چلی جائیں میں یہاں جا رہی ہوں نہانے۔“

معتقلہ تو چلی گئی نہانے کے لئے اور پھر مجھ پر ڈانٹ پڑی کہ باہر ٹینٹ جگ گیا ہے اور کچھ مہمان بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ جلدی جاؤ نہانے اور تیار ہو جاؤ۔“ کیونکہ ایک وہی باتھ روم تھا اور اسی اسٹور کے برابر میں تھا معتقلہ مجھے پوری طرح سے ڈرا چکی تھی۔

مگر اپنی عادت سے مجبور میں بھی تھی اسی لئے اسی باتھ روم میں شاور لینے چلی گئی اور خوف کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا پھر بھی خوف تھا کہ آپی رہا تھا عقیقے کے پروگرام کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے



دوسرے دن۔

وقت گزرتا رہا ہم سب اسٹڈی میں مصروف ہو گئے بس کبھی کبھی ملنے ملانے کا سلسلہ رہتا۔ اسٹڈی کی وجہ سے رکے بھی نہیں گئے تھے ہم لوگ۔ وہاں اس گھر میں تینوں ماموں کی فیملیز بخوشی رہ رہی تھیں میرے بی ایڈ کے امتحانات قریب تھے اور میرا بورڈ سرسید گریڈ کالج ناٹم آباد میں تھا۔ جو کہ بڑے ماموں کے گھر سے بہت قریب تھا پیدل کا راستہ تھا تو بڑی ممانی نے کہا۔

”شاہ فیصل سے آنے جانے میں بہت ناٹم ضائع ہوگا امتحانات ہمارے گھر سے دے دو حسن تمہیں ناٹم پر لانے جانا کر لے گا۔“

میں بھی وقت کی بچت کی وجہ سے وہاں چلی گئی اور امتحانات دینے لگی آخری پیر والے دن ہم سب نے پلان کیا کہ آج رات خوب بلا گائیں گے گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں۔ سوئیں گے اور بس رات بھر ہنسی مذاق کریں گے اور انشکریم بھی کھانے چلیں گے۔

جب میں آخری پیر دے کر آئی تو رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب انشکریم کھانے گئے رات سب اپنے اپنے پورشن میں چلے گئے۔ بڑے ماموں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے حسن بھی اپنی امی کے ساتھ فرسٹ فلور پر روم میں سو گیا ہم سب کزنز ڈرائنگ روم میں ہنسی مذاق کر رہے تھے ڈرائنگ روم کے دروازے کے اوپر خوب صورت سی گرل لگی ہوئی تھی اس گرل سے اس اسٹوڈنٹ کا گیت نظر آتا تھا اور میری نظر اس گیت پر لازمی ٹھہری جاتی تھی۔

میں بار بار اسی گیت کو دیکھ رہی تھی ہنسی مذاق سے فارغ ہو کر ہم تینوں اب لیٹ چکے تھے اور لیٹ کر باتیں کر رہے تھے رات کے تقریباً ڈھائی بجے ہوں گے ڈرائنگ روم میں زبرد کا بلب آن تھا پھر بیڑیوں پر بھی بلب آن تھا کافی روشنی تھی میں اُٹھی ڈرائنگ روم کا گیت کھولا اور ٹوائلٹ گئی۔

جیسے ہی میں ٹوائلٹ سے نکلی تو وہ قدم کے فاصلے پر فریج رکھا ہوا تھا اس کے ساتھ کوئی چیز کھڑی تھی جو کہ سیاہ لباس میں بلبوں تھی اس کے جسم پر سر موجود نہیں تھا باقی پورا جسم سیاہ لباس میں موجود تھا اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا تھا مسلسل۔

بیڑیوں پر لگے بلب سے اچھی خاصی روشنی آرہی تھی ساتھ ہی مین گیت انٹرنس پر بھی بلب آگیا ہوا تھا وہاں سے بھی روشنی آرہی تھی اور ڈرائنگ روم کی گرل سے بھی۔ اتنی روشنی تھی میں اسے بغور دیکھ رہی تھی اور وہ سرکٹ خلوک کا رخ بھی میری ہی جانب تھا میں ساکت واش روم کا گیت پکڑے کھڑی اسی خلوک کو دیکھے جارہی تھی وہ خلوک بس دو قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ میں انتہائی خوف زدہ تھی کہ یہ کیا چیز ہے اتنا کالا سیاہ لباس اور اس خلوک کے وجود پر سر نہیں ہے اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا ہے۔

میں انتہائی خوف زدہ اور پریشان تھی پسینے سے نہپا تھی خلوک سے آواز نہیں آرہی تھی سانس رک گئی تھیں میں نے اسی خلوک کو دیکھتے ہوئے ہی گیت بند کیا واش روم میں سے ہاتھ دھوئے اور اسی کو دیکھتے ہوئے میں جلدی سے ڈرائنگ روم کا گیت کھول کر اندر گئی اور اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ سب کزنز نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے بات کو ٹال کر انکھیں بند کر لیں سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

مگر ساری رات سونہ سکی۔ صبح نانی آگئیں ملنے، میں نے سب سے چھپ کر نانی کو بتایا رات کا واقعہ تو انہوں نے مجھے سب کو بتانے سے منع کیا کہ یہاں رہنے سے ڈرنہ جائیں۔

میں بری طرح خوف زدہ تھی بھائی کا وہیٹ کر رہی تھی بھائی کے آتے ہی میں اپنے گھر آ گئی۔

کافی دن تک اس خلوک کے خیال سے اپنے وجود کو بھاری پایا۔ اور بار بار وہ شے میری آنکھوں کے سامنے آرہی تھی۔

بہر حال میں اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں

تھی لہذا نمازیں میں نہیں چھوڑتی۔ بہت جلد خود لڑل کیا کہ اللہ نے ان تمام چیزوں سے طاقتور ہم کو بنایا ہے۔

لیکن جب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو وہ منظر ہوں میں آ جاتا ہے وہ شے آنکھوں کے منظر سے نکلتی۔

تین سال رہنے کے بعد مجبوراً ماموں کو وہ پوچھنا پڑا کیونکہ وہاں سب ہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ بات ہوتے ہی رہتے تھے لڑکی نے ان واقعات کو عید نہیں لیا تھا۔

ایک حادثہ ایسا ہوا کہ اس نے سب کی زندگی بدل دی۔

اس گھر کی روشنی بڑی ممانی جو کہ ایک خوش حال ہونے ہانے والی خاتون تھیں بہت ہی دوستانہ تھیں تھا ان کا سب سے۔ وہ ایک ہر دل عزیز خاتون تھیں کوئی بھی پور نہیں ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی 40 سالہ نوجوان خاتون جنہیں کوئی بیماری بھی نہ تھی بہت اکیلے تھیں بس یہ سوچا کہ اس سال اپنے بھائی بڑا میلاد کروں گی اسی سلسلے میں بڑے ماموں کہنے لگیں۔

”آپ صدر جانے سے پہلے مجھے پرانے محلے میں وہاں میلاد پڑھنے والی ایک خاتون ہیں بہت میلاد پڑھتی ہیں میں واپسی پر رفیق کے ساتھ آؤں گی۔“ (رفیق ماموں ان کے دیور ہیں) ممانی کو والی خاتون سے بات کرنے لگیں تو انہوں نے ان کو دیا کہ ان کے پاس ناٹم نہیں لہذا وہ میلاد کے ناٹم دے سکیں۔

بڑی ممانی بوچھل قدموں سے نانی کے گھر چلی گئیں ماموں نے کہا۔ ”بھابھی میں لچ کر کے آؤں گا آپ کچھ دیر تک جائیں۔“

بڑی ممانی اداس سی ہوئی تھیں کہ وہ میلاد کا ناٹم نہیں کروا سکیں گی بس کہنے لگیں کہ ”رفیق میں جانی ہوں ماموں کا ایک کزن آ گیا تھا اس کے

ساتھ بائیک پر آرہی تھیں جیسے ہی گلی سے نکل کر روڈ پر آئے وہ روڈ کافی تنگ بنا ہوا تھا۔ ایک رکشہ والے نے ایک دم رکشہ چلا کر ان کی بائیک کو ٹکرایا جس کی وجہ سے وہ روڈ پر گر گئیں۔ اور سامنے سے اسپید میں بس آرہی تھی اور وہ بس بڑی ممانی کا سر پکڑتی ہوئی چلی گئی۔ ان کا سر ختم ہو چکا تھا یہ خبر ایسی تھی کہ ہم سب کے لئے قیامت سے کم نہ تھی اتنے خطرناک ایکسیڈنٹ سے ہم سب لرز کر رہ گئے ان کے انتقال نے سب کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

کافی وقت لگا سب کو سنہلنے میں بہر حال کافی روحانی عالموں نے اس گھر کی وجہ بتائی اس حادثے کے پیچھے وہ گھر بڑی ممانی نے بڑے پیار سے سجایا تھا اس گھر کے مالک بڑے ماموں اور بڑی ممانی ہی تھیں۔ اس طرح کا حادثہ کبھی نہیں آیا۔ کیونکہ مجھے اس گھر میں بناسر کے سیاہ لباس میں ایک خلوک نظر آئی تھی۔ پھر بڑی ممانی کا ایکسیڈنٹ بھی ایسا ہوا کہ ان کا سر چل گیا چہرہ مری طرح ختم ہو چکا تھا۔

ان دونوں باتوں میں کوئی کنکشن ضرور ہے مگر کیا..... یہ میں نہیں جانتی۔

خیر ایک وقت آیا کہ ماموں نے وہ مکان فروخت کر دیا اور دوسرا مکان خرید کر اس میں شفٹ ہو گئے تھے۔

میری اپنے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ جب بھی کوئی نیا گھریلو تو اساتذہ ضرور کر لیں اور کسی اچھے روحانی عالم سے چیک ضرور کروائیں اور شفٹ ہونے سے پہلے قرآن خوانی یا پھر میلاد کی محفل بھی لازمی کروائیں۔

آج بھی اس خلوک کا ذکر مجھے خوف کی دنیا میں لے جاتا ہے آنکھوں کے پردے پر اس کا وجود سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام ایسی مخلوقات سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)



# اندھیرے سے اجالا

چوتھی قسط

ملک فہیم ارشاد۔ ڈی جی کوٹ فیصل آباد

خوف کی وادی میں اٹکھیلیاں کرتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جان کے رونگٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ڈالتی خیر و شر کی کھانی

حقیقت سے روشناس کرائی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

سر بلایا۔

”جب اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی انسان بنا۔ دھرم، مذہب ایک ہی تھا، صرف اللہ کو اپنا خالق و مانگا۔ ماننا لیکن پھر آبادی بڑھی کچھ جاہل انسانوں نے اللہ کے ساتھ شرک کرنا شروع کر دیا پھر کے بت بنا کر انہیں پوچنا شروع کر دیا اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے بتوں کی پوجا کرنا بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے جانوروں، سور، چاند، ستاروں کو پوچنا شروع کر دیا پھر اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے اپنے نبی اور رسول بھیجے جنہوں نے لوگوں کو سمجھایا اور اصل حقیقت کی طرف بلا یا جو رسولوں کے راستوں پر چلے وہ کامیاب و کامران ہو گئے آٹھ بھی دنیا ان لوگوں کا احترام کرتی ہے لیکن جو اللہ نے بھیجے ہوئے پیغمبر پر نہ چلے وہ بھی ایک عذاب کی نظر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ سب انسان اسی کی عبادت کریں اس کو ایک مائیں، ہر مشکل کو آسان کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

کئی لوگ وہاں موجود تھے کہ اچانک ایک ڈاکو بولا۔ ”نماز کے ذریعے انسان کا چہرہ اور دماغ تر و تازہ رہتا ہے نماز کے ذریعے ہی خون انسان کے دماغ تک پہنچتا ہے۔“ کر سچ ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ اب ٹھیک ہے ایک جہراگلی کی بات سنو کاویری اور ربیر کا بیاہ ہوگا۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ربیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ دونوں خوب صورت بھی ہیں جوڑی خوب چنے گی۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جیسا حادثہ کاویری کے ساتھ ہوا ہے ہمارے سماج میں کوئی اس کا ہاتھ نہ تھامتا، میں نے دیال انکل سے بات کی تو وہ مان گئے ربیر سے بات کی تو وہ چمپا رستم نکلا وہ امن ہی امن میں کاویری سے بے انتہا پریم کرتا تھا مگر بھی کہہ نہیں پایا اس حادثے نے خودی اس کا کام آسان کر دیا۔ ویسے میں نے ربیر سے کہا کہ اچھا ہی ہوا تم نے جی کے جیون میں کاویری سے اظہار پریم نہیں کیا ورنہ جی دیا کی طرح اس کی ہتھیار بھی کر دیتا۔“ سنتوش نے کہا تو عبداللہ بے اختیار رن پڑا۔ ”ویسے بھی اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”عبداللہ تم نماز اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے پڑھتے ہوتا۔“ سنتوش نے بظاہر پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“ عبداللہ نے اثبات میں

”وہ کیسے.....“ ایک اور بولا۔

”مثال کے طور پر ایک تین منزل بلند گھر ہے آپ کو شش کے ذریعے دوسری منزل تک تو پانی پہنچا سکتے ہیں لیکن تیسری منزل تک پانی بمشکل پہنچے گا اسی طرح انسانی جسم میں دل پمپ کی طرح کام کرتا ہے وہ جسم کے تمام حصوں تک تو خون پہنچا دیتا ہے لیکن دماغ تک ٹھوڑا بہت پہنچتا ہے لیکن جب انسان مجذوبے میں جاتا ہے تو اس کے دماغ تک بھی خون پہنچ جاتا ہے اسی لئے نمازیوں کے چہرے تر و تازہ رہتے ہیں پانی صحت معنوں میں تو چہرہ اس لئے خوب صورت ہوتا ہے کیونکہ انسان اللہ کا شکر جھکتے ہوئے کرتا ہے کیونکہ وہی ذات ہے جس کے آگے جھکا جاتا ہے۔“ عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔

”یہ تو تم نے بڑی اچھی اور حیران کن باتیں بتائیں ہیں۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”صحیح معنوں میں سنتوش انسان اللہ کی پسندیدہ مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہر چیز سے محبت کرتا ہے مگر انسان سے اللہ تعالیٰ بہت محبت کرتا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اور صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے لیکن انسان بھٹکا ہوا ہے مختلف فرقوں میں اور مذاہب میں..... دنیا کا ہر انسان وہ کسی بھی دھرم سے تعلق رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ اصل حقیقت اللہ ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو مسلم ہو یا عیسائی سکھ ہو یا ہندو..... لیکن پھر بھی وہ اللہ کے ساتھ کسی نہ کسی کوشریک شہمرا تا ہے لیکن پھر بھی وہ اتنا غفور و رحیم ذات ہے کہ ہماری غلطیوں کو تا ہیوں کو معاف کرتا رہتا ہے قدم قدم پر ہماری اصلاح کرتا ہے آخری سانس تک ہمیں توبہ کا موقع دیتا ہے لیکن انسان پھر بھی..... سوائے افسوس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔“ عبداللہ افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”کیا اللہ واقعی ہمیں بہت پسند کرتا ہے۔“ سنتوش کے لہجے میں حیرانگی مچاں تھی۔  
”ہاں..... بالکل..... دنیا میں جتنی بھی آسائشیں ہیں وہ اللہ کے صرف انسانوں کے لئے پیدا

کی ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پر تو اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب کو سیدھی راہ پر لے آئیں۔“ سنتوش کی اس بات پر عبداللہ سرکرایا۔

”تمہاری بات بالکل درست ہے سنتوش اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب انسانوں کو سیدھی راہ پر لے آئیں..... لیکن سنتوش اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے..... اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتا ہے اللہ کی عبادت کے لئے تو فرشتے ہی کافی ہیں وہ دن رات اللہ کا حکم بجالاتے ہیں وہ سوائے اللہ کی عبادت کے کوئی اور کام نہیں کرتے لیکن انسانوں پر اللہ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے انسانوں کو کچھ چھوٹ دے رکھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دودراہوں کا مسافر بنایا ہے ایک سفر نیکی کا ہے اور ایک سفر بدی کا، فیصلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے خود دونوں راستوں سے کسی ایک پر چلے، اب جب انسان نیکی کی راہ پر چلتا ہے تو راستے میں ہر جگہ بدی یوٹرن چھوڑتی ہے تاکہ انسان نیکی کا راستہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کرے لیکن اللہ تعالیٰ بھی نیکی پر چلنے والے کی ہل ہل رہنمائی کرتا رہتا ہے اور پھر نیکی پر چلنے والا انسان ہر بدی کو روکتا ہوا آخر کار اپنی اصل منزل کو پالیتا ہے پھر وہ فرشتوں سے بھی زیادہ مقام پالیتا ہے اور اگر بدی کے راستے پر چل پڑے اور گناہ کی حد کر دے تو وہ گناہوں اور بدی کا بادشاہ شیطان کے مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے باقی اگر انسان نیکیاں کرتا ہے تو اسے اپنی نیکیوں پر فخر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ بات انسان کو لے ڈوبتی ہے۔

انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ بہت گنہگار آدمی ہے اللہ کے سچے بندوں کی حالت ایسی ہی ہے وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں رہتے ہیں کہ شاید اللہ کو ہماری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہو، شاید مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی ہے

عبادت کا پلڑا دیکھا جائے تو سب سے بھاری مان کا ہے صرف اپنی ایک نادانی کی وجہ سے شیطان ہمیشہ اب دیکھو نہ اللہ کا غفور و رحیم شیطان کو بھی کھلا رکھ دیتا ہے اس کے برسوں کی عبادت کا دلہ دے دیا کی لگام مکی چھوڑ دی اس نے اللہ سے کہا تھا کہ وہ بے عبادت گزار لوگوں کو بھٹکاؤں گا اللہ نے بھی مکی اجازت دے دی تھی اب شیطان عبادت گزاروں کی طرف توجہ داتا ہی نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ حضرت محمد کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اللہ نے حضور کو شیطان کے ہر پیڑترے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے اور حضور نے اپنی امت کو شیطان کے پیڑتروں سے آگاہ کر دیا ہے اس لئے شیطان بھٹکے لئے لوگوں کو مزید بھٹکا تا ہے اور اللہ تعالیٰ قدم قدم کی اصلاح کرتا ہے یعنی ایسا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے اشارہ ہوتا ہے لیکن انسان سمجھنے کے باوجود انجان ہوتا ہے۔“ عبداللہ نے بتایا۔

”عبداللہ انسان کسی بھی عمر میں توبہ کر سکتا ہے جو مانی یا بڑھا ہے میں۔“ سنتوش نے مزید پوچھا۔  
بالکل اور یہ حقیقت ہے کہ انسان عمر کے ہر حصے میں توبہ کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہوا ہے یعنی کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ویسے ایک بات کہو سنتوش۔“ عبداللہ نے کہا۔  
”کیا۔“ سنتوش نے پوچھا۔  
”میں نے دیکھا ہے تمہارے چہرے پر ایک سی چمک ہے۔ ایسی چمک کسی عام آدمی کے لئے نظر نہیں آتی۔“ عبداللہ نے سنتوش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہی بات میرے گاؤں کے عبداللہ انکل بھی کہتے ہیں۔“ سنتوش نے کہا تو عبداللہ چونکا۔  
”عبداللہ.....“  
”ہاں..... تمہارے ہم نام وہ بھی مسلمان ہیں

وہ ہمارے گھر میں چوکیداری کی مزدوری کرتے تھے انہوں نے مجھے ایسا خوب صورت گفت دیا ہے جس نے ہر مشکل سے میری رکشہ اور دھڑکی ہے۔“ سنتوش نے بتایا اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی سنتوش کے موبائل کی رنگ ٹون جاگ اٹھی۔

☆.....☆.....☆

”سنتوش..... کالج میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔“ رنبیر نے کہا۔  
”تو..... میں کیا کروں.....“ سنتوش نے لفظ ”تو“ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔  
”تو کیا.....“ میں نے تو ویسے ہی کہہ رہا تھا.....  
”رنبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔  
”جہیں نئی لڑکیوں کی بڑی چتا ہے۔“ کا دیری نے غصے سے رنبیر کو آنکھیں دیکھا تھیں۔  
”ارے دیوی جی آپ کرو دھت تو کرو دھت ہو گئیں ہیں اب تو ہم جہنم کے پجاری ہیں۔“ رنبیر نے کا دیری کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

”تو پھر تمہیں نئی لڑکی کی چتا کیوں کھائے جارہی ہے۔“ کا دیری کا غصہ بدستور عروج پر تھا۔  
”ارے دیوی جی ہم تو آپ کے پجاری بن گئے ہیں۔“

پرتوں ہمارے گروپ کے باقی لڑکوں کے لئے تو دیوی کا ہر بند کرنا ہے کہ نہیں۔“ رنبیر نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ”تو اس کی چتا مت کر..... اپنا حال دیکھ کر ابھی سے اپنی ہونے والی چتا سے ڈر رہا ہے۔“ سنتوش نے کہا تو پھر سب ہنس پڑے اور کا دیری بھی جو غصے کی حالت میں تھی بے اختیار ہنس پڑی۔

”بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ چلو جیسے تمہاری اچھا۔“ رنبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔  
”ویسے کا دیری جی نے تو سب کو حیرت میں ڈال دیا وہ زیادہ سے ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا پر تو اس نے کبھی شک نہیں ہونے دیا ایک تھہیرا لکھا۔“



سریش نے کہا۔

”ہاں..... حیرانی تو مجھے بھی ہوئی تھی پر تو۔“ کاویری نے انتہائی کہا تھا کہ ایک سریلی آواز ان سب کے کانوں میں پڑی۔  
”ایکسیکوڑی۔“

سب نے آواز کی سمت دیکھا تو سنٹوش، سریش اور رنبیر کے دلوں نے دھڑکن شروع کر دیا سامنے ایک بے انتہا خوب صورت حسین و جمیل لڑکی کھڑی تھی اس کے ساتھ ساکشی بھی کھڑی تھی۔

”فریڈ زید یہ ہے انجلی..... اور انجلی میٹ مائی فریڈ سنٹوش، کاویری، رنبیر اور سب مائی برادر سریش ہے اور سنٹوش بھی میرا اکڑن ہے۔“ ساکشی نے ان سب کا تعارف کر دیا۔

”اور میرا نام ہے عبداللہ..... السلام علیکم۔“ عبداللہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولا۔

”نوسلم.....“ انجلی نے عبداللہ سے پوچھا۔  
”الحمد للہ.....“ عبداللہ غریب لہجے میں بولا۔

”عبداللہ یہ ہے انجلی.....“ ساکشی نے گہری نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کالج میں نئی آئی ہیں۔“ عبداللہ نے پوچھا۔

”ہاں.....“ انجلی نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

ساکشی بدستور عبداللہ کی طرف دیکھے جارہی تھی۔  
”انجلی ویکم مائی فریڈ زید گروپ.....“ ساکشی نے کہا تو انجلی مسکرا دی سنٹوش کو انجلی کے چہرے پر

مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ ”اسی شہر کی ہوتم انجلی۔“ سنٹوش نے پوچھا۔

”نہیں..... میرے ہجرتی کا اس شہر میں ٹرانسفر ہوا ہے۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”فریڈ زید..... Listen to me“ رنبیر نے تالی بجاتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آج رات کو میری برتھ ڈے ہے اسی کارن

میں سب دوستوں کو انوائٹ کرتا ہوں اسٹوڈنٹی کاویری کو۔“ رنبیر نے کہا تو سب ہنس پڑے۔

”تم بھی آنا انجلی..... OK۔“ انجلی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”آج نیوز پیپر کس کس نے پڑھا۔“ سریش نے ان سب سے پوچھا۔

”ایسی کیا خبر آگئی نیوز پیپر میں۔“ سنٹوش نے حیرانگی سے پوچھا۔

”رات پولیس کو پھر 6 لاشیں ملی ہیں، لاشوں کی حالت کافی خراب تھی، پولیس کا کہنا ہے کہ یہ کسی خون خوار جانور کا کام لگتا ہے۔“ سریش نے بتایا۔

”ویسے اب تو اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں آتی ہی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہر میں کوئی درندہ آن کھسا ہے۔“ سنٹوش نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”ویسے..... اس شہر میں جو درندہ تھا وہ تو ختم نہیں ہو گیا.....“ کاویری دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ سب نے حیرانگی سے سوالیہ نشان چھوڑا۔

”جی درندہ.....“ کاویری نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”ویسے میرے خیال میں یہ اسی بھیڑیے کا کام ہے جس نے اس رات جی اور اس کے ساتھیوں کی ہتھما کی تھی۔“

دیال اکل بتا رہے تھے کہ ہمیں بھی اس بھیڑیے کا ہی کام لگتا ہے مگر ابھی تک وہ بھیڑیا ان کے ہاتھ میں نہیں آیا۔“ سنٹوش نے کہا۔

”ہاں..... ہجرتی کا کہنا تو یہی ہے آئے دن انہیں لاشیں ملتی ہی رہتی ہیں جس دن سے اس بھیڑیہ نے جی کی ہتھما کی تھی۔“ رنبیر نے بھی سنٹوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔

چھوڑوان باتوں کو مجھے تو خوف آئے

لگا ہے..... کوئی اور بات کرو.....“ ساکشی نے منہ ہمارے ہوئے کہا۔

”آئی بڑی ہنگامی ملی۔“ رنبیر نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”عبداللہ تم بناؤ رہائی کے بعد کیسا محسوس کر رہے ہو۔“ ساکشی نے رنبیر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”خود کو فریش محسوس کر رہا ہوں۔“ عبداللہ کے اس جواب پر سب مسکرا دیے۔

”فریڈ زید آپ کا گروپ تو بہت دلچسپ ہے۔“ انجلی نے کہا۔

میں تو کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہوں۔“ رنبیر نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا تم نے۔“ کاویری نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

”وہ..... وہ.....“ ہکلاہٹ کے باعث رنبیر کے منہ سے انتہائی لفظ اور رنبیر کو ایک مرتبہ پھر قہقہوں کی بارش سننا پڑی۔

”دیکھو بس اس گیدڑ کا حال۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور ابھی سے یہ حال ہے شادی کے بعد تو یہ بالکل ہنگامی ملی بن جائے گا۔“ سنٹوش نے رنبیر کا مذاق اڑایا جواباً پھر قہقہے کو بجھانے لگے۔

☆.....☆.....☆

برتھ ڈے پارٹی میں اس تپش کی گونج نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا ارد گرد پھیلے لوگ اس طرف دیکھنے لگے تھے۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے رنبیر اور کاویری نے ایک کاٹا تھا اور سب علیحدہ علیحدہ گروپس بنا کر اپنی اپنی باتوں میں لگ گئے تھے۔

”پارٹی تو کافی شاندار دی ہے رنبیر نے۔“ انجلی نے ایک کاغذ آمنہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ دراصل ہونے والی ہتھی پر عرب ہمارا ہے۔“ سنٹوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”عبداللہ نہیں آیا.....“ ساکشی نے پوچھا۔  
”پہنچ نہیں..... ویسے رنبیر نے اسے انوائٹ تو کیا تھا۔“ سنٹوش نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“  
”نہیں بس ویسے ہی۔“ ساکشی نے تیز لہجے میں کہا۔

”ویسے آج دونوں کی جوڑی بہت سندرلگ رہی ہے۔“ سریش نے ان سب کی توجہ کاویری اور رنبیر کی طرف کرائی جو مہمانوں میں گھرے ہوئے تھے۔

”ہاں واقعی جوڑی تو لا جواب ہے۔“ ساکشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لو سنٹوش رنبیر سن ہی میں کاویری سے پریم کرتا تھا پر تو کہنے کی ہمت نہ کر سکا جی والا حادثہ پیش آیا تم نے دیال اکل سے بات کی اور بات بن گئی۔“ سریش نے کہا۔

”رنبیر ایک اچھا انسان ہے اور اچھے انسانوں کی اوپر والا بغیر کبھی غمی مدد کرتا ہے۔“ جواباً سنٹوش مسکرایا۔

”سنٹوش ہمارا یہ آخری سال ہے اس کے بعد تم کیا کرو گے۔“ ساکشی نے پوچھا۔

”اس کے بعد میں گاؤں میں چلا جاؤں گا ہجرتی کا ہاتھ بناؤں گا۔“ سنٹوش نے کہا۔

”تو ہجرتی تم شہر میں ہی جاب کر لو۔“ ساکشی نے کہا۔

”نہیں ساکشی اوپر والے کا دیا سب کچھ تو ہے میرے پاس ویسے بھی مجھے شہر کی زندگی سے زیادہ گاؤں کی زندگی پسند ہے۔“ سنٹوش نے اپنے من کی بات کہی۔

”وہ کیوں.....؟ شہر کی زندگی تو زیادہ اچھی ہے۔ یہاں ہر چیز موجود ہے۔“ اس دفعہ انجلی نے کہا۔

”یہاں کے لوگوں میں کوئی پریم نہیں ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے گاؤں میں جب کسی کا دیہانت ہوتا ہے تو پورا گاؤں اس گھر میں جمع ہو جاتا ہے پر تو شہر



”اب کہاں کی تیاریاں ہیں۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”ہم ذرا باہر گھومنے کے لئے جارہے ہیں۔“ کاویری رنبیر کے بولنے سے پہلے تیزی سے بولی۔

”کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں۔“ سنتوش نے مذاقاً پوچھا۔

”جی نہیں۔“ کاویری نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالنے ہوئے کہا تو انپکٹر دیال، رنبیر اور سنتوش مسکرانے لگے۔

”ٹھیک ہے بیٹا تم دونوں جاؤ۔“ انپکٹر نے کہا تو وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

”دیکھتا ہوں کہ تم کیسے ٹھیک ہو گیا رنبیر اور اسے کچھ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے۔“ انپکٹر دیال نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل.....“ سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔ رنبیر اور کاویری گاڑی میں آکر بیٹھے رنبیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

”مجھے حیرانگی اس بات کی ہے کہ رات کو میں بے ہوش کیسے ہو گیا.....“ رنبیر پریشان کن لہجے میں بولا۔

”کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے رنبیر۔ خیر تم چھوڑو یہ بتاؤ کہ اگر تم مجھ سے پریم کرتے تھے تو پھر کہا کیوں نہیں۔“ کاویری نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”تم ہر سے جی کے ساتھ رہتی تھی اس لئے میں نے سوچا تم جی سے پریم کرتی ہو اس لئے۔“ رنبیر نے بتایا۔

”جی مجھے پسند کرتا ہے یہ تو مجھے بھی پتہ تھا پرنتو پھر جب اس کا اندرونی روپ میرے سامنے آیا تو وہ مجھے کسی بھیڑیے سے کم نہ لگا رنبیر وہ بھیڑیا.....“

بہت خوف ناک تھا جس نے جی کی ہتھیا کی تھی میرے اوپر اتنا خوف سوار ہو گیا تھا کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔“ کاویری کی زبان پر لفظ بھیڑیا آتے ہی خوف طاری ہو گیا تھا۔

”حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس بھیڑیے نے تم پر حملہ کیوں نہیں کیا۔“ رنبیر نے کہا۔

”لو ہوئی بھی آگیا۔“ رنبیر نے گاڑی پارک کی دونوں ہوٹل کے ہال میں آکر بیٹھ گئے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کاویری نے اپنے پرس سے گلاب کا ایک پھول نکال کر رنبیر کی طرف بڑھا دیا۔

”Thanks“ رنبیر نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کا پھول پکڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”میں تمہارے لئے کچھ لایا ہی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں کھانے کا بل تم پرے کر دینا۔“ کاویری نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو رنبیر بس مسکرا دیا۔

”وہ تو دیے بھی میں نے ہی پے کرنا تھا۔ پرنتو میں گفت کی بات کر رہا تھا۔“ رنبیر نے کہا۔

”کوئی بات نہیں کل دے دینا ویسے بھی کل ویلنٹائن ڈے ہے.....“ کاویری نے مسکراتے ہوئے کہا..... اور پھر کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

”کچھ دیر پیدل چلتے ہیں۔“ کاویری نے کہا۔

”As You Wish“ رنبیر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”Thanks“ دونوں سڑک کے ایک طرف چلنے لگے۔

”رنبیر سنتوش کے چہرے پر میں نے ایک عجیب سی چمک دیکھی ہے مجھے تو وہ کوئی مہمان انسان لگتا ہے۔“ کاویری نے رنبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں بالکل۔“ کاویری وہ واقعی مہمان انسان ہے وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا ہر انسان کی مدد کرتا ہے چاہے وہ کسی بھی دھرم کا ہو پرنتو خود یہ کہتا ہے کہ بھگوان صرف ایک ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا نہ اس کا

کوئی باپ ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے وہ بالکل اکیلا ہے۔“ رنبیر نے کہا۔

”پرنتو ہمارا دھرم تو یہ نہیں کہتا۔“ کاویری نے کہا۔

”وہ کہتا ہے کسی بھی دھرم کی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ بھگوان دو ہیں، دنیا کی ہر کتاب میں یہی لکھا ہے کہ بھگوان صرف ایک ہے یہ ہمارے پنڈت لوگ ہیں جو ہمیں ایسی باتوں میں الجھاتے ہیں کہ بہت سارے بھگوان ہیں، ہم تو جانوروں تک کی پوجا کرتے ہیں اب جانوروں تو بھگوان نہیں ہو سکتا، بھگوان کی تعریف ان سب سے الگ ہے وہ یہ کہ وہ ایک ہے۔“ رنبیر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ایسی باتیں تو مسلم لوگ کرتے ہیں۔“ کاویری نے کہا۔

”ہاں کرتے تو مسلم لوگ ہی پرنتو کاویری یہ باتیں سچ پتی ہیں۔“ رنبیر نے کہا۔

”چھوڑو ان باتوں کو وہ دیکھو آسمان پر آج چاند پورا ہے۔“ کاویری نے رنبیر کی توجہ چاند کی طرف کرواتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لو رنبیر اس چاند نے اس رات کو کتنا مسند بنایا ہے۔“ کاویری شاعرانہ لہجے میں بولی۔

”کک..... کک.....“ کاویری..... رنبیر نے ہلکاتے ہوئے کاویری کو پکارا۔

کاویری بولتے بولتے رکی اس نے حیرت سے رنبیر کی طرف دیکھا رنبیر کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہو چکا تھا آنکھوں سے پانی بہنے لگا آنکھوں کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی پھٹ پڑیں گی جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ چاند کو گھور رہا تھا۔

”رن..... بب..... کک..... کک.....“

کیا ہوا تمہیں۔“ کاویری گھبرا کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی، اس نے رنبیر کو بازو سے پکڑا اور تڑپ کر بولی۔

”یہ..... یہ تمہیں..... کک..... کیا ہو رہا ہے۔“

رنبیر نے کاویری کو سرخ انگارہ اٹھاتی آنکھوں سے گھورا اور ایک زوردار جھٹکا دیا کاویری چیختی ہوئی کئی فٹ پیچھے جا گری رنبیر کی نظریں چپکتے ہوئے چاند پر لگی ہوئی تھیں اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا کاویری کراہتے ہوئے سڑک سے اٹھ کر کھڑی ہوئی رنبیر نے اسے بڑا حیرت انگیز دھکا دیا تھا اس کے سر کے پچھلے حصے پر ایک اور سر ابھرا آیا تھا جس کی وجہ سے درد نے اس کے سر میں بسیرہ کر لیا تھا کاویری نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا اور دوبارہ رنبیر کی طرف بڑھی اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ آخر رنبیر کو ہو کیا رہا ہے وہ رنبیر کے قریب پہنچی۔

”سچ..... چل..... چلی جاؤ یہاں سے کاویری۔“ رنبیر اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے چلایا۔

”رن..... رنبیر..... یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔“ کاویری نے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”م..... میں کہتا ہوں..... چل..... چلی جاؤ یہاں سے۔“ رنبیر دوبارہ چلایا چکانک اس کے منہ سے غراہٹ کی آواز نکلی ایسی غراہٹ صرف بھیڑیے کی ہی ہو سکتی تھی رنبیر نے آسمان کی طرف دیکھا اور زوردار انداز میں چلایا اور پھر وہ زمین پر جا گرا۔

”رن..... کک.....“ کاویری چلائی اور تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”کک..... کک.....“ کاویری درد کے کارن میرا سر پھٹ جائے گا.....“ میری مدد کرو۔“ رنبیر تکلیف کے باعث لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”تت..... تت.....“ تم چننا مت کرو میں ابھی کچھ کرتی ہوں۔“ کاویری بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ ابھی اور تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگی وہ اب بھاگتے ہوئے رنبیر کی ہی تھی وہ دوڑتی دوڑتی اس ہوٹل کے قریب پہنچی ہوٹل کے باہر دوڑنے کا گاڑی کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

”دو..... دیکھئے..... پپ..... پپ.....“ میری ہیلپ کریں۔“ کاویری ان دونوں لڑکوں کے



قرب جاکر کانتے ہوئے ہونٹوں سے بولی وہ دونوں لڑکے کاویری کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 ”جی کہیے۔“ ہم آپ کی کیا ہیلپ کر سکتے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کاویری کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... ہم..... مر جائے گا۔“ پپ پلیر میرے ساتھ چلیے۔“ کاویری ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے ساتھ بولی۔

”دیکھئے شانت رہئے اور بے خوف ہو کر بات کریں ہم آپ کی ضرور ہیلپ کریں گے آخر یہ تو چلے بات کیا ہے۔“ دوسرے لڑکے نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ..... وہ..... مر جائے گا اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے وہ وہاں سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔“ کاویری بچوں کے انداز میں روتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے چلئے.....“ کاویری ان دونوں کے ہاں کرنے پر پیچھے کی جانب بھاگی اور وہ دونوں لڑکے بھی اس کی پیروی میں بھاگے بھاگتے بھاگتے کاویری اس جگہ پہنچی جہاں وہ رنیر کو چھوڑ کر گئی تھی لیکن وہاں رنیر کہیں بھی موجود نہیں تھا۔

”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ دوسرے لڑکے نے کاویری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ..... یہی تو تھا۔“ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”پرنتو یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ پہلے لڑکے نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔ دور دور تک سنسنائی پھیلی ہوئی تھی۔

”ابھی تو رنیر یہیں پڑا تڑپ رہا تھا۔“ کاویری نے انگلی کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں رنیر تھوڑی دیر پہلے تڑپ رہا تھا۔

”اور کیا ہوا تھا اسے.....“ دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

کی توجہ چاند کی طرف کرواتا تو اس کی حالت بری ہوئی شروع ہوئی اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ تکلیف میں ہو اس کے منہ سے جانوروں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔“ کاویری نے بتاتے ہوئے کہا۔  
 ”جانوروں کی آوازیں۔“ پہلے لڑکے نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں جیسے بھڑیے کی غراہٹ ہو، میں اس کی طرف بڑھی اس نے مجھے زوردار دھکا دیا ایسا دھکا جو عام انسان نہیں دے سکتا تھا وہ تڑپتے ہوئے زمین پر گر گیا اور میں ہیلپ کے لئے آپ کو لے آئی پرنتو وہ اب یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔“ کاویری نے ساری بات بتائی۔

”کیا وہ آپ کا بچہ تھا۔“ پہلے لڑکے نے ہی پوچھا۔ کاویری نے جواب دینے کی بجائے حیرانگی سے ان دو پہلی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا جو درخت کی شاخوں کے پیچھے سے ان تینوں کو گھور رہی تھیں۔

”وہ..... وہ..... آنکھیں کس کی ہیں۔“ کاویری نے دوسرے لڑکے کے پیچھے بڑے سے درخت کی طرف اشارہ کیا دونوں لڑکوں نے حیرت سے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا اسی وقت فضاء میں ایک غراہٹ کی آواز کوئی درخت پر پٹی میں اس چیز نے ان دونوں لڑکوں پر چلا تگ لگادی کاویری کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی یہ وہی کارلے رنگ کا بھیڑیا تھا جسے کاویری پہلے بھی دیکھ چکی تھی کاویری تیزی سے واپسی کے راستے کی طرف بھاگی ڈر کا غلبہ اس پر مسلط ہو چکا تھا اس کے قدم خود بخود تیزی سے اٹھ رہے تھے کافی دیر بھاگنے کے بعد وہ رکی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کی نظر جہاں تک جانی تھی وہاں تک سڑک پر سنسنائی پھیلی ہوئی تھی کاویری کا پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا اور خوف کے باعث جسم کا نپ رہا تھا سر کی نیس بڑی تیزی سے چل رہی تھیں کئی سوالوں نے اس کے گرد گھیر ڈال دیا۔  
 ”رنیر کہاں گیا؟ وہ بھیڑیا اچانک کہاں سے

آگیا؟ کیا دونوں لڑکے اس بھیڑیا کے خوراک بن گئے۔“ ان سوالوں کو سوچتے ہوئے وہ گھبرا گئی اچانک ایک خوف ناک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کودا۔  
 ”نن..... نن..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ ڈرتے ڈرتے خود سے ہلکا ہوا ہوئی اس کا ذہن کچھ اور ہی جواب دے رہا تھا اس کے ذہن میں جو خوف ناک خیال آیا تھا وہ یہ تھا کہ کہیں رنیر ہی تو وہ بھیڑیا نہیں ہے لیکن اس کا دل دوسوں میں گر گیا تھا وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی اگر رنیر بھیڑیا نہیں ہے تو پھر رنیر کہاں گیا؟ کہیں اس خوف ناک بھیڑیے نے تو اس کا شکار نہیں کر لیا؟ ایک اور خوف ناک خیال اس کے ذہن میں ابھرا لیکن پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہ تھی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں دواں تھے وہ ہونٹ کے کافی قریب آ چکی تھی وہ ہونٹ پہنچ کر انیسٹر دیال کو انفارم کرنا چاہتی تھی۔

اچانک اسے پاس ہی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹک کر رکی اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا جھاڑیوں میں کوئی چیز موجود تھی اچانک کاویری کے کانوں میں ایک غراہٹ کی آواز پڑی اچانک جھاڑیوں میں سے وہی بھیڑیا نکلا اس نے وہی سے کاویری پر چلا تگ لگائی کاویری نے ایک زوردار چیخ ماری اور ہونٹ کی طرف بھاگنے لگی غراہٹیں فضاء میں گونجیں کاویری نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی سنی گم ہوئی خوف میں مزید اضافہ ہو گیا پیچھے تین بھیڑیے تھے جو اس کا پیچھا کر رہے تھے کاویری نے پرس سے کارکی جانی نکالی جو رنیر نے ہونٹ سے باہر نکلتے وقت اسے پکڑا دی تھی پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے قریب پہنچنے پر اس نے ریوٹ سے گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اس نے پہلے ہی سے گاڑی اسٹارٹ کر کے گاڑی ریورس کی اور پھر اسپید کے ساتھ گاڑی آگے بڑھادی ان تینوں بھیڑیوں میں سے ایک بھیڑیا اچھلا اور حیران کھڑے ہونٹ کے چوکیدار کو لیتا ہوا ہونٹ کے ہال میں جا کر باقی

دو بھیڑیے کاویری کی گاڑی کے پیچھے لگے رہے کاویری نے گاڑی فل اسپید پر چھوڑ دی تھی دونوں بھیڑیوں کی رفتار بھی بہت زیادہ تھی وہ لمبی لمبی جست لگا کر کاویری کی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے گاڑی کے قریب پہنچتے پر ان دونوں بھیڑیوں نے لمبی جست لگائی اور گاڑی کی چھت پر جا کر گئے کاویری کے اوسان خطا ہو گئے اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی ان میں سے ایک بھیڑیا گاڑی کی وینڈ اسکرین سے ہوتا ہوا گاڑی کے پونٹ پر آیا کاویری کے منہ سے بے اختیار ایک زوردار چیخ نکلی بھیڑیے نے اپنا سر گاؤں کی وینڈ اسکرین پر دے مارا گاڑی کی وینڈ اسکرین پر کڑی کا جالا سا بن گیا کاویری نے زوردار چیخ ماری اور آنکھیں بند کر کے بریکس پر مضبوطی سے تھم رکھ دیئے گاڑی کا جھٹکے سے رکی اور دونوں بھیڑیے غراتے ہوئے سڑک پر جا کر گئے کاویری نے آنکھیں کھولیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل پھلسایا تو رکر باہر آ جائے گا۔

اسی وقت کاویری کے ذہن نے ایک ترکیب کا سہارا لیا اس نے تیزی سے گاڑی کا پہلا گیر لگا کر کچھ چھوڑا گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی گاڑی دونوں بھیڑیوں کو پکچتی ہوئی آگے بڑھ گئی دو خوف ناک غراہٹیں فضاء میں گونجیں کاویری نے بیک مرر سے دیکھا دونوں بھیڑیے تڑپ رہے تھے کاویری نے سکھ کا سانس لیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا لیکن اسے رنیر کی فکر ہو رہی تھی وہ پریشان ہی ہو گئی پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن اس نے رنیر سے جی محبت کی تھی اور اس نے بریکس لگا کر اس وینڈ میں جھلا ہو گئی کافی دیر وہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی بلا غراس نے پیچھے جا کر رنیر کی مدد کرنے کا سوچ لیا اس نے گاڑی تھمائی اور موت کے منہ میں چل پڑی ڈر بھی تھا لیکن محبت کا جوش بھی تھا سڑک پر مردہ بھیڑیوں کو بچا ہوا بی وہ آگے بڑھی اچانک کار کی چھت پر کوئی چیز دم سے گری اور کاویری کے دل کو کچکا سا لگا۔“ یہ..... یہ..... لگ..... کیا.....“ وہ خوف کے باعث ہلکانی۔

اجاچک ایک غراہٹ کی آواز گونجی اور کاویری کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی وہ سمجھ گئی چھت پر تیسرا بھیڑیا بھی موجود تھا کاویری نے دوبارہ پہلے والا پیئیر آزمایا کی سوچنی یہ سوچتے ہی اس نے زبردست بریکس لگائیں گاڑی کی چھت پر موجود بھیڑیا غراتا ہوا سڑک پر جا کر کاویری نے تیزی سے وقت ضائع کئے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی بھیڑیا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا کاویری کا اندازہ تھا کہ یہ بھیڑیا بھی دوسرے بھیڑیوں کی طرح پھلا جائے گا مگر کار کے نزدیک آتے ہی وہ بھیڑیا اچھلا اور گاڑی کے بونٹ پر جا بیٹھا کاویری کو اورو تو کچھ نہ سوچا اس نے گاڑی کا اسٹیرنگ دائیں بائیں گھمانا شروع کر دیا لیکن بھیڑیے کے بچے مضبوطی سے گاڑی کے بونٹ پر جتے ہوئے تھے بھیڑیے نے مگزی کا جالائی وڈ اسکرین پر اپنا ہاتھ مارا وڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی بھیڑیے نے بھڑوں کے بچے بونٹ پر لٹکے بھیڑیے نے دونوں ہاتھوں سے کاویری کی گردن پکڑ لی اور کاویری اسٹیرنگ چھوڑ کر اپنی گردن چھوڑنے لگی۔ گاڑی اب آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی تیز رفتاری گاڑی سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں داخل ہو گئی اور ایک موٹے درخت سے جا ٹکرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاویری کا سر اسٹیرنگ سے جا ٹکرایا اور بھیڑیا غراتا ہوا درخت سے جا ٹکرایا کاویری کے سر سے خون فوارے کی مانند ابل پڑا اور بھیڑیا بھری طرح زخمی ہو گیا بھیڑیا کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے چپکتے چاند کی طرف..... آؤں..... بھیڑیے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیے کے ذم تیزی سے بھرنے لگے بھیڑیا نے خون میں نہائی کاویری کی طرف دیکھا اور پھر جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور جھاڑیوں میں گھس گیا غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دن کے اجالے نے ہر طرف پھیلتا شروع کر دیا تھا مگر رات کے اندر جیسے نے ابھی اپنی حکومت مکمل طور پر نہیں چھوڑی تھی شہری زندگی آدھی سے زیادہ ابھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی آسمان پر پرندوں کے

غول نظر آ رہے تھے ایسے میں وہ سفید رنگ کی کار اس صاف سڑک پر جا رہی تھی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا وہ کئی گھنٹوں سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اب گاڑی اس نے جکی سڑک پر اتاری تھی وہ لڑکا بہت پریشان نظر آ رہا تھا پھر اس لڑکے نے اپنی کار ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے روک دی وہ لڑکا گاڑی سے باہر نکلا اور اس بوسیدہ سے مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا وہ پہلے کمرے سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا اس کمرے میں ایک بد صورت بوڑھا فرش پر آٹھ گھنٹوں بند کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اور منہ میں کچھ بڑا بڑا ہاتھ لڑکا ایک طرف فرش پر پھونک مار کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور اس لڑکے کی طرف دیکھا۔

”کہو مور کھ کیا خبر لائے ہو.....“ اس بوڑھے نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

”سادھو جی آج..... آج مجھے اپنی آنکھوں پر دوشاں نہیں ہو رہا آج میں نے ایسا منظر دیکھ لیا ہے کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔ پرتو آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہ آیا۔“ وہ لڑکا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”کیا دیکھا تم نے۔“ سادھو رنگا نے بدستور گرج دار لہجے میں پوچھا۔

”وہ دونوں لڑکا اور لڑکی گھر سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے میں نے ان کا تعاقب کیا وہ دونوں تھوڑی دیر بعد ایک ہوٹل میں چلے گئے کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں باہر آئے اور پیدل ایک طرف چلنے لگے میں نے آپ کے دیئے ہوئے پانی کے چھیننے اپنے کپڑوں پر ڈال لئے اب مجھے کچھ فتن ہی محسوس ہونے لگی تھی میں ڈرتے ڈرتے ان دونوں کے قریب چلا گیا پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں کو میری موجودگی کا بالکل بھی پتہ نہ چلا حالانکہ میں ان دونوں کے بالکل قریب تھا وہ دونوں کچھ سے تک پریم کی باتیں کرتے رہے پھر اس لڑکی نے لڑکے کی توجہ چاند کی

طرف کرائی چاند کو دیکھ کر لڑکے کی حالت غیر ہونے لگی چہرہ سرخ، آنکھیں پھٹنے کو لگی تھیں وہ چوہے ہوئے زمین پر جا کر لڑکی مدد کے لئے ہوٹل کی طرف بھاگی اسی سے میں ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا یہاں تک کہ وہ لڑکا ایک دفعہ پھر خاموش ہو گیا۔

”ہم سن رہے ہیں بولو تم نے کیا اور دیکھا۔“ سادھو نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا وہ لڑکا (زنبیر) یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس نے ایک زوردار چیخ ماری اس نے اپنے سر کو تمام لیا اس کی آنکھیں مکمل طور پر سرخ ہونے لگیں اس کے کپڑے اچانک پھٹنا شروع ہو گئے جسم کے بال تیزی سے بڑھنے لگے چہرے کے خدو خال بدلنے لگے چہرے پر بھی بالوں کا اضافہ ہونے لگا اب وہاں اس لڑکے کے بجائے ایک بہت بڑا اور خوف ناک بھیڑیا کھڑا تھا جس کے پیچھے انسانی شریہ تھا۔ بھیڑیے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیے نے میری طرف دیکھا میں خوف کے کارن اس سے ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا جب بھیڑیے نے میری طرف دیکھا تو خوف کے کارن میرے پسینے جھوٹ گئے پرتو پھر بھیڑیے نے سڑک کی دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا میں سمجھ گیا کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا سڑک کے دوسری طرف قدموں کی آواز سنائی دی وہ لڑکی (کاویری) کسی کو مدد کے لئے بلا کر لائی تھی بھیڑیے نے ایک حیران کن لمبی چھلانگ لگائی اور ایک بڑے سے درخت پر چڑھ کر چھپ گیا۔“

وہ لڑکا رنگا کو ساری بات بتاتا رہا اور رنگا بڑے غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

”خوب بہت خوب..... تم نے اچھا کام کیا میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوا ہوں۔“ رنگا خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”سادھو جی میں حیران ہوں ایسے حیران کن منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ایک

انسان اتنا خوف ناک درندہ کیسے بن سکتا ہے اور پھر وہ درندہ کسی کو کالے تو وہ بھی اسی کے جیسا بن جائے..... اف میرے بھگوان۔“ وہ لڑکا اپنے سر کو پکڑتے ہوئے بولا۔

”تم ان جھیلوں میں نہ پڑو..... وہ لڑکا زنبیر کہاں ہے۔“ رنگا نے کہتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... وہ میری کار کی ڈکی میں ہے۔“ لڑکے نے بتایا۔

”تم نے واقعی مجھے خوش کر دیا اب تمہیں اس کام کی قیمت بھی ملنی چاہئے۔“ رنگا نے کہا اور کمرے کی دیواری کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اچانک دیوار پر ایک سایہ سا نمودار ہوا اور تیزی سے حیران پریشان اس لڑکے کی طرف بڑھا اور اپنا گھبراہٹ اس لڑکے کے ارد گرد ڈال لیا اب وہ لڑکا اس سایے میں مکمل طور پر گم ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ سایہ علیحدہ ہوا تو ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ زمین پر جا گر۔

”تم اپنا کام تو جانتے ہو ناں.....“ سائے میں سے آواز خارج ہوئی۔ ”اچھی طرح.....“ رنگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پورے شہر میں ایک ہی خبر پھیلی ہوئی تھی۔

”ایک خوفناک بھیڑیے نے ہوٹل میں موجود 5 لوگوں کی بڑی بے دردی سے تھپا کر دی۔“

”تقصیلات کے مطابق ہوٹل میں اچانک ایک خوفناک بھیڑیا آیا اور اس نے وہاں خون کی ہولی مچا دی ایک ڈکی کے بیان کے مطابق سب لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ ہوٹل کا کیروینی دروازہ ٹوٹ کر اندر آگرا ہوٹل میں موجود سب لوگ حیرانگی سے اس طرف دیکھنے لگے اچانک ایک کالے رنگ کی جاندار چیز اندر داخل ہوئی خدو خال اور شریہ کے لحاظ سے وہ بھیڑیا ہی لگتا تھا اس خوف ناک بھیڑیے کو دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں وہ ایک بہت خوف ناک بھیڑیا تھا جو عام بھیڑیوں سے شریہ کے لحاظ سے بہت بڑا تھا بھیڑیا اٹھارہ انچ کی آنکھوں سے سب کو گھور رہا تھا بھیڑیے نے

حیران کھڑے ایک آدمی پر چلا تگ لگائی اور اپنے نوکیلے نچے اس آدمی کے سینے میں گاڑ دیئے جنھوں سے ہوٹل کاٹپ اٹھا جو جگہی بھڑپے کے سامنے آتا مارا جاتا خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بھڑیا دہاں سے چلا گیا ہوٹل سے تھوڑی دور آگے کھتی ہوئی دو آدمیوں کی لاشیں بھی پولیس کٹیس ہیں پولیس نے ان کی پہچان کر لی ہے رنجیت اور ویش نامی یہ دونوں آدمی بھی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے اس جائے حادثہ سے تھوڑی دور آگے ایک ڈبیج کار اور اس میں موجود ایک بے ہوش لڑکی لی تھی جواب اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔“

کریاں تنگ آنے والے لمحے میں بولا۔  
 ”بس اسقدر تم تو ابھی سے ہمت ہار گئے ابھی  
 تو میں نے تمہیں مزید تنگ کرتا ہے اس چھتر کا بدلہ ابھی  
 پورا نہیں ہوا..... ابھی تو میں نے تمہارے سپوت کے  
 چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے ہیں۔“ رگنا زہریلے لہجے  
 میں بولا۔

اتنا کہ کر رگھو نے انیسویں دیاں کی دائیں طرف  
کی دیوار کی طرف دیکھا اور وہ دیوار کسی اسکرین کی  
طرح روشن ہو گئی اس اسکرین پر وہ منظر نظر آنے لگا  
جب رنبیر اور کادیری ہوٹل میں کھانا کھانے کے  
بعد پیدل تفریح کے موڈ میں نکلے تھے اور پھر جب  
رنبیر بھڑیا بنا اس نے دواؤں میں پر حملہ کیا وہ دونوں  
آدی بھی اسی کی طرح بھڑیا بنے وہ سارے منظر دیکھ  
کر انیسویں دیاں دنگ رہ گیا۔

بے جان سا کرسی پر پڑا ہوا تھا۔  
 ”یہ..... یہ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ.....  
 کلک..... کیا کیا۔ تب..... تجھ تو میں نے تمہیں مارا تھا  
 پر تو تم نے میرے بیٹے کو مزا اکیوں دی۔“ انیسٹر دیال  
 بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم نے بھی تو میری برسوں کی عزت کو خاک میں ملایا تھا اب تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے اور میں تمہیں روزِ انہ ایسا پھل دیکھاؤں گا جیسا میں نے تمہیں ابھی ابھی دیکھایا ہے۔“

”دیکھو..... بھگوان کے لئے میرے بیٹے کو چھوڑ دو چاہے تو میری جان لے لو۔“ اسپنڈر دیال روتے ہوئے بولا۔

”پرنتو وہ دوبارہ بھیڑیا تو نہیں بنے گا ناں۔“  
سپیکٹر دیال نے پوچھا۔  
”اس کے لئے انہیں رات کے سسے وہاں رکنا  
پڑے گا اسی مکان میں خون سے رنگا ایک خنجر ہے وہ



لئے جارہا ہے میں اس کے کام آؤں گی آپ نے سنا ہی ہوگا ایک سے بھلے دو۔" انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "نہیں انجلی تم میرے ساتھ نہیں جاسکتی وہاں بہت خطرہ ہے۔ شاید میں نہ لوں۔" سنٹوش نے بھی لٹی میں سر ہلایا۔  
 "اگر تم زندہ واپس لوٹے تو مجھے ساری عمر اس بات کا دکھ رہے گا کہ بھگوان نے ایک موقع دیا ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔" سنٹوش نے گنوا دیا۔  
 "ہم ضرور کامیاب ہوں گے میں ہر حال میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" انجلی خدی بچے کی طرح بولی۔  
 "پر تو تمہارے ماتا پتا کیسے مانیں گے۔" سنٹوش نے پوچھا۔  
 "اس کی چٹا تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ایک سھنے کے بعد تمہیں یہیں ملوں گی۔ وہ بھی گاڑی سمیت۔" انجلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 "ٹھیک ہے جیسے تمہاری اچھا۔" سنٹوش نے ہار مانتے ہوئے کہا اور انجلی مسکراتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئی۔  
 "ٹھیک ہے انکل میں بھی ماما جی اور ماما جی سے کوئی بھانہ بناتا ہوں۔" سنٹوش نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔  
 "بیٹا مجھے بھی معاف کر دینا میں تمہیں موت کے منہ میں نہ بچ رہا ہوں۔"  
 "ایک دوسرے کے کام آنا ہی انسانیت ہے یہ عبد اللہ کا کہنا ہے اور ویسے بھی آپ چننا تمہیں میرے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی ہلکتی ہے۔" سنٹوش نے کہا اور انجلی دیاں کے آفس سے باہر نکل آئی۔  
 "تقریباً ایک سھنے بعد سنٹوش اور انجلی گاڑی میں بیٹھے آند پور گاڑی کی طرف جارہے تھے۔  
 "تو مل گئی اجازت۔" سنٹوش نے پوچھا جو ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا انجلی

ساتھ اس سفر پر کیوں جارہی ہو۔" سنٹوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔  
 "نمبر 1 یہ پنے کا کام ہے نمبر 2 تمہارے کارن۔" انجلی نے بتایا۔  
 "میرے کارن۔" سنٹوش کے لہجے میں حیرت موجود تھی۔  
 "ہاں تمہارے کارن، کیونکہ جب یہ جان ہی تمہاری ہے تو تمہارے ساتھ ہی جائے گی۔" انجلی عجیب سے لہجے میں بولی۔  
 "میری جان....." حیرت ابھی تک سنٹوش کے لہجے میں موجود تھی۔  
 "میں تمہیں کھل کر بتاتی ہوں۔ کیونکہ ہم دونوں جس مہم پر جا رہے ہیں شاید ہماری واپسی اسی وقت ہو اس لئے میں اپنے دل پر بوجھ نہیں رکھنا چاہتی۔" انجلی نے کہا۔  
 "تم کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو....." سنٹوش اکتاتے ہوئے لہجے میں بولا۔  
 "م..... میں..... میں تم سے پریم کرتی ہوں۔" انجلی نے ہکلاتے ہوئے آخر کہہ ہی دیا اور سنٹوش حیران لگی۔ انجلی کا منہ کھلنے لگا۔  
 "دیکھو سنٹوش میں نے تو تم سے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے پر تو اگر تمہیں مجھ سے پریم نہیں ہے تو مجھے تم سے کوئی کٹا نہیں ہے۔" انجلی نے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 "تم میں تو بڑی ہمت ہے انجلی۔ اتنی بڑی بات اور تم نے اتنی آسانی سے کہہ دی۔" سنٹوش نے مسکراتے ہوئے انجلی کو داد دی۔  
 "سنٹوش دل میں جو بات ہو کہہ دینی چاہئے فرض کرو اگر تمہیں کسی سے پریم ہے اور وہ بھی تم سے پریم کرتا ہو صرف ایک دوسرے کو کہہ نہیں پائے اور دونوں کی شادی علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہے پریم ایسی چیز ہے جو آسانی سے دلوں سے نہیں نکلتی ساری زندگی

رنیبر کے سینے میں جب مارنا ہے جب وہ بھڑپے کی حالت میں ہوگا یہ کام آج رات تک ہی ہونا چاہئے نہیں تو دوسرے دن کا سورج نکلنے ہی تمہارا بیٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھڑپا بن جائے گا پھر وہ دوبارہ کبھی بھی انسان نہیں بن سکے گا..... یہ کام جلد سے جلد کرو کیونکہ سے بہت کم ہے۔" رنک نے کہا اسی وقت کمرہ دوبارہ روشنی میں نہا گیا رنک غائب ہو گیا اور انجلی دیاں کو بھی اپنے بے جان جسم میں دوبارہ طاقت بحال ہوئی ہوئی محسوس ہوئی کمرے کا دروازہ کھلا اور سنٹوش اور انجلی کمرے میں داخل ہوئے۔

☆.....☆.....☆

میری نظر میں تم سے بہتر اور کوئی نہیں جانا تو میں ہی چاہتا تھا پر تو رنک نے مجھے آنے سے منع کیا ہے مجھے دھواں ہے تم سے بہتر کوئی اور یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔" انجلی دیاں یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔  
 "آپ کے لئے تو انکل میری جان بھی حاضر ہے پر تو حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ وہ رنک یکدم آپ پر ہریان کیسے ہو گیا وہ تو آپ کو اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا۔" سنٹوش نے پوائنٹ کی بات کی تھی۔  
 "بیٹا ہمارے پاس رنک کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی اپائے نہیں ہے سے بہت کم ہے تمہیں جلد سے جلد جانا ہوگا۔" انجلی دیاں کا لہجہ صحت آمیز تھا۔  
 "ٹھیک ہے انکل اگر اوپر والے نے چاہا تو میں ضرور رنیر کو واپس لے کر آؤں گا۔" سنٹوش پر امید لہجے میں بولا۔  
 "بھگوان تمہیں کامیاب کرے بیٹا۔" انجلی دیاں نے کہا۔  
 "ٹھیک ہے انکل میں بھی سنٹوش کے ساتھ جاؤں گی۔" ایک طرف بیٹھی انجلی نے کہا۔  
 "نہیں بنی تم میری خاطر اپنی جان سکتے میں نہیں ڈالوں گی۔" انجلی دیاں نے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
 "انکل جی سنٹوش بھی تو خطروں سے کھیلنے کے

دونوں مشکل زندگی گزار رہے تھے۔ انجلی نے کہا۔  
 ”پرنتویہ بھی تو ہو سکتا ہے تم دوسرے سے اظہار  
 محبت کر دو تم سے پریم کرتا ہی نہ ہو۔“ سنٹوش نے  
 سوالیہ نگاہوں سے انجلی کی طرف دیکھا۔  
 ”پھر کبھی دیکھنا چاہئے۔“ انجلی نے کہا۔  
 ”اب تمہاری بیٹی ہمت ہر کسی میں تو ہے نہیں  
 ہر انسان کا مائٹڈ پیچ ہوتا ہے یہی تو میگو ان کا نظام ہے  
 کوئی انسان کافی چیز ہے کوئی سیدھا ہے اور کوئی بے  
 وقوف۔۔۔۔۔۔ اب دیکھو نا پریم تو میں بھی تم سے کرتا تھا پرنتو  
 کہنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں تم میرے چہرے پر تھپڑی نہ  
 مار دو۔“ سنٹوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار تہقہہ لگا کر  
 ہنس پڑی۔  
 ”وہیے ایک بات کہوں سنٹوش۔۔۔۔۔۔“ انجلی نے  
 بظاہر اجازت چاہی۔  
 ”کہو۔۔۔۔۔۔“ سنٹوش نے اجازت دیتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”تم کسی سے بھی اظہار محبت کرو کوئی بھی لڑکی  
 ہو وہ تمہیں نہ نہیں کہے گی اور تمہارے گال تھپڑ کے لئے  
 نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی لڑکی تمہارے خوب صورت  
 شہدوں میں گرفتار ہو سکتی ہے کوئی بھی تمہارے چہرے  
 سے نفرت نہیں کر سکتا کیونکہ تمہارے چہرے میں ایک  
 عجیب سی شش ہے۔“ انجلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 ”بس بس اب اتنی تعریفیں ابھی نہیں  
 سنٹوش نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا تو انجلی ایک  
 مرتبہ پھر ہنس پڑی۔  
 ”اب آندر پور کے لئے کیا پلان ہے۔“ چند  
 لمحوں کے بعد انجلی نے پوچھا۔  
 ”وہاں جا کر ہمیں خون سے رنگا خنجر ڈھونڈنا  
 ہے اور جب رنیر بھیڑیابے گا تو اس خنجر کا وارنیر کے  
 سینے پر کرنا ہوگا۔“ سنٹوش نے بتایا۔  
 ”بھیڑیے کا روپ میں۔۔۔۔۔۔ یہ تو بہت خطرناک  
 کام ہے۔“ انجلی خوف کے باعث بولی۔  
 ”کام تو واقعی مشکل ہے ہم دونوں کی جان بھی  
 آئے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جاسکتی ہے اسی کارن تو میں تمہیں منع کر رہا تھا۔“ سنٹوش  
 نے کہا۔  
 ”اب میں نے اپنی جان تمہارے نام کر دی  
 اور اب ہم دونوں کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوگا۔“ انجلی نے  
 سنجیدہ لہجے میں کہا۔ گاڑی اب آندر پور گاؤں کی حدود  
 میں داخل ہو چکی تھی جلد ہی انہیں وہ مکان بھی نظر آ گیا  
 سورج اب کافی حد تک دن کا ساتھ چھوڑ رہا تھا مکان  
 آندر پور کی ابتدائی حدود میں ہی تھا مکان کافی پرانا تھا  
 اور اس کی حالت کافی خستہ حال تھی انجلی نے گاڑی اس  
 مکان کے سامنے روک دی دونوں گاڑی سے نیچے  
 اترے۔  
 ”یہ تو کافی پرانا مکان لگتا ہے۔“ انجلی نے مکان  
 کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے آنکھوں پر لگی کالی  
 عینک سر پر رکھ دی تھی۔  
 ”مکان تو واقعی کافی پرانا ہے۔“ سنٹوش نے  
 اثبات میں سر ہلایا۔ مکان کا دروازہ لکڑی کا تھا وہ دونوں  
 آگے بڑھے اور مکان کے دروازے کے قریب پہنچے۔  
 دروازے پر کوئی بھی ٹالائیں تھا سنٹوش نے دروازے  
 کو اندر کی جانب دھکیلا تو گرد و غبار کا ایک بھجھوکا سا  
 دونوں کی ناک سے نکل آیا دونوں کھانسنے لگے گرد و غبار  
 ہٹنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھے اور مکان میں داخل  
 ہو گئے فرش پر بھی گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی فرش پر چلنے  
 سے جوتوں کے نشان واضح ہو رہے تھے پورے گھر میں  
 دو کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے میں رنیر بے  
 ہوش کی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا رنیر کے ہونٹوں  
 پر خون لگا ہوا تھا جو یقیناً انسانی تھا سنٹوش گاڑی سے پانی  
 کی بوتل نکال کر لایا اور پانی کے چھینٹے رنیر کے چہرے  
 پر مارے ہوش میں آنے کے بعد رنیر حیرانگی سے ارد گرد  
 دیکھنے لگا۔  
 ”م۔۔۔۔۔۔ میں کہاں ہوں سنٹوش۔“ حیرانگی کے  
 عالم میں رنیر کے منہ سے نکلا۔  
 ”تمہیں کٹنپ کیا گیا تھا ہم تمہیں چھڑانے  
 آئے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کٹنپ۔۔۔۔۔۔ مجھے کسی نے کٹنپ کیا ہے  
 اور کیوں کیا ہے۔“ رنیر نے ایک ہی سانس میں کئی  
 سوال کر ڈالے۔  
 ”ارے۔۔۔۔۔۔ ارے بھی کچھ حوصلہ کرو اتنے  
 سوالوں کے ایک ساتھ جواب نہیں دے  
 سکتا میں۔“ سنٹوش نے بولھلاتے ہوئے کہا۔  
 ”میرا سر چکر رہا ہے سنٹوش اور یہ میرے  
 ہونٹوں پر کیا لگا ہوا ہے۔“ رنیر اپنے ہونٹوں پر زبان  
 کھینچتے ہوئے بولا۔  
 ”کچھ نہیں تم اٹھ کر بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ  
 کھانے کو لاتا ہوں۔“ سنٹوش نے کہا۔  
 ”نن۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ م۔۔۔۔۔۔ مجھے بھوک نہیں ہے  
 میں سونا چاہتا ہوں۔“ رنیر نے بھاری ہونٹوں پلوں  
 کو جھپکتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے پھر تم سو جاؤ۔“ سنٹوش نے سامنے  
 بڑی ٹوٹی پھوٹی چار پائی کی طرف اشارہ کیا رنیر نے  
 اپنے کی کوشش کی تو سنٹوش نے اس کا ساتھ دیا چار پائی  
 پر لیٹتے ہی وہ سو گیا سنٹوش نے گھر میں بڑی رسی سے  
 رنیر کو مضبوطی سے باندھ دیا۔  
 ”یہ تو ایسے سوراہے جیسے کئی دنوں سے نہ سویا  
 ہو۔“ انجلی کی ہنسی نکل گئی۔  
 ”اس بات کو چھوڑو تم اور خون سے رنگا وہ خنجر  
 ڈھونڈو وہیں جلدی کرنا ہوگی۔“ سنٹوش نے تیز لہجے  
 میں کہا۔  
 اب دونوں وہ خنجر ڈھونڈنے لگے پورا مکان  
 بگرد و غبار پر مشتمل تھا چھت پر جانے کے لئے میز حیاں  
 تھیں میز حیاؤں کے نیچے چھوٹا سا خلا بھی تھا جس میں  
 چھوٹا سا سامان بڑا ہوا تھا سنٹوش اور انجلی نے پورا  
 گھر جھان مارا مگر وہ خنجر نہ ملا اب میز حیاؤں کے نیچے بڑا  
 ٹوٹا چھوٹا سامان ہی رہ گیا تھا اسی وقت دونوں کو رنیر  
 کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔  
 ”تم ایسا کرو چھت پر جا کر چھپ جاؤ میں یہیں  
 بیٹھوں۔“ سنٹوش نے انجلی سے مخاطب ہوئے

ہوئے کہا۔  
 ”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں بھی یہی رہوں گی۔“ انجلی نفی  
 میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
 ”بے وقوفانہ باتیں مت کرو اور اوپر  
 جاؤ۔“ سنٹوش نے سخت لہجے میں کہا تو انجلی بو جھل بو جھل  
 قدموں کے ساتھ میز حیاؤں کی طرف بڑھی وہ چھت  
 پر پہنچی تو آسمان برسنے کے موڈ میں تھا سنٹوش میز حیاؤں  
 کے نیچے بڑے ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے لوہے کی  
 ایک سلاخ نکلی اور رنیر کی چار پائی کے پاس آ کر بیٹھ گیا  
 سنٹوش نے دیکھا رنیر کی آنکھیں کھلیں ہوئیں تھیں  
 جوتوں کی طرح سرخ تھیں اور وہ چھت کو گھور رہا تھا  
 پھر وہ یکدم بیچنا اور پھر رسیوں کی گرفت سے اپنے آپ  
 کو چھڑانے لگا پھر سنٹوش نے ایک حیرت انگیز منظر  
 دیکھا۔  
 اچانک رنیر کے چہرے کے خدو خال بدلنے  
 لگے اور جسم پر پہنے ہوئے کپڑے پھٹنا شروع ہو گئے  
 رنیر کے جسم پر باندھیں رسیاں بھی ٹوٹ گئیں رنیر کے  
 چہرے اور جسم پر لمبے لمبے بال ہونے لگے تھوڑی دیر بعد  
 وہاں ایک خوف ناک بھیڑی لپٹا ہوا تھا سنٹوش خوف  
 کے باعث کانپنے لگا۔  
 اچانک سنٹوش کے گلے میں پہنا ہوا لاکٹ گرم  
 ہونے لگا بھیڑی اٹھ کر کھڑا ہوا سنٹوش کو اپنی موت  
 صاف نظر آنے لگی اتنا خوف ناک بھیڑی اس نے زندگی  
 میں کبھی نہیں دیکھا دوسرا لمحہ حیران کن تھا وہ بھیڑی  
 سنٹوش کے پاس سے ایسے گزر گیا جیسے اس نے سنٹوش  
 کو دیکھا ہی نہ ہو وہ بھیڑی گھر سے باہر نکل گیا سنٹوش  
 نے اپنے ماتھے پر آئے سینے کو صاف کیا اس کے گلے  
 میں پہنا ہوا لاکٹ بھی یکدم شٹل ہو گیا اور سنٹوش سمجھ گیا  
 کہ وہ کس وجہ سے بھیڑیے کو نظر نہیں آیا تھا یہ اس لاکٹ  
 کا کمال تھا باہر اب بارش نے برسا شروع کر دیا تھا انجلی  
 بھی چھت سے نیچے آ گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں  
 اڑ رہی تھیں۔  
 ”م۔۔۔۔۔۔ میں نے آج ایسا حیرت انگیز

اور خوف ناک منظر دیکھ لیا ہے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر دھواں نہیں ہو رہا۔“ انجلی یقین نہ آنے والے لہجے میں بولی۔

”مجھے بھی چند منٹ پہلے ایسا ہی لگا تھا پر توبہ سچ ہے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”بہت بھیاںک سچ ہے۔“ انجلی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے پاس سے بہت کم ہے اس خون کے ٹکڑے کو ڈھونڈو۔۔۔۔۔“ سنٹوش نے انجلی کو اصل مقصد سے آگاہ کیا۔

”ہم نے ہر جگہ تو دیکھ لیا ہے مگر وہ خنجر کہیں نہیں ہے صرف سبز میوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان کو چمک نہیں کیا دہاں دیکھتے ہیں۔“ انجلی نے کہا۔

”مجھے دھواں ہے خنجر وہیں ہے۔“ سنٹوش نے پتہ لہجے میں کہا سبز میوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے آخر کار انہیں وہ خون سے رنگا خنجر مل ہی گیا۔

☆.....☆.....☆

گرج چمک اور تیز بارش کی وجہ سے وہ لڑکی ڈری سہی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی تیار ماں بار بار کھانسی رہی تھی۔

”جج..... جاگنی..... بیٹی۔“ اس کی تیار ماں نے اسے پکارا۔

”جج..... جی ماتاجی.....“ وہ احترام سے بولی۔

”بیٹی تھوڑا سا پانی تو پلا۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”ابھی لائی ماں جی۔“ جاگنی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر باہر محن میں آگئی بارش نے یکدم اسے اپنے گھرے میں لے لیا وہ ایک طرف پڑے کٹڑی کے اسٹینڈ کی طرف بڑھی اس نے کھڑے میں گلاس ڈالا تو کھڑ پانی سے خالی تھا۔

”اف بھگوان.....“ وہ پریشان سے بولی ماں کو وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بہت زیادہ بیمار تھی

گھر سے تھوڑی دور ہی ایک ٹکا تھا جو گاؤں کے سرچھنے لگوا لیا تھا اس نے گلاس پکڑا اور گھر سے باہر نکل آئی بارش، غصے سے گرجے پادلوں اور سیاہ رات کا اسے ڈر تو تھا لیکن ماں کی بیماری اور حکم اسے زیادہ عزیز تھی اللہ نے اسے بہت زیادہ حسن سے بھی نوازا تھا گاؤں کے ہر نوجوان لڑکے کی نظر اس پر تھی کیلے کپڑوں نے اس کے جسم کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور بارش کے قطرے اس کے چہرے پر فصر کر رہے تھے۔ چلتے چلتے اچانک جاگنی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا اس نے گردن سیدھی کی اور دوبارہ ہل بڑی بارش کی وجہ سے ہر طرف کچھڑی کچھڑی اس نے نکلے سے پانی کا گلاس بھرا اور واپسی کے لئے چپے ہی واپس مڑی تو ڈر کی وجہ سے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا سامنے اس کے گاؤں کے دولفر لڑکے رامیش اور ونیش کھڑے تھے جو روزانہ آتے جاتے اسے گندی نظروں سے گھورتے تھے۔

”کیسی ہو جاگنی۔“ ونیش نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”و..... و..... دیکھو..... مم..... مجھے جانے دو۔“ مم..... میری ماں بہت بیمار ہے۔“ جاگنی التجائیہ لہجے میں بولی۔

”جانے دیں گے پر توبہ پہلے اپنا کام کریں گے پھر تمہیں جانے دیں گے۔“ ونیش نے وحشی نگاہوں سے جاگنی کے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو، میری ماں کو بہت پیاس لگی ہوئی ہے وہ..... وہ مر جائے گی۔“ جاگنی روتے ہوئے بولی۔

”ہم کون سا تمہیں روک رہے ہیں بس ہمارا کام ہونے دو پھر چلی جانا۔“ رامیش نے مسکراتے ہوئے کہا اچانک جاگنی تیزی سے گھومی اور اس نے ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا اس کے علاوہ وہ اور کبھی کہا کر سکتی تھی اسے اپنے پیچھے رامیش اور ونیش کے تہمت

لانی دینے، بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گئی تو اس نے محم کر دیکھا تو اسے دور در تک وہ دونوں کہیں بھی لہائی نہ دینے وہ ایک درخت کے سہارے کھڑی ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانس بھال کرنے لگی اچانک وہ لڑوں درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے نکلے جاگنی کے منہ سے ایک زوردار جھج نکلی رامیش نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... اب کہیں نہیں جاؤں دے گے۔“ رامیش نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو تمہیں لڑوان کی سونگند.....“ جاگنی روتے ہوئے بولی رامیش نے اسے کندھے پر اٹھالیا اور اچانک انہیں ایک غراہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر وہاں ایک خونخوڑی شیش آگیا۔

☆.....☆.....☆

خنجر تو مل گیا اب رنیر کو ڈھونڈتے ہیں۔ سنٹوش نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بارش تمہنے دو پھر اسے ڈھونڈنے نکلے ہیں۔“ انجلی نے کہا۔

”بارش تمہنے کے ارادے تو صبح تک کے نہیں ہیں اور ہمارے پاس سے بھی صبح تک کا ہے اور اب آدھی رات سے بھی زیادہ کا ہو گیا ہے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”پر تو اس بارش میں رنیر کو ڈھونڈنا خطرناک ہے۔“ انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔

”خطرہ سے کھیلنے کے لئے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔“ سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پر تو پھر بھی.....“ انجلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن ونیش نے اسے ٹوک دیا۔

”باتوں کو چھوڑ دو اور باہر نکلو۔“ آخر کار وہ دونوں اس مکان سے باہر نکلے بارش اب بھی پورے جوش کے ساتھ برس رہی تھی مکان سے نکلنے ہی بارش نے تیزی سے انہیں اپنے گھرے میں

لے لیا وہ دونوں کانپتے ہوئے آگے بڑھے وہ دونوں کافی دیر اس جھڑپے کو ڈھونڈتے رہے مگر وہ انہیں کہیں بھی نہ ملا چلتے چلتے اچانک انجلی کا پیچھا کرنے لگا اور وہ جھپٹتی ہوئی جھپٹ جھپٹ جاگنی سنٹوش نے انجلی کو سہارا دے کر اٹھایا سنٹوش اور انجلی نے اس چیز کی طرف دیکھا جس سے کھڑا کر انجلی زمین پر گر گئی تھی اس چیز کو دیکھ کر انجلی کے منہ سے جھج نکلی گئی وہ ایک لاش تھی جس کی حالت بہت خراب تھی پاس ہی ایک اور لاش تھی اس کی حالت بھی پہلی لاش جیسی ہی تھی سنٹوش اور انجلی کو تھوڑی دیر ایک لڑکی بھی ملی جو زندہ تھی وہ بے ہوش تھی اور مکمل طور پر کچھڑ میں ڈوبی ہوئی تھی سنٹوش نے اس لڑکی کے گالوں پر ہلکے ہلکے ٹھیسروں کی بارش کی تو وہ لڑکی چیختے ہوئے ہوش میں آگئی جو جاگنی تھی۔

”مم..... مم..... مجھے اس جانور سے بچالو۔“ جاگنی ڈرتے ہوئے بولی۔

”دیکھو گھبراؤ مت وہ جانور یہاں سے جا چکا ہے تم اب محفوظ ہو۔“ سنٹوش نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”مم..... مم..... میری ماں بیمار ہے میں اس کے لئے پانی لینے آئی تھی میرے گاؤں کے دولفر لڑکوں نے میری عزت لوٹی جاہی پر تو وہ جانور جو شریر کے لحاظ سے بھیڑیا لگتا تھا اس نے ان دونوں پر حملہ کر دیا میں اسی سے بے ہوش ہو گئی اگر وہ بھیڑیا سے پر نہ آتا تو شاید میں آج کسی کومہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔“ اتنا کہہ کر جاگنی رونے لگی۔

”وہ بھیڑیا دیسے عورتوں کے لئے تو محسن ہی ثابت ہوا ہے جیسے کاویری کے لئے ثابت ہوا تھا۔“ سنٹوش نے کہا اور پھر جاگنی کی طرف ہوا۔

”ٹھیک ہے تم اپنی ماتاجی کے لئے پانی لے جاؤ۔“

جاگنی ابھی اور ایک طرف چل دی۔ ”کانی ڈھونڈ لیا پر توبہ ہمیں رنیر کہیں بھی نظر نہیں آیا۔“ انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔



رنگا بھی مسکرا ہوا تھا اور سنٹوش حیرانگی سے انجلی کا منہ تک رہا تھا۔  
 ”تمہاری حیرانگی میں دور کئے دیتی ہوں میں بھی رنگا کی ساتھی ہوں۔“ انجلی نے حیران کن بات کہی۔

”کیا.....؟“ سنٹوش چلایا۔  
 ”ہاں سنٹوش بابو تمہارے گلے سے اس ہار کو اتار دانے کے لئے ہمیں پریم کا یہ مایہ جال بننا پڑا اور مجھے انجلی پر گرو ہے یہ کامیاب ہوئی۔“ رنگا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”ان..... جلی.....م.....م.....م..... مجھے تم سے یہ امید تھی۔“ سنٹوش نے دھکی لہجے میں کہا۔  
 ”پریم تو مجھے بھی تم سے ہو گیا تھا پر تو اس کام کے لئے مجھے جتنی دولت آفر ہوئی تھی وہ پریم کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔“ انجلی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب میں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔“ رنگا غصے سے بولا۔

انجلی تم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور اب میں تمہیں اس کا انعام دوں گا۔“ اتنا کہہ کر رنگا نے تیزی سے اپنا ہاتھ انجلی کی طرف کیا انجلی کے کپڑوں میں یکدم آگ بھڑک اٹھی وہ چیختے چلانے لگی اور رنگا تھپتھپانے لگا۔

”یہ کیا کیا تم نے بد بخت.....“ سنٹوش دانت پیستے ہوئے بولا۔

”جیسا حال اب تم تمہارا ہونے والا ہے۔“ اتنا کہہ کر رنگا نے اپنا ہاتھ تیزی سے سنٹوش کی طرف کیا مگر سنٹوش اپنی جگہ پر ٹھیک خاک کھڑا ہوا تو رنگا نے پھر اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا مگر بے کار اب حیرانگی کی باری رنگا کی تھی۔

”کیوں..... کیا وار خالی جا رہے ہیں۔“ سنٹوش نے لفظ ”کیوں“ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ..... یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔“ رنگا پریشان کن

لہجے میں بولا۔  
 ”جیون کی ڈور اوپر والے کے ہاتھ میں ہے ارے ہاتھ میں نہیں اگر اوپر والے کو انجلی کی زندگی اور موتی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔“ سنٹوش پر عزم لہجے میں بولا۔

”تم تو واقعی ہمت والے ہو تمہاری پریرکا کی بنا پر میرے ہاتھ میں ہے پھر بھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ خیر میرے پاس سے بہت کم ہے اگر تم اپنے گلے میں پہنا ہوا وہ لاکٹ اتار دیا تو میں کا جیون بخش دوں گا۔“ رنگا کہتے ہوئے اصل ہونے کی طرف آیا۔

”دل..... لاکٹ..... کیا لاکٹ..... میرے کوئی لاکٹ نہیں ہے۔“ سنٹوش نے گھبراتے ہوئے زیادہ ہنومت ورنہ میں تمہاری اس پہلی

آخری پریرکا کا خون پی پاؤں گا یہ رنیر تو نہیں پی ”رنگا کہتے ہوئے مسکرایا۔  
 ”یہ تو پھر انسان ہے اصل میں بھیڑیے تو تم خون پی سکتے ہو۔“ سنٹوش نے غصے سے کہا۔

”اپنا یہ بھاشن بند کر دو اور ترنت مجھے وہ لاکٹ دو میرے پاس سے بہت کم ہے۔“ رنگا نے تھوڑی سی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔  
 ”ر..... رو.....“ سنٹوش نے ہاتھ ہوا میں لے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں لاکٹ دیتا ہوں۔“ سنٹوش نے اپنے گلے سے وہ ہار اتار کر رنگا کی طرف پھینکا جسے انجلی نے پکڑ کر لیا۔ رنگا نے انجلی کو ڈرایا۔  
 ”ٹھیکس سنٹوش۔ تم تو جلدی مان گئے ہیں لے تو سوا چھٹا کافی پاز بیلنا پڑیں گے خیر آخر کار پریم کی ہی موتی وہ کہتے ہیں نہ ہوگی پیار کی جیت

لی مسکراتے ہوئے بولی۔

کے پاس سے یوں گزر گیا جیسے اس نے سنٹوش کو دیکھا ہی نہ ہو۔ بھیڑیا اب انجلی کے سامنے کھڑا تھا اور خوف نے باعث انجلی بری طرح کانپ رہی تھی۔

”سس..... سس..... سنٹوش۔“ سس.....م.....م..... مجھے بھالو نہیں تو یہ بھیڑیا.....م..... مجھے مار ڈالے گا۔“ انجلی ہٹلاتے ہوئے چلا کر بولی سنٹوش تیزی سے آگے بڑھا اس سے پہلے کہ بھیڑیا اپنے کو کیلے دانت انجلی کی گردن میں گاڑتا سنٹوش نے وہ منہ بھیڑیے کے سینے میں گاڑ دیا بھیڑیے کے منہ سے اک ٹلک شکاف نکل جس کی آواز اتنی تیز تھی کہ بے اختیار انجلی اور سنٹوش نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے بارش اب تمام جگہ تھی رنیر جو کہ اب اپنی اصل حالت میں آ گیا تھا کچھ زور زمین پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اس کے جسم پر کوئی بھی کپڑا نہیں تھا وہ بالکل برہنہ تھا سنٹوش نے اپنا کوٹ اتارا اور جھک کر رنیر کے اوپر ڈال دیا۔

”انجلی چلو اب یہاں سے۔“ ہمارا کام.....“ سنٹوش نے حکوم کر انجلی سے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے کیونکہ انجلی کو سامہور کا نے پکڑا ہوا تھا رنگا کے ایک ہاتھ میں ایک منہ خنجر تھا جس کی نوک انجلی کی گردن پر تھی۔  
 ”کیسے ہو مورکھ لڑکے۔“ رنگا نفرت سے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کون ہو تم اور انجلی کو اس طرح کیوں پکڑ لیا ہے۔“ سنٹوش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں وہی رنگا ہوں جس کو تمہارے کارن ذیل کی ہوا کھانی پڑی اسپیکر دیال کا تھپڑ سہنا ہا اور پھر تمہارے کارن ہی اسپیکر دیال کو ٹکلیوں کے کہا۔ سہنے پڑے تمہارے کارن ہی رنیر انسانی خون چا والا بھیڑیا بنا اور تمہارے کارن ہی اس محسوس ناری کو تکلیف پہنچی پڑ رہی ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ مزید کشش میں نہ پڑے تو میری بات مان لو ورنہ ناری کی ہتھیا کے کارن بھی تم ہی بنو گے میں۔“ سنٹوش کے بغیر اسے جیون کی ڈور سے آزاد کر دوں گا۔“

”ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے اگر تم مانو تو۔“ سنٹوش نے کہا۔  
 ”میں مانوں تو..... کیا مطلب۔“ انجلی حیران ہوئی۔

”مطلب یہ کہ وہ بھیڑیا خون کا پیاسا اگر تمہیں زخم لگا یا تو وہ تمہارے خون کی بوسہ لگیتے ہوئے تم تک آئے گا اور میں اس کے سینے میں یہ خنجر گھونپ دوں گا۔“ سنٹوش نے بتایا۔

”یہ ترکیب تو بہت خطرناک ہے۔“ انجلی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا حالانکہ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔

”اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی اوپا ہے نہیں ہے۔“ سنٹوش نے کہا۔

”اگر میری جان چلی گئی تو۔“ انجلی مسکرائی۔  
 ”اوپر والے پر دوش اس رکھو تم اپنے کام کرو گی۔ وہ تمہاری رکھنا کرے گا۔“ سنٹوش نے انجلی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر.....“ انجلی رضا مندی سے بولی۔ سنٹوش نے اسے چاقو سے زخم لگایا اور ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑیے کا انتظار کرنے لگا چند لمحوں بعد ہی انہیں دور سے بھیڑیے کی غراہٹوں کی آوازیں سنائیں دیئے گئیں۔

”تم کسی درخت کے پیچھے چھپ جاؤ۔“ انجلی نے ڈر کے باعث کانپتے ہوئے کہا۔

”تم میری چٹا مت کرو وہ مجھے نہیں دیکھ پائے گا۔“ سنٹوش نے پراہٹا دل لہجے میں کہا۔  
 ”وہ کیسے.....“ انجلی حیران ہوئی۔

”بس دیکھتی جاؤ۔“ سنٹوش زبردستی مسکرایا کیونکہ وہ بھی اب ڈر رہا تھا کیونکہ بھیڑیے کی غراہٹوں کی آوازیں اب نزدیک سے آ رہی تھیں چند ہی لمحوں بعد بھیڑیا کیسی تیزی چلا گئیں لگتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا انجلی کا خون سے رنگا بازو دیکھ کر بھیڑیے کی آنکھوں کی چمک مزید دو گنی ہوئی بھیڑیا واقعی سنٹوش

لجے میں کہا۔

”یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ مہمان شائق لاکٹ ابھی میرے پاس ہی ہے۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا.....؟“ اس مرتبہ چلانے کی باری رنگا کی تھی۔

”بدبخت انسان اگر وہ لاکٹ تمہارے پاس ہوتا تو اس کی شگفتگی سے تم جل کر راکھ ہو جاتے یہ تو انجلی لاکٹ تھا جسے میں نے اس سے پہنا تھا جب میں نے انجلی کو چھت پر بھیجا تھا تو گاڑی میں جب انجلی نے مجھ سے اٹھار پریم کریم کیا تو میرا لاکٹ گرم ہو گیا کیونکہ جب بھی مجھ پر کوئی مشکل آتی ہو یا کوئی مجھ سے جھوٹ بول رہا ہو میرا یہ لاکٹ یکدم گرم ہو جاتا ہے انجلی کے اٹھار پریم پر جب یہ لاکٹ گرم ہوا تو میں پریشان رہا لاکٹ جب تک گرم رہا جب تک انجلی میرے ساتھ رہی لیکن جب میں نے اسے چھت پر بھیجا تو لاکٹ یکدم ٹھنڈا ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ انجلی میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے میں نے اصل لاکٹ اتار کر جیب میں ڈال لیا اور یہ لاکٹ گلے میں ہی رہنے دیا اور اب اسی مہمان لاکٹ سے میں تمہارا کام تمام کروں گا۔“ اٹا کبہ سنتوش نے اللہ والا لاکٹ جیب سے نکالا اور رنگا کی طرف کیا رنگا کے کپڑوں میں بھی یکدم آگ بجڑک اٹھی اور وہ ایک منٹ سے پہلے جل کر خاک ہو گیا۔ سنتوش نے لاکٹ کو جو ما اور گلے میں پہن لیا اس نے ایک طرف پڑی انجلی کی راکھ کو دیکھا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”برائی کا ساتھ دینا برائی ہے۔“

اب وہ بے ہوش پڑے رنبیر کی طرف بڑھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

کچھ مہینوں بعد

آج رات کافی سیاہ تھی آسمان چاند ستاروں سے خالی تھا ایسے میں وہ بس اس صاف اور کبھی ختم نہ ہونے والی سڑک پر جا رہی تھی بس کے تقریباً سبھی

مسافر سیٹوں سے ٹپک لگائے گہری نیند کے م۔ لوٹ رہے تھے سنتوش بھی اسی بس کا مسافر تھا ڈرائیور کنڈیکٹر کے علاوہ صرف سنتوش تھا جو اس بس میں جاگ رہا تھا سنتوش کو بس کے سفر میں کبھی نیند نہیں آئی تھی آج کئی سالوں بعد وہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا، اداس بھی تھا اور خوش بھی اس لئے کہ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے والا تھا اور گاؤں ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا اور اداس اس لئے کہ وہ شہر میں اپنے دوستوں کو پہچان کر جا رہا تھا اس کے سبھی دوستوں کی آنکھوں آنسو ٹپک رہے تھے جب وہ اسے رخصت کر رہے تھے آنسو کیوں نہ ٹپکے آخر وہ اپنے دوستوں کے جان تک کی پروا نہیں کرتا تھا انپکڑ دیال بھی کالی افسردہ تھا۔

”سنتوش بیٹا تم شہر میں ہی رہو یہاں کوئی انہی سی جاب کرلو۔“ انپکڑ دیال نے سنتوش کو شورہ دیا۔ ”نہیں انکل..... گاؤں میں بتا جی کی کالی زمینیں ہیں وہاں کھیتی باڑی کروں گا۔“ سنتوش نے کہا ”تمہارے جانے کا سب سے زیادہ دکھ ہوگا۔“ انپکڑ دیال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”دکھ تو مجھے بھی ہوگا انکل کیونکہ آپ جیسے اکل نصیب والوں کو ملتے ہیں۔“ سنتوش نے مسکرا کر ہونے کہا۔

”نہیں بیٹا نصیب والا تو میں ہوں جسے تم ۲۴ دوست ملا جو بے جھجک میری خاطر آگ میں کود پڑا۔“ انپکڑ دیال نے کہا۔

”آپ بھی تو میرے ایک دفعہ کہنے پر ۲۴ پکڑنے چلے جاتے تھے ناں۔“ سنتوش نے مسکرا کر ہونے کہا۔

”وہ میرا فرض تھا پر تو تم قرآن میں نہیں تھے۔“ انپکڑ دیال نے کہا۔

”انکل جب سے آپ سے دوستی ہوئی تو آپ کے کام بھی ہم پر فرض ہو جاتے ہیں اور یہ بھی انکل انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے کیونکہ اوپر والا

ان بھی ہے وہ انسان کی تکلیف انسان کے ذریعے کر کرتا ہے۔“ سنتوش نے پوائنٹ کی بات کر کر انسان کے دوچار تمہارے جیسے ہو جائیں اسے برائی کا خاتمہ مکمل طور پر ہو جائے۔“ انپکڑ نے کہا۔

”اچھا! اور برائی کا ساتھ تو چلتا ہی رہے گا..... کیونکہ جس طرح دکھ اور سکھ زندگی کا حصہ ہیں روح اچھا! اور برائی بھی دنیا میں رہے گی۔“ سنتوش نے بولا۔

”باتیں تو تمہاری دل میں گھر بیٹھتی ہیں اسے سیکھتے ہو اتنی خوب صورت باتیں۔“ انپکڑ نے پوچھا۔

”عبداللہ اینڈ عبداللہ سے۔“ سنتوش نے ہونے بتایا۔

”ایک تو گاؤں کے عبداللہ انکل سے اور دوسرا کے عبداللہ سے۔“ سنتوش نے ہتھ بٹے ہوئے بتایا۔ ”مسلم سے۔“ انپکڑ دیال حیران ہوا۔

”جی ہاں وہ دونوں مسلمان ہیں اور ایسے بھی بات کوئی بھی دھرم کہے نہ لینی چاہئے یہ بات اپنا نہیں مانتا پر تو مسلم دھرم مانتا ہے۔“ سنتوش نے بولا۔

”دوسرے دھرم کی بات ہم کیسے مان سکتے ہیں سنتوش۔“ انپکڑ دیال نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”انکل جی دھرم تو شروع سے ایک ہی ہے اے کو ایک ماننا، دھرموں کا ہزارہ تو ہم لوگوں کا ہے اور علم دھرم کا بھی یہی کہنا ہے کہ اوپر والا ہے یہ بات ہر دھرم مانتا ہے مگر صرف یہ بات کی کتابوں میں ہے ہمارے دلوں میں نہیں دنیا کا ہی، پنڈت، مولوی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے اوپر والا ایک ہے سب دھرموں کی کتابوں میں ان ہیں ہم وہ تو مانتیں کہ اللہ ایک ہے، بھگوان ہے، گاؤں ایک ہے، دیال انکل اوپر والا ہمارا کتنا

خیال رکھتا ہے کھانے پینے کے لئے دیتا ہے رہنے کے لئے گھر دیتا ہے کھانے کے لئے پھل دیتا ہے عورتوں کو ہمارے لئے بناتا ہے ستان کو پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ستان بڑھائے میں ہماری سیوا کر سکے اور بدلہ میں ہم اس کا شکر ادا کرنے کی بجائے اسے کئی حصوں میں بانٹ دیتے ہیں کبھی اور کئی کئی چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں بلکہ کبھی چاند ستاروں میں انسان خود سوچے رات کو بنانے والا دن کو بنانے والا چاند ستاروں، سورج کو بنانے والا انسانوں کو بنانے والا، چاند پرند، جانوروں کو بنانے والا بھلا کی کا محتاج کیسے ہو سکتا ہے ہم خود ہی پتھر کے بت بنا کر اسے پوجتے بیٹھ جاتے ہیں مسلم مسجدیں بناتے ہیں پر تو وہ ایک کے بجائے کئی اللہ کو نہیں مانتے مسجدوں کو صرف اپنی جگہ کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں وہ قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی صرف اس لئے کہ اوپر والے کا حکم ہے۔ پر تو ہم مندروں میں بے جان مجسموں کی پوجا کرنے بیٹھ جاتے ہیں انسان اچھا کام کرے تو اسے اعلیٰ کا درجہ دے دیتے ہیں، لیکن انسان کتنا بھی عظیم کام کیوں نہ کرے مگر وہ اوپر والا نہیں بن سکتا۔ انسان کے اس عظیم کام کے پیچھے اوپر والے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہوتا، جہاں صرف اوپر والے کے ہی سامنے جاتا۔“ سنتوش نے کہا۔

”ہوں.....“ انپکڑ دیال نے ایک گہری سانس کھینچی۔

”تمہاری باتیں تو غور طلب ہیں اب میں بھی اپنے پنڈتوں اور مولانا حضرات سے ضرور ملوں گا۔“ انپکڑ دیال نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ضرور انکل..... تاکہ ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد پتہ چلے یہی نہیں کہ ہم بے معنی زندگی گزار کر چلے جائیں۔“ سنتوش نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا میں ضرور یہ کام کروں گا۔“ انپکڑ دیال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، رنبیر کو بچانے کے لئے تو اس نے اپنی جان داؤ پر لگا دی

تھی وہ بھی اس کا شکر گزار تھا ایک اور حیران کن راز سنتوش پر کھلا تھا جس نے اسے اپنی عقل سے حل بھی کر لیا تھا وہ ایک سنہری شام تھی جب وہ اور ساسکشی چھت پر بیٹھے تھے۔

”سنتوش میں نے تم جیسا بے وقوف انسان نہیں دیکھا۔“ ساسکشی نے چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا ہوا۔“ سنتوش مسکرایا۔  
”اگر رنجیر کو بچاتے بچاتے تمہاری جان چلی جاتی تو ہم تمہارے بچائی کو کیا منہ دکھاتے۔“ ساسکشی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”وہی منہ جو تم سب کے پاس ہے۔“ سنتوش نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔“ ساسکشی نے بدستور منہ بناتے ہوئے کہا۔

”تو میں کون سا مذاق کے موڈ میں ہوں۔ اور ویسے بھی صبح تو کہہ رہا ہوں میں۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پہلی بات تو یہ کہ انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے دوسری بات وہ پیرا دوست ہے اور دوست وہ جو مصیبت میں دوست کے کام آئے ساسکشی کسی کے کام آنا ادھار کی طرح ہوتا ہے کیونکہ آج تم نے مدد کی ہے تو کل وہ تمہارے کام بھی ضرور آئے گا۔“ سنتوش نے ساسکشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ایسی سمجھ داری کی باتیں سکھاتا کون ہے۔“ ساسکشی نے پوچھا۔

”عبداللہ اینڈ عبداللہ۔“ سنتوش نے بتایا۔  
”عبداللہ اینڈ عبداللہ۔“ کیا مطلب.....“ ساسکشی حیران ہوئی۔

”ایک تو گاؤں میں ہیں عبداللہ اکل اور دوسرا عبداللہ شہر والا۔“ سنتوش نے بتایا۔

”سنتوش یہ دنیا بھی عجیب ہے ناں۔“ ساسکشی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... دنیا نے تمہیں کیا دیا۔“ سنتوش نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سیریس سنتوش۔“ ساسکشی اسل سنجیدہ تھی۔

”دنیا عجیب نہیں دنیا والے عجیب ہیں سنتوش نے بتایا۔

چلو بچی مان لیتے ہیں۔“ ساسکشی نے.. بناتے ہوئے کہا۔

”کچھ بتاؤ بھی آخر تمہیں دنیا سے کد ہے۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”یہاں دھرموں کا بازار لگا دیا۔“ ساسکشی کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا۔

”کیوں..... کیا ہوا۔“ سنتوش چونکا۔

”سب کا دھرم ایک ہی ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔ ذات نہ برادری پرنتو۔“ ساسکشی نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

”یہ دھرم ریت روان ہمارے اپنے بنا ہوئے ہیں ساسکشی..... اوپر والے کا تو صرف ایک دھرم ہے اور وہ ہے اوپر والے کو ایک ماننا اس ساتھ کسی دوسرے کو نہ مانو اور انسانوں کے بارے میں اوپر والے کا کہنا ہے کہ سب انسان ہا ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہو تم، اہم غلام، کالا گورا کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔“ ساسکشی نے

”مالک، اچھوت، غلام، کالا، گورا برابر ہوتے ہیں ساسکشی۔ مالک کو دینے والا بھی اہم والا ہے اور غلام، اچھوت، گورے، کالے کو دے والا بھی اوپر والا ہی ہے غلام بھی محنت کی کھاتا اور مالک بھی محنت کی کھاتا ہے بس یہ اوپر والا

نظام ہے کہ وہ انسان کی ضروریات انسان ذریعے ہی پوری کرتا ہے تو اس میں چھوٹا بڑا کہاں سے آگیا مالک بھی اوپر والے کا دیا کھاتا اور غلام بھی سچا اور حقیقی مالک (اللہ) اگر ہا

گو مالک اور مالک کو غلام بنادے ماضی میں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں اب تم انسانوں میں کیا فرق ہے ہاں فرق تب ہوگا

وہ اوپر والے کی عبادت دل کھول کر کرے جب اوپر والے اور دنیا کی فطرتوں میں بڑھے گا

ش نے ساسکشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پاتو تمہاری دل کو لگتی ہے۔“ ساسکشی متاثر ہوئے ہوئے۔

”ساسکشی یہ ہم انسانوں کی فطرت ہے کہ ہم دھرم میں فرق کرتے ہیں ورنہ اوپر والے کی

ن سب برابر ہیں۔“ سنتوش نے ساسکشی کو بتایا۔

”کیا مسلم دھرم بھی اچھا ہے۔“ ساسکشی نے

”بالکل..... کیونکہ اس دھرم کے نبی کی میں ہیں وہ بالکل سچی ہیں انہوں نے ہی

دالے کا یہ پیغام دیا تک پہنچایا ہے کہ سب برابر ہیں عورت کا مقام بتایا غلاموں کے حقوق

انہوں نے جو بات کہی سچی اور کھری کہی وہ دنیا بیا آج سے چودہ سو سال پہلے آئے ان کی کہی

تیں آج سچ ہو رہی ہیں اور ان کے عاشق دیکھو ان کی باتوں پر عمل کر رہے ہیں اور ان کی

پر عمل کرنے سے انہیں بے انتہا فائدے پہنچے ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”نبی..... یہ نبی کیا ہوتا ہے.....“ ساسکشی نے

”جب زمین والے اپنے اصل مقصد کے غلط راہوں پر چل پڑے تو اوپر والا انہیں

راہ دکھانے کے لئے انہی میں سے ایک نبی پیدا فرماتا جو ان کے اصل مقصد سے آگاہ کرتے

ن پھر اوپر والے نے مسلمانوں کے نبی پر یہ سلسلہ میں نے سنا ہے کہ اب ان کا فرمان ہی سب

ہوا گروہ یہ دین دھرم اپنانے کا تو وہ ہر جائز خواہش پوری کر سکتا ہے۔“ سنتوش نے بتایا۔

”مسلمانوں کے نبی نے کیا کہا ہے۔“ ساسکشی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ان کے فرمان سے تو کتابیں بھر پڑیں ہیں۔“ سنتوش نے بتایا۔

”تو ٹھیک ہے میں وہ کتابیں ضرور پڑھوں گی۔“ ساسکشی نے کہا۔

”ضرور پڑھنا کیونکہ ہو سکتا ہے تمہاری زندگی سنور جائے۔“ سنتوش نے کہا تو ساسکشی نے اثبات

میں سر ہلادیا۔

پھر سنتوش نے اسے عبداللہ سے احادیث اور سیرت النبی کی کتابیں لا کر دیں جس کا مطالعہ

ساسکشی نے بڑے غور سے کیا اور پھر اس موضوع پر اس کی سنتوش سے بات شروع ہوئی۔

”تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا سنتوش اسلام جیسی سچائی میں نے کسی بھی دھرم میں نہیں دیکھا۔“ ساسکشی نے کہا۔

”یہ تو واقعی حقیقت ہے۔“ سنتوش نے جوابا اثبات میں سر ہلادیا۔

”مسلمانوں کے نبی کا جنم آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا انہوں نے جو باتیں اس دور میں کہی

تھیں وہ آج ہر طرف موجود ہے۔ مسلمانوں کے نبی تو واقعی کمال کے ہیں۔“ ساسکشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

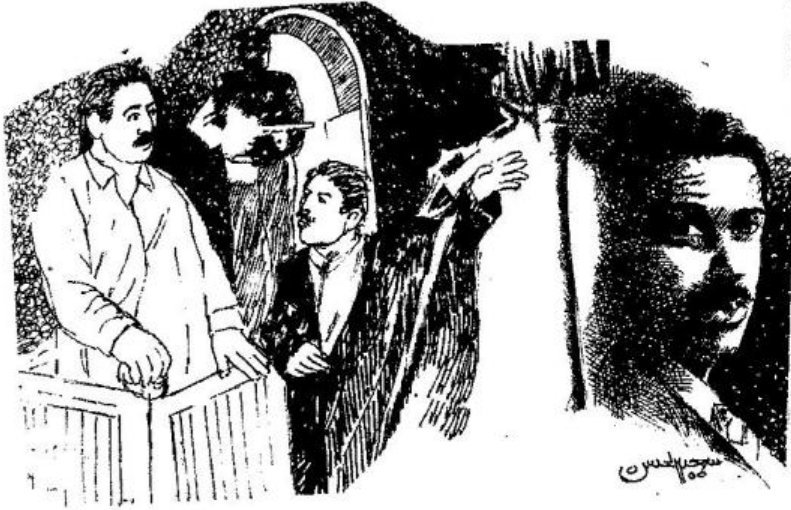
”زندگی سے لے کر مرنے تک کے آسان طریقے بتائے ہیں جن پر چل کر انسان دنیا میں بھی

کامیاب ہوتا ہے اور مرنے کے بعد سورگ (جنت) میں بھی جاتا ہے اسلام جیسا تو واقعی کوئی دھرم نہیں۔“

”بالکل..... یہ تو ہے اسلام جیسا کوئی دھرم نہیں اور اس دھرم میں کسی طرح کی سختی نہیں ہے اسلام دھرم

میں صرف فائدے ہی فائدے ہیں مسلمانوں کے نبی





## اندھیرے کا مسافر

طارق محمود - کامرہ انک

مزدور گھر کی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور کی فلك شگاف چیخ سنائی دی تو قرب و جوار کے لوگ دھل کر رہ گئے، گڑھے میں انسانی ہڈیاں تھیں اور اس میں تعویذ مضبوطی سے بندھے پڑے تھے کہ پھر.....

کبھی کبھی ناقص لوگ اپنی ناقصی دوسروں پر تقویٰ دیتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

تھیں لوگ ان کے نیچے پھنس گئے تھے گردوغبار تانا پھیلا کہ کسی کو پہچانا مشکل تھا۔  
میں اپنے تفتیشی افسر پر گرا تھا میرے اوپر بھی کچھ بوجھ سا تھا میں نے زور لگا کر اس کو اپنے اوپر سے ہٹایا چاروں طرف شور مچا تھا میں اٹھ کر کھانسا ہوا اس گردوغبار سے ایک طرف لٹکا چلا گیا میرے دائیں بازو میں گلی جھنڈی کی رنجیر زمین پر گھسنے لگی تب مجھ

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کچھری کی انک لڑاؤشی کڑکیوں کے شیشے چمن چمن چمن کی آوازوں سے پکنا چور ہو کر گر گئے سب لوگ زمین پر گر گئے ان کے منہ سے توبہ توبہ کے الفاظ نکلنے لگے ایک سایہ کی گردن اڑ گئی دوسری کی پیٹھ میں کتنے ہی بول کی کرچیاں گھس گئیں وہ بھی آدھ دفن یاد کرنے لگا اڑف قیامت سی برپا تھی کچھری کی کچھ دیواریں گر گئی

”وہ کیا.....“ سنتوش نے پوچھا۔  
”میں عبداللہ سے پریم کرتی ہوں  
ساکشی نے عجیب بات کہی سنتوش ساکشی کی اس  
بات پر مسکرایا۔  
”مجھے پہلے ہی پتہ تھا کیونکہ میں نے اکثر نہ  
کیا تھا کہ تم جب بھی عبداللہ کی طرف دیکھتی تو تمہارا  
آنکھوں میں حسرت ہوتی تھی۔“ سنتوش نے مسکرا  
ہوئے کہا۔  
”بالکل..... پر تو مجھے یہ پتا کھائے جا رہی  
کہ ہمارا ملن کیسے ہوگا پر نتو اب مجھے اس کی کوئی پتا  
نہیں۔“ ساکشی کسی خیال کے تحت بولی۔  
”کیا مطلب.....“ سنتوش حیران ہوا۔  
”پہلے میں نے سوچا تھا کہ اگر میرا اور عبداللہ  
ملن نہ ہوا تو میں آتما چھٹیا کر لوں گی یا مسلمان ہو جاؤں  
گی پر نتو اب بھی میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں پر نتو کا  
کوئی اور ہے۔“ ساکشی اتنا کہہ کر رہی۔  
”کیا کارن ہے۔“ سنتوش نے دلچسپی  
ہوئے پوچھا۔  
”اب میں مسلمانوں کے نبی کے کاہن  
مسلمان ہونا چاہتی ہوں کیونکہ انسان جب ہی کاہن  
ہو سکتا ہے جب وہ اوپر والے سے پریم کرے اور  
کے نبی سے۔“ ساکشی نے بے حد خوب صورت  
بیان کی۔  
”واہ بھی واہ تم تو پوری تیاری  
ہو۔“ سنتوش مسکرایا۔  
”ہاں بالکل..... کیونکہ جیون کا کوئی دشمن  
نہیں کب سانس اکٹھا جائے اس لئے اوپر والے  
اصل اور حقیقی راستہ جن لینا چاہئے کیونکہ یہ  
تو فرضی ہے اصل جیون تو مرتبہ کے بعد شروع  
ہوگا۔“ ساکشی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔  
”پر تو مجھے مانتا پتا اور سریش کی چتا ہے  
مانیں گے۔“

(جاری)

نے خود ختیاں برداشت کیں پر نتو اپنی جتنا (عوام، قوم)  
کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔“ سنتوش نے بتایا۔  
”اس دھرم میں داخل ہونے سے انسان زندگی  
اور موت کی مشکلوں سے بچ جاتا ہے۔“ ساکشی نے  
بتایا۔  
”یہ بھی حقیقت ہے۔“ سنتوش نے مسکراتے  
ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔  
”آج میں تم سے ایک بات شیئر کرنا چاہتی  
ہوں۔ پر نتو تم وعدہ کرو کہ وہ راز ہم دونوں کے بچ ہی  
رہے گا۔“ ساکشی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”پہلے بات بتاؤ پھر وعدہ کروں گا۔“ سنتوش  
بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔  
”نہیں نہیں پہلے وعدہ پھر بات.....“ ساکشی  
نے نفی میں سر ہلایا۔  
”اوکے بابا وعدہ۔“ سنتوش نے آخر کار  
ہار مانتے ہوئے کہا۔  
”مم..... میں اسلام قبول کرنا چاہتی  
ہوں۔“ ساکشی نے بے دھڑک کہہ دیا۔  
”کیا.....؟“ سنتوش حیران ہوا اور اس کا چہرہ  
دکھنے لگا۔  
”ہاں..... کیونکہ مسلمانوں کے نبی میں  
جو سچائی میں نے پائی ہے وہ کسی اور انسان میں نہیں  
اپنے لئے کچھ نہیں صرف اپنی جتنا کے لئے سوچا اسلام  
میں داخل ہونے کی کوئی زبردستی نہیں، کسی کے دھرم  
کو برا نہیں کہنا اوپر والا ایک ہے کیونکہ یہ بات دنیا کے  
ہر دھرم کی کتاب میں موجود ہے اوپر والے کی نظر میں  
سب برابر ہیں۔ بڑوں سے تیز سے بات کرو چھوٹوں  
سے پیار کرو ایک دوسرے کے کام آؤ اپنا دشوار  
صرف اور صرف اوپر والے پر رکھو کسی کو حقیر نہ جانو  
غریب مسکین کا خیال رکھو اسے کھانا کھلاؤ اپنے ارد گرد  
کے لوگوں کا خیال رکھو وہ تو غیر دھرم کے لوگوں کا بھی  
خیال رکھتے تھے۔  
”میں ایک اور بات تم سے کرنا چاہتی ہوں۔“

## ”ایک حقیقت“

اگر انسان یہ سمجھ لے کہ ”انسان کی موت اس وقت نہیں ہوتی جب وہ طبی طو پر منوں مٹی تلے دبا دیا جائے۔ حقیقت میں انسان کی موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی انسان زندہ رہتا ہے کسی یادوں میں، دعاؤں میں اور ایصالِ ثواب میں۔“

تو کبھی پھر کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جائے۔ اس لئے آسانیاں بانٹتے چلو تاکہ لوگ مرنے کے بعد بھی آپ کو اچھے لفظوں میں اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور آپ مرنے کے بعد بھی زندہ رہو کسی یاد، اچھے الفاظ اور دعا میں۔

(ایڈووکیٹ نینا خان۔ کراچی)

”عادل بھائی کیا حال ہے۔“ دعا سلام اور حال احوال کے بعد وہ اصلی بات پر آیا میرے گھر کی دیوار ایسی تھی جس کی وجہ سے اس کے گھر اور اس طرف بننے والے نئے گھروں کے لئے راستہ کچھ تنگ سا ہو رہا تھا میں نے اس سے کہا۔

”دیوار وہ اپنے خرچہ پر گرا دیں کچرہ وغیرہ میں خود اٹھوا کر تھوڑا سا اندر کر کے دیوار بنالوں گا۔“

میری بات سن کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ ”عادل بھائی جیسا تھا اس سے بڑھ کر آپ کو پایا۔“ میں اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا۔

”راستہ تو صدمہ جاریہ ہوتا ہے مجھے لوگوں کا راستہ تنگ کر کے بدعاؤں اور گالیوں کے علاوہ ملتا کیا۔“

اس نے دو مزدور لگا دیئے جو احتیاط سے دیوار گرانے لگے اور پھر ان مزدوروں نے ایک ہی دن میں وہ دیوار گرا کے اینٹیں صاف کر کے میرے صحن میں ڈھیر لگا دیا۔

میں بیٹھ کر گھر کی طرف تیزی سے چل دیا، ساتھ ہی خیال کے تحت ریسیکرو ایبویلیس کو فون کر دیا میرے گھر پہنچنے ہی ایبویلیس پہنچ چکی تھی وہ میری بیوی کو اسٹرچ پر ڈال کر ایبویلیس میں سوار کر رہے تھے کہ میں پہنچ گیا اور ہم اسے اسپتال لے گئے۔

میڈیکل ٹرینسٹ سے اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی اس کا مکمل میڈیکل ٹیسٹ کروایا بظاہر کچھ بھاری نہ تھی رپورٹس بھی ٹھیک تھیں معدہ میں کچھ ہلکی سی براہم تھی لیکن وہ دن بدن کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی گھر میں ہم دوسری تو تھے بچے تو بہت چھوٹے تھے بھائی کی دیکھ بھال مجھے خود ہی کرنی پڑی تھی ادھر کام کا راج ہو رہا تھا لیکن کیا کرتا گھر کو سنبھالنا بھی تو ضروری تھا بیوی کا علاج چل رہا تھا لیکن وہ سوکھ سوکھ کر بہت ہی کمزور ہو گئی تھی۔

آخر مجھے اس کی آنکھوں میں موت کی چمکانیاں نظر آنے لگیں اور پھر ایک دن ہم لوگوں کو سو سکتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی۔

ہمارے بچتے بچتے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی میں نے قسمت کے اس لکھے پر مبر کر لیا، اب میں خود ہی بچوں کو تیار کرتا انہیں ناشتہ کھاتا خود کھلاتا انہیں اسکول چھوڑتا اور پھر اپنے کام پر توجہ دیتا اپنی بیوی کی دیکھ بھال میرے دل سے نکل نہ گئی لیکن زندگی تو بے غم و خوشی بچے پہلے پہل بہت تنگ کرتے لیکن شاید ان کو زندگی کی فحیوں کی سمجھ آ گئی تھی۔

زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی اداس زندگی کی لیکن اب یہ گاڑی تین پہیوں پر چلی نہیں آتی تھی میری شادی کے مشورہ دیتیں اور اپنے گھروں کو واپس آ جاتیں مشکل وقت میں دنیا میں والدین کے علاوہ کسی کام نہیں آتا ان پر گلہ بھی کیا کرتا ہر بندے کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا بچوں کی بھی کئی کئی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بچوں کو کہیں گھمانے لے دوں دروازے پر دستک ہوئی میں باہر نکلا تو سامنے ایک جاننے والا پر اپنی ڈیلر تھا۔

کر سکتا ہے۔“

”لیکن آپ کے لئے میرا بھاننا بہت مسئلہ بن سکتا ہے۔“ میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

”نہیں..... عادل تم تو اس دھماکے میں جوتھڑوں میں تبدیل ہو چکے ہو تم جاؤ کسی نئی پہچان سے نئی راہیں ڈھونڈو“ اور میں اس کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے نکل آیا، اب میرے ذہن میں دو ٹارگٹ تھے۔ میرے لئے دونوں ہی اہم تھے، دونوں ہی میری نظر میں انسانیت کے قاتل تھے۔

☆.....☆.....☆

میں ان دنوں پراپرٹی کا کام کرتا تھا زندگی بہت ہی اچھی گزر رہی تھی میری ڈیلنگ دونوں پارٹیوں سے ہی اچھی ہوتی پچھتا اور خریدنا کچھ لوگوں کی مجبوری ہوتی تو کچھ لوگ خریدار بننے سے پلان لے کر زمین خریدتے ہمارے علاقے میں دو یونیورسٹیاں کچھ فاصلہ پر بن رہی تھیں اس لئے ان کے آس پاس کی زمین جو کہ زیادہ تر رہتی تھی لیکن ان یونیورسٹیوں اور پھر مین روڈ بننے کی وجہ سے سونے کے بھاؤ بک رہی تھی میرے جیسے چھوٹے پراپرٹی ایجنٹ بھی اب تو کافی خوشحال ہو گئے تھے اب میرا اپنا گھر تھا چھوٹی سی گاڑی تھی دو بچے تھے ایک بیٹا ایک بیٹی دونوں ہی اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے میری بیوی اسی اسکول میں چاب کرتی تھی خوشحالی آتے ہی میں نے اس کی چاب چھڑوا دی، زندگی پیٹھے جمرے کی طرح رواں دواں تھی کہ اچانک ایک شیطان نے اس پیٹھے جمرے میں غلابا پھینک دیا۔

ہوا یوں کہ میں ایک پراپرٹی کے سودے میں مصروف تھا کہ بیوی کے موبائل سے خالی آنے لگی میں نے ان لوگوں سے معذرت کی اور سائیڈ پر ہو کر جلدی سے فون اٹینڈ کیا، دوسری طرف ہماری بڑوں تھی۔

”عادل بھائی جلدی پہنچیں بھائی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہیں وہ خون کی الٹیاں کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی ہے۔“ میں نے فون بند کیا اور گاڑی

پر انکشاف ہوا کہ تفتیشی افسر یا تو مر گیا یا پھر بے ہوش پڑا ہے۔ ایبویلیس اور حکومت کی مددگار گاڑیاں ہوڑ بجاتی ہوئی وہاں آ پہنچیں۔ میں گردوغبار جھنسنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ میری نظر ایک بچی پر پڑی جو کہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پھنسی ہوئی تھی، میرے ضمیر نے مجھے وہاں سے بھاگنے نہ دیا میں اس بچی کو نکال کر ایبویلیس تک اٹھا لیا وہاں کتنی ہی عورتیں بوڑھے اور ادھر ادھر کرے پڑے تھے جنہیں میں اٹھا کر ایبویلیس میں ڈالنے لگا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں چار آدمیوں کا قاتل تھا، بے شک وہ قتل میں نے طیش میں آ کر کئے تھے لیکن تھے تو قتل ہی، میں قاتل تھا مگر مجھے اس درد بھرے منظر نے رلا دیا میرے لئے یہ بہت ہی اچھا موقع تھا بھاگنے کا لیکن بے گناہ لوگوں کی تکلیف نے میرے پاؤں میں ان دھیمی زنجیر باندھ دی کتنے ظالم اور قہر دل ہیں وہ لوگ جو ایسے دھماکہ کرتے اور کرواتے ہیں۔

جو لوگ ایسی موت بانٹتے ہیں جانے انہیں کیسی موت آئے گی۔ زنجیوں کو ریسیکرو کارکنوں کے ساتھ اٹھاتے ہوئے میری ہتھکڑی کی زنجیر زمین پر پھنسی رہی لیکن مجھے احساس نہ رہا کہ میں ایک قیدی ہوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی پولیس کوئی قیدی کوئی وکیل نہیں ہم سب درد کی زنجیر سے بندھے تھے اور زنجیوں کو اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال رہے تھے یہاں تک کہ کتنی کے چند زخمی رہ گئے باقی بے گناہ لوگوں کی ڈیڈ باڈیز تھی میں ایک زخمی کو گاڑی میں لٹا کر پلانا تو ایک جھکے سے رک گیا میرے سامنے میرا تفتیشی افسر کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا، اس کو دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں ایک قیدی ہوں لیکن اس نے ایسا کام کیا کہ میں ششدر رہ گیا اس نے آگے بڑھ کر میری ہتھکڑی کھول دی۔

”مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر اسے دل میں انسانیت کا اس قدر درد رکھنے والا کسی کو قتل کیسے

اب ہلکی ہلکی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور سچی کر پیچھے ہٹا میں بھاگ کر ان کے پاس جا پہنچا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ انسانی ہڈیاں تھیں جن کے گرد کالا دھاکہ لپٹا ہوا تھا جس میں تعویذ پروئے ہوئے تھے۔

”صاحب اسے ہاتھ نہ لگانا یہ تو آپ پر کسی نے سفلی عمل کروا رکھا ہے۔“ میں نے ان ہڈیوں کو اٹھانے کے لئے جھک کر ہاتھ برہایا تھا کہ ایک مزدور چلا یا تو میں نے ڈر کر ہاتھ پیچھے ہٹ لیا۔

”وہ کیا ہوتا ہے سفلی عمل اور کس لئے ہوتا ہے۔“ میں میٹرک پاس اپنے کام میں زندگی بنانے والا عام سا آدمی تھا۔

مجھے کالے ظلم کے بارے میں کیا پتہ تھا بس کبھی کبھار تعویذ گنڈوں کے بارے میں گھر میں آنے والی عورتوں سے سنتا رہتا تھا لیکن بھی دھیان نہ دیا۔ اس مزدور کو جتنا پتا تھا اس نے مجھے بتایا اس کی باتیں سن کر میرا دل کانپ اٹھا لوگ دوسروں کو ہرانے ان کو نیچا دکھانے کے لئے کیا کیا شیطان کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہئے اس سے حفاظت کے لئے۔“

میرے پوچھنے پر وہ مزدور مجھ ایک پیر صاحب کو لے آیا جنہوں نے وہ ہڈیاں وہاں سے اٹھالیں اور میرے گھر چاروں طرف قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا اور بانی پر دم کر کے ہم کو پینے کے لئے دیا۔

”عادل صاحب آپ کے کسی کاروباری حریف نے آپ کے گھر پر بہت سخت سفلی عمل کروایا ہے۔ اس کے توڑ کے لئے مجھے تین دن آپ کے گھر میں ایک عمل کرنا ہوگا۔“ میں اب انہیں کیا جواب دے سکتا تھا اس بارے میں تو میں بالکل نا بلد تھا میں نے ان سے ان کاروباری حریف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ناں میں سر ہلایا جس سے میں یہ سمجھا کہ یا تو انہیں اس کے بارے میں پتہ

نہیں یا تو وہ بتانا نہیں چاہتے کیونکہ اس کاروبار میں تو اب بہت لوگ ہیں میں خود سے اسے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ بھلا ہوان پیر صاحب کا جو کہ تین دن تک میرے گھر وکیلہ کرتے رہے ور مجھے مطمئن کر کے یہاں سے گئے دیوار پھر سے تعمیر ہوئی راستہ کھلا ہو گیا۔

ایک دن میری گاڑی باہر ہی کھڑی تھی بچوں کو تیار کر کے ہم نکلے تاکہ انہیں اسکول چھوڑ سکیں ہم باہر نکلے تو میں نے ایک آدمی زمان نامی کو کار سے غلطی میں دور ہٹنے دیکھا میرا ذہن پہلے سے اپ سیٹ تھا اس کو یوں وہاں سے تیزی سے دور جانے دیکھ کر ہاتھ ٹھکا میں کار کو خوب غور سے نیچے اوپر اندر سے جانچنے والی نظر سے دیکھا بظاہر تو مجھے کوئی خرابی نہ لگی لیکن اندر سے میں ڈر رہا تھا، اسی لئے میں نے بہت ہی آہستہ آہستہ گاڑی چلائی بچوں کو چھوڑ کر مجھے سکون ملا، میں گاڑی واپس موڑ کر تھوڑی سی اسپید بڑھائی ہی تھی کہ اچانک گاڑی ڈگمگنے لگی اور پھر درمیانی فٹ ہاتھ سے لگ کر گاڑی خود ہی رگ رگ ورنہ ہینڈل بالکل خراب ہو گیا تھا اللہ کا خاص کرم ہوا، میں غصہ کیا تھا لیکن گاڑی کا ناٹی راڈ ٹوٹ گیا تھا اور مجھے پتہ تھا یہ کسی کی حرکت تھی۔

میرے دماغ میں پیر صاحب کی یہ بات چکرانے لگی کہ کوئی کاروباری حریف مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہے زمان بھی میرا ایک کاروباری حریف تھا میں اب ساری بات سمجھ گیا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا میری قسمت میں جو کچھ تھا وہ مجھے مل کر رہے گا میں نے ٹھنڈے دل سے زمان سے بات کرنے کا سوچا میں نے گاڑی ایک قریبی گیران میں کھڑی کر دی اور سیدھا زمان کے گھر پہنچا میں نے اس سے سکون سے بات کی لیکن وہ اور اس کے تین بھائی مجھ سے لڑنے لگے مجھے بھی غصہ آ گیا، مجھ سے جتنا ہو سکتا تھا میں نے بھی ان کو مارا لیکن وہ چار تھے اور میں اکیلا مار کھاتے ہوئے جانے کیسے زمان کے ہاتھ سے میں نے پتہ چھین لیا، صرف چار گولیوں نے ان چاروں کا خاتمہ کر دیا۔

میں وہاں سے بھاگ نہ سکا اور بھاگ کر جاتا ہاں، میرے بچے میرے بغیر کیسے رہ پاتے کسی اس کو فتنہ کر دیا اور میں گرفتار ہو گیا۔

میرا وکیل مجھے پانچ یقین دلار ہاتھ کہ مجھے موت نہیں ہو سکتی، ہاں کچھ سال کی سزا ہوگی۔ اس دن عدالت میں جوشی جی کو دھماکہ ہو گیا۔ مجھے عرفان استاد ملا جس نے میری کہانی سنی نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔

”عادل صاحب تمہاری ہستی بستی خوشحال کے ساتھ تو بڑی ٹریڈی ہوئی ہے۔ جیسے تم ہو کہ تمہاری بیوی تندرست تھی لیکن اچانک بیمار چل بسی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ سفلی عمل سخت ہوتا ہے۔“

”عرفان استاد زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے آہستہ سے کہا تو وہ بولے۔“

دیکھو میں مولوی نہیں کہ تمہیں بھر پور طریقے سکھوں، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب شیطانی ہے ہیں، شیطان نے قیامت کی صبح تک اپنے ان کے لئے اللہ سے مہلت لے رکھی ہے۔ اللہ فرمایا کہ ”جو میرے بندے ہیں وہ تیرے میں کسی صورت بھی نہ آئیں گے اگر کچھ بھگت تو تو بہ نامائیں گے تو میں انہیں بخش دوں گا۔“

یہ سب باتیں میرے دماغ میں فٹ ہو گئیں اسی مجھے پتہ چلا کہ آج کل ایک عامل ناگر بابا ہیں اپنے کالے عمل سے شیطان کو خوش کر رہا ہے میرا پہلا ٹارگٹ وہی تھا میرے بچے میرے گھر میں تھے جن کی اولاد نہ تھی مجھے پتہ تھا کہ میرے بچوں کو بہت پیار سے رکھیں گے فی دی میں میرے مرنے کی خبر نشر ہو چکی تھی اب میں ان کی زندگی میں دوبارہ جا کر ارتعاش پیدا نہیں کرتا تھا۔

میں ناگر بابا کے پاس ایک ضرورت مند بن کر اپنی دزد سے بھی کہانی سن کر اس کا چیلہ بن گیا

میں کچھ دن اس کے پاس رہ کر دیکھتا جا رہا تھا کہ واقعی وہ کالے عمل کرتا ہے۔

کیسے کیسے لوگ اس کے پاس آرہے تھے کوئی ساس اپنی بہو کے ہاتھوں تنگ تھی اور اس پر سفلی عمل کروانا چاہتا تھی تو کوئی بیوہ ساس کے ہاتھوں دنیا کمانے کے پکڑنے لوگوں کی مت ماروی تھی ہر کوئی اپنے کاروباری حریف، رقیب اپنے محبوبہ کے ہونے والے خاوند کو کیسے کیسے لوگ وہاں شیطان کے بہکانے سے آرہے تھے مجھ سے اور دیکھا نہ گیا رات کو میں نے باقی جیلوں کو کھانے میں بے ہوشی کی دواملا کر بے ہوش کر دیا اور پھر ناگر بابا کو ایسی سزا دی کہ میں خود اس کا حال دیکھ کر لرز اٹھا، میں نے پانی میں خالص تیزاب ملا کر اس کے منہ میں جبر آؤ الا وہ پینا نہ چاہتا تھا۔

میں نے اس کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹ دی اس نے پھر بھی ضد کی تو میں نے ایک اور انگلی کاٹ دی جب وہ دوسرے چلانے کی کوشش کرتا تو میں اس کے منہ پر جھکا کر ہاتھ رکھ دیتا آخر تین انگلیاں کٹوانے کے بعد اس نے موت کا پیالہ لپیٹا تیزاب اندر جاتے ہی اس کے منہ ناک اور نیچے سے دھواں نکلنے لگا میں نے اسے مضبوطی سے باندھ رکھا تھا وہ تڑپتا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں سکتا تھا اس کو ایسے موت آئی کہ اس کے اندر سے سب کچھ بہہ نکلا اس کے بعد میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

اب ناگر بابا جیسے لوگوں کے لئے میں ایک بہرہ دینا قاتل، دہشت کی علامت ہوں اس کے بعد دو اور کالے کرو توتوں والے میں نے ایسے ہی قتل کئے، تو ایسے عمل کرنے والے چھپنے لگے، میں ساتھ ساتھ اپنے دوسرے ٹارگٹ کھڑ دھماکہ اور دہشت گردی کی واردات کرنے والوں کی تلاش میں ہوں، میرا پختہ عزم ہے کہ انسانیت دشمنوں سے میں اپنے ملک کو اپنی طاقت رکھنے تک لڑتا رہوں گا انہیں صفحہ ہستی سے مٹا رہا ہوں گا اب میرا نام مجاہد ہے اور میں اندھیرے کا مسافر ہوں۔





# سفاک کون

مہر پرویز احمد دوسریاں چنوں



نادیدہ قوت کی دل شکستہ آواز سنائی دی۔ محترم بزرگ عام لوگ ہم پر الزام تراشی کرتے ہیں بلکہ جھوٹی باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور حقیقت سے سب آشنا ہیں۔

حقیقت کے پالنا میں جھوٹی ہوئی اپنی نوعیت کی لرزادینے والی دل گرفتہ کہانی

بار پھر تک، دھڑنگ ڈراؤنی شکل والی چڑیلیں دائرے کی شکل میں گھنٹوں کے بل بیٹھ کر باباجی کے حضور گرہ زاری کرنے لگیں اور آئندہ کسی بھی انسانی آبادی میں آنے سے توبہ کرنے لگیں پہلی غلطی پر بار بار معافی مانگنے لگیں۔

باباجی نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی غلطی کی اس شرط پر معافی دی کہ وہ آئندہ کسی آبادی کے نزدیک رہائش نہیں رکھیں گی۔

باباجی نے جب ان سے میرے پاس آنے کی وجہ پوچھی تو بولیں۔

”عجیب نامی شخص نے ایک غیر مسلم سا لگا مسیح کو دس ہزار روپے دیئے کہ حیدرہ کے گھر میں بیعتی گائے کو جان سے مارنا ہے، یہ گائے بیعتی اور ان کو بہت عزیز ہے، گائے کے مرنے پر ان کو دو لاکھ کا نقصان ہوگا، وہ ہمارا بہت نقصان کر چکے ہیں، ہم براہ راست ان سے نہیں لڑ سکتے لہذا آپ اس گائے کو تو بیڈ گنڈے یا کسی ہوائی مخلوق کے ذریعے مروادیں۔“

سا لگا مسیح نے پلید جسم کے ساتھ پلید عمل کر کے ہم چڑیلیں کو قید کر رکھا ہے اس نے ہمیں بلایا، ہم نے گائے کے پیٹ میں بلید، کیل وغیرہ ڈال کر اسے شدید

جیسے گا، چڑیلیں کے ساتھ اس کو بھی جس نہیں گا۔ تم حوصلے سے کام لو، تھوڑی سی تکلیف کرو۔“

آنے والے لمحات میں چڑیلیں تڑپنے اور چیخ و پکار کرنے لگیں، جیسے جلتی آگ میں

انسان زندگی بچانے کی تک دود کرتا ہے۔

اس دوران چھوٹے چھوٹے پولوں کی ایک

لی، جو کہ ان چڑیلیں سے بھڑگئی، ان کے تھم

تے ہی ایک بھاری شاپر ایک چڑیل کے ہاتھ

لگا جسے اس چھوٹی مخلوق کے ایک لیڈر ٹائپ

کے اٹھایا، اس نے جب اس کو کھولا تو اس میں

ایسا جو آپ کے سامنے کیل، پن، بلید اور بالوں

ت میں رچی ہیں ان اشیاء کو اس بونے نے

کے حضور پیش کیا اور تمام ساتھیوں کو لے

بھو گیا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی، دو نرم

پوں نے فرش سے اٹھا کر چلی پٹنگ پر لٹا دیا لپٹتے

طر سانسوں اور دل کی سریلی دھڑکن نے میری

میں نشہ بھر دیا۔

کون کے لمحات سے فارغ ہوتے ہی ایک

آنکھیں چندھیا کر خود بخود بند ہونے لگیں دماغ میں سوئیاں سی جیسے لگیں، یوں محسوس ہوا جیسے نوکیلے ناواں، لمبے دانٹوں، سپاہ بال اور نگارے کی طرح ہل آگھوں والی پانچ بدروحوں نے مجھے سرست ل کر پاؤں تک جکڑ لیا ہے سانس لینا دشوار ہو گیا، آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں دکھ غم پریشانی اور غم سے میری چیخیں کمرے کی چھت کو پھاڑ کر باہر جا گئیں۔

چیخ نکلتے کے فوراً بعد مجھے باباجی کی مسود کن آ سنائی دی۔

”مریدنی ڈرو نہیں، ان انسانیت

چڑیلیں کا مقابلہ کسی عام ٹوٹکے باز، جنگلی مال اور فراڈیے جن بابا سے نہیں بلکہ ”کھوبے شاہ“

ہے۔ میں ان کا خون پی جاؤں گا چتا جلا کر، ہر کھنڈروں میں خاک پھینکوں گا ان کو ایسا بیست سکھا

گا کہ ہر ڈراؤنی مخلوق انسان کے سامنے سے دور بھاگے گی۔“

جس شخص نے عمل کر کے ان کو تہا رہا

بھیجا ہے وہ زندگی کی بھیک مانگے گا، آئندہ کسی مال سے من مرضی کے روپے بٹور کے اس کے مخالف

”میں پنچایت کے سامنے جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ ہم نے باباجی سے جنوں کے ذریعے حساب کروایا ہے انہوں نے بیوتوں کے ساتھ ہمارے خدشات کی تصدیق کر دی ہے۔ یہ تمام اشیاء کیل، سوئیاں، عورت کے سر کے بال، بلیدوں کے ٹکڑے، ان کی تعداد اور مقدار جنوں نے بتائی ہے جبکہ یہ تمام اشیاء ہم نے ایک سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاپر میں بند کر کے صندوق میں رکھ کر بڑا بھاری تالا لگا رکھا تھا۔“

سوکھ میٹر دور باباجی کے خاص حجرے میں جنوں نے یہ تمام اشیاء دائرے کے اندر میرے سامنے لا کر رکھ دی تھیں۔

باباجی نے اپنے خاص حجرے میں مجھے بلایا

کے فرش پر موٹی سیاہ مارگر سے دائرہ لگایا اس کے اندر مجھے بیٹھایا۔

میرے دائیں انگوٹھے پر بیوتوں کا تیل لگایا اور مجھے اپنی ساری توجہ اس انگوٹھے پر مرکوز کرنے کی ہدایت کی۔

باباجی نے جو بھی پڑھنا شروع کیا، میرا انگوٹھا

بلب کی طرح جلنے بجھنے لگا نظریں ٹکانے کی وجہ سے

زنجی کر دیا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جب وہ مرنے لگی تو اسے حلال کر دیا گیا اس کی بیماری کو شکوک ہونے سے بچانے کے لئے اس کے پیٹ کے اندر ڈالا گیا سامان ہم نے نکال لیا یہ تمام سامان ہم ساکھ مسیح کو دینے واپس جارہی تھیں کہ اس دوران آپ نے عمل کر کے ہم کو بلوالیا۔ سزا بھی دی اور سامان بھی ہم سے چھین لیا، وہ سامان جو مجیب میرے سابق داماد نے گائے کو کھلا کر مار دیا تو اب ہم اس سے دولاکھ کی بجائے دس لاکھ لیں گے۔

اگر اس نے ہماری گائے کو ہلاک نہیں کیا تو ہمیں دس لاکھ کا ضامن دے۔ اگلے جمعے والے دن نماز جمعہ کے بعد کوئی بھی شخص اس کی جگہ مسجد میں حلف دے کہ ہماری گائے کو اس نے ہلاک نہیں کیا تو ہم اس پر لگائے گئے الزام کی معافی مانگیں گے اور آئندہ اس کی ذات پر انگلی نہیں اٹھائیں گے۔

یہ تمام باتیں طے ہونے کے بعد مجیب کے ساتھ آئے ایک شخص نے پچاسیت کے سرخ سے کہا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی ایک بزرگ سے پورے گاؤں کے سامنے چوراہے پر حساب کروائیں ہو سکتا ہے یہ واقعہ ایسے نہ ہو جیسے حمیدہ نے بیان کیا ہے ان کا مجرم کوئی اور ہو۔“ دونوں فریقین کو پچاسیت نے پابند کیا۔

حلف دینے سے قبل ایک بار پھر حساب کروانے کے عمل پر اتفاق کیا گیا۔

☆.....☆.....☆

حمیدہ کا کردار ہوش سنبھالتے ہی مٹھوک نہیں بلکہ کالی سیاہ، گھپ، اندھیری رات کی طرح سیاہ تھا لاکھ کوشش کے باوجود عزت کا سفید داغ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جوانی کی عمر کو پہنچی تو آئے روز کی تہمت، بدنامی، ہزیمت والدین کے لئے سوبان روح بن گئی اس معیبت سے جان چھڑانے کے لئے دور کے

رشتہ داروں میں اس کی شادی کر دی گئی۔

سسرال جانے پر پرانی روش نہ بدلی، زندگی کی مسمم شاموں میں تبدیل ہوتی رہیں چہ بچوں کی ماں بننے کے دوران کتنے ہی معاشقے چلے، کچھ کامیاب ہوئے کچھ ناکامی سے دو چار۔

ادویہ عمر کو پہنچی مگر جس برے کام کی گھنٹی لے کر پٹی بڑھی تھی نصیحت کی طرح زندگی کے دو پہیے بائندہ کر رکھا، یہ برائی خون پینے والی جو تک کی طرف اب تک اس کے ساتھ چھٹی ہوئی تھی۔

دو بیٹیاں جوان ہوئیں تو ماں کی روش اپنائی، دھم چوسنے والی کبھی کی طرح طالب آتے اور روپوں کے عوض طلب پوری کر کے چلے جاتے۔

ایک بیٹی کا رشتہ دور پار کے رشتہ داروں میں طے کر دیا اور ایک ہمسائے میں ایک قریبی عزیز بہ

کو دے دیا۔

مجیب ایک فرم میں بطور سیل مین کام کرتا تھا اکثر ملک کے طول و عرض میں دورے پر ہوتا اس نے اس کی بیوی شبنم میکے میں ماں کے پاس رہتی۔

حمیدہ اور بیٹی شبنم نے گھناؤنا کاروبار ہمارا رکھا، لیکن اب حمیدہ کے بیٹے باشعور ہو چکے تھے، زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھتے تھے انہوں نے ماں بیٹی لے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی گا دی لیکن جیسے چور چال سے جاتے ہیں پھر پھر یہ نہیں اسی طرح وہ چوری لوگوں سے ملنے لگیں لیکن یہ بات کب تک چھپی رہی، اکثر مل بیٹھے پکڑی جاتیں تو ان کی خوب دھلائی ہوئی گاؤں میں بدنامی الگ ہوتی۔

اب کی باری بیٹیوں نے باز نہ آنے پر ہاتھ ہاتھ توڑنے کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی سن کر ان کے اوسان خطا ہو گئے، لہذا دوسری طرف وہ دوستوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتیں تھیں۔

اس مشکل مسئلے سے نمٹنے کے لئے سخت قرار ہو گئیں۔ لفٹوں کو لفٹے میلوں دور سے

کر لیتے ہیں ان کو بھی ایک بابابی کی بجائے پڑ گئی جو خواتین میں بہت مقبول تھے عزتوں کا لٹیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ساکھوں اور مریدوں کی جیسیں ہلکی کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔

یہ بابا تو جو سفید ماں بیٹی حمیدہ اور شبنم کو مطلوب تھا، یہی ان کی بھنور میں پھنسی ناؤ کو کنارے لگا سکتا تھا۔

یہ بابابی الو کے خون سے دوران محبت تعویذ لکھتا تھا جو سفید کامیاب ہوتے۔ تعویذ لیتے ہی مسائل کے تمام داغ دھلائے شروع ہو جاتے مخالفین آنکھوں سے تابیٹا، کانوں سے بہرے اور پاؤں سے معذور ہو جاتے، مسائل کھل کر من مرضی کے فیصلے اور افعال کرتا اس بابابی کی اطلاع پاتے ہی ماں بیٹی نے سکھ کا سانس لیا اگلے ہی دن دوپہر کے وقت بابابی کے حجرے میں پہنچ گئیں۔

☆.....☆.....☆

غور عرف گھو با کسی دور میں گاؤں کے چوک میں بیٹھ کر جوتے کا ٹھٹھا اور پالش کرتا تھا کام کروانے والی اکثر خواتین اور لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے پر اس کی جوتوں سے مرمت ہو چکی تھی۔

عاشقی کا بھوت جب سر پر سوار ہو تو سب کام چھوڑ کر منزل پانے کے لئے من کی مرادیں پوری کرنے والے بابا کا ملک بن گیا۔

یہ بابابی کے لئے مسائل تلاش کر کے لاتا، جھوٹی موتی کرامات سنا کر لوگوں کی توجہ مبذول کروا تا سن پسند خواہشات کی تسکین کے قصے سناتا اور لوگوں کو مطمئن کرتا۔

ایک لمبے عرصے تک خدمات سر انجام دینے کے صلے میں بابابی نے اپنے گدی نشین کی خلعت سے نوازا اور لوگوں کو فیوض و برکات سے مستفید کرنے کے لئے دور کے علاقے میں بھیج دیا جہاں کے مریدوں کو بابابی کے حضور حاضری دینے کے لئے بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا مریدوں اور مریدہ بیوں سے آشنائی تھی ان کی عقیدت نے جلتی پر تیل کا کام کیا

بابا گھو بے شاہ کی شہرت کو چار کی بجائے آٹھ چاند لگا کر دور دور تک ڈھنڈورایا۔

”گھو بے شاہ“ کی کرامات کی شہرت حمیدہ اور شبنم کے کالوں میں پڑی تو فیضیاب ہونے کے لئے بے قرار ہو گئیں اور بابابی کے حضور پیش ہو گئیں۔

خوب صورت و حسین ماں بیٹی کو دیکھتے ہی بابابی کے منہ سے رال پھٹنے لگی جبکہ شکار خود نفس میں متعید ہونے کے لئے بے قرار تھا۔

کون سا تعویذ اور کالے کا دم، بابابی اور ان کے درمیان بھری مریدی سے ہٹ کر رشتہ قائم ہو گیا بیٹوں کو لگام ڈالنے کے لئے بابابی نے اپنے ایک خاص مرید کو کہہ کر دور کے شہر میں نوکری کا بندوبست کر دیا، جبکہ خود ماں بیٹی کی قربت سے مزے اڑانے لگا۔

ایسے جیسے ہوئے بیروں کے مرید بھی ان کی طرح ذلت کے گڑھوں میں گھڑے ہوتے ہیں ایک خاص مرید کی نظر جب شبنم پر پڑی تو وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔

بابابی کو آستانہ کے لئے ایک کینال زمین دی ساتھ ہی نذرانے کا ڈھیر بھی بطور عقیدت پیش کیا اور بدلے میں کنیز شبنم کا ہاتھ مانگا۔

بابابی نے نظر عنایت کرتے ہوئے اس بار ہاتھ آئی بارات سے مل کر محفوظ ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

مرید نے اسے بھی غنیمت سمجھا، شبنم اب بابابی کے علاوہ مرید کی بھی منظور نظر بن گئی۔

☆.....☆.....☆

بابابی کے آستانے پر ماں بیٹی اسنے چاہنے والوں کے ساتھ عیاشیوں کی دلدل میں ڈھنڈی گئیں۔

فاشی کے قصے آستانے سے گھر کی دیواروں تک آ پہنچے۔

شبنم کا خاوند مجیب طیش میں آ گیا۔ شبنم کو مارا پڑا، آئندہ سیکے اور کسی بھی آستانے پر جانے سے سختی سے منع کر دیا۔

## ”رزق مقدر“

حضرت حذیفہؓ نے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی بھیجی ہے کہ کوئی شخص نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنا مقدر رزق پورا نہیں کر لیتا۔ اگرچہ میرے اس کو پہنچے۔ پس جب یہ بات ہے تو تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور روزی تلاش کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز مت کرو اور تاخیر رزق کی صورت میں گناہوں کے ساتھ رزق طلب نہ کرنے لگنا اور جو رزق حلال اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے (بزار)

(ابن حبیب خان - کراچی)

ہونے لگی، شور و غل، آلودگی اور رش سے ان نفیس لوگوں کا دم گھٹنے لگا۔ آبادی سے ہٹ کر جنگلے بنانے شروع کر دیے، روپے پیسے کی ریل جیل نے ان کا غرور اور تکبر آسمان پر پہنچا رکھا تھا، اپنے علاوہ انسانوں کو گھٹیا، حقیر، کتھڑ اور کیڑے کوڑے سمجھتے تھے ہمیں کہاں خاطر میں لاتے۔

ہم سے دیران ٹھکانے بھی چھین لئے گئے، سر چھپانے کے لئے ہمیں جگہ کا ملنا حال ہو گیا زندہ انسانوں نے جب ہم سے زندگی چھیننا چاہی تو ہمیں وہ لوگ عظیم اور اپنے ہمدرد محسوس ہوئے جو ان زندہ لوگوں کے گھر، جنگلے، باغات، بازار، کولھیاں اور لکڑی گاڑیاں چھوڑ کر قبرستان کی خاموش مگر پراسر زمین کے مقیم بن گئے تھے۔

ان مرحومین کی شرافت، بے بسی اور انسانیت دوستی سے متاثر ہو کر قبرستان کے اندر کھنڈرات اور چھاڑیوں پر بے قرار کیا۔

رات کو قبرستان میں قبروں کے اندر نیک و بد مرحوم ہوتے اور ہم چڑیلوں کی مٹھلیں جھٹیں۔

رابطہ کیا اور تمام واقعات اس کے گوش گزار کئے۔ اس بابا جی نے جھروالے دن سب لوگوں کے سامنے سچ چور ہے پر چڑیلوں کو بلا کر ان سے حقیقت حال جاننے کا اعلان فرمایا۔

پنچایت، مدی، ملزمان اور تمام گاؤں کے لوگوں کو چوک میں اکٹھے ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

جھروالے دن بزرگ نے ایک مکان کی دیوار کو سیاہ چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا پوری دیوار جب کالی چادر سے چھپ گئی تو بابا جی نے مخصوص منتر پڑھنا شروع کیا منتر پڑھتے ہی اس سیاہ چادر پر ڈراؤنی شکلوں والی چڑیلوں کا غول نظر آنے لگا جب سب چڑیلیں نمودار ہوئیں تو بابا جی نے ان کی ملکہ چڑیل سے سوال کیا۔

”سنا ہے تم ساکھ مسیح کی قید میں ہو اور اس کے کہنے پر انسانوں کا نقصان کرتی ہو۔ حمیدہ کی گائے کو بھی تم نے ساکھ مسیح کے کہنے پر ہلاک کیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ تمام الزامات سننے کے بعد ملکہ چڑیل انتہائی مودبانہ انداز میں بولی۔

آبادی سے دور پراسرار جنگلات، پہاڑوں اور کھنڈرات میں ہم سکون سے زندگی کی گاڑی میں محسوس تھیں رہائش کے لئے آسائشات سے محروم حویلیوں اور جنگلوں کی خواہشمند نہیں تھیں، محدود ضروریات اور خواہشات تھیں جو آسانی سے پوری ہو رہی تھیں کسی قسم کے مسائل اور پریشانیوں سے دور دور تک واسطہ نہ تھا۔

بڑھتی آبادی نے دیہاتوں سے شہروں کی طرف اور شہروں سے دیہاتوں کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا یہ آبادیاں، دیہاتوں، شہروں کو نشانہ بنائی، جنگلات اور کھنڈرات تک جا پہنچیں ہمارا جنگلات اور کھنڈرات میں بے پراں شہری آسائشات سے لطف اندوز ہونے والے معززین نفیس اور انسانیت کے ٹھیکیداروں کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

ان لوگوں کو اب شہر کی زندگی بھی ناگوار محسوس

کھڑے، تیزاب اور پارہ ڈالا گیا اور یہ بیڑے باری باری گائے کو کھلا دیئے۔

زہریلے مادوں اور کیلوں، بلیڈوں پر مشتمل آٹے کے بیڑے کھاتے ہی گائے بیمار ہو گئی زمین پر گر گئی چاروں پاؤں بے قراری سے ادھر ادھر مارنے لگی۔

حمیدہ نے نمبردار کے ہمسائے سے قصائی کو بلایا۔ ساتھ ہی نمبردار کا بیٹا بھی بلایا اس کے علاوہ چند اور مرد حضرات اکٹھے کر کے سب کے سامنے گائے حلال کروائی چڑا وغیرہ اتار کر جب پیٹ کا ٹاٹا گیا تو اندر بہت سے زخم تھے۔

جب اونچھڑی کو کاٹا گیا تو چارے کے ساتھ آٹا، بلیڈ، پھین، اور کیل بھی برآمد ہوئے۔ ان تمام اشیاء کو کاٹا گیا تو حمیدہ نے دیکھتے ہی دوپٹے سے اتار کر دور پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے منہ پر پتھر مارنے لگی۔

شبنم نے جب ماں کو روتا دیکھا تو وہ بھی ماں کے ساتھ زور زور سے چھین مار کر رونے لگی۔

پیٹ سے تمام سامان نکال کر دھویا گیا اسے سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاہ پر میں بند کر کے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔

اگلے دن ماں بیٹی گائے کی ہلاکت کا سبب جاننے کے لئے بابا جی کے حضور پہنچ گئیں۔

بابا جی نے تمام حالات و واقعات کو ایک خاص رنگ دے کر تمام الزام ثبوتوں کے ساتھ حمیدہ اور گھروالوں پر لگایا۔

یہ سب اشیاء پنچایت اکٹھی کر کے حمیدہ نے سب لوگوں کے سامنے رکھیں بابا جی کے حساب کا فلسفہ بیان کیا اور تمام واقعات میں حمیدہ اور اس کے گھروالوں کو ملوث کیا۔

☆.....☆.....☆

حمیدہ کے ساتھ پنچایت میں موجود ایک شخص نے علاقے کی معروف، ہر دھڑ بزرگ شخصیت سے

مگر عشق کی آگ نے عزت، غیرت، انا، خودداری کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا، ایسی دھمکیوں اور پابندیوں نے خاک اثر دکھانا تھا۔

مرید اور شبنم ایک دوسرے کی زلفوں کے اسیر اور ایک جان دو قالب تھے۔ سماجی رکاوٹوں کو روندنے کا فیصلہ کیا۔

بابا جی اور آٹھنا کے کہنے پر خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔ یہاں بھی بابا جی کا اثر و رسوخ کام کر گیا۔

کسی بھی پیشی کی اطلاع حمیدہ کو نہ مل سکی، عدم پیشی پر یکطرفہ فیصلہ ہوا شبنم کو طلاق ہو گئی حمیدہ کے نام کی زنجیر کے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی اب سب لوگوں کو خوب گل کر بے رحم کا موقع مل گیا۔

حمیدہ نے اپنے دفتر کی سماجی ورکر سے شادی کر لی جو متعلقہ شاخ کی سربراہ بھی اس کے دن بدلے لگے۔

میاں بیوی کی تنخواہ بہت زیادہ تھی، تھوڑے عرصے میں شہر سے پلاٹ خرید کر ایک خوب صورت گھر بنالیا۔

حمیدہ کا ایک بھائی اور بہنوئی گاؤں میں رہتے تھے ان کو ملنے جب حمیدہ آتا تو دفتر کی ٹیوٹا کر لائیں بیوی کے ساتھ تحائف سے لدا پھندا بھائی کے گھر آتا۔

روپے پیسے کی ریل جیل نے اس کے انداز و اطوار تبدیل کر دیئے تھے۔ خوشحالی کے جھولے میں حمیدہ اور اس کے گھروالوں کو جھولتے دیکھ کر حمیدہ اور شبنم کے سینے پر سانپ لونتے۔

وہ ہر صورت حمیدہ اور اس کے گھروالوں کو زک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور تو کچھ نہ کر سکے ان کی ایک آسٹریلیا کی گائے تھی جس کا ریٹ دو لاکھ روپے لگ چکا تھا اور انہوں نے بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس گائے کو ہلاک کر کے الزام حمیدہ اور اس کے گھروالوں پر لگانے کا فیصلہ کیا گیا ایک دن انہوں نے کچے آٹے کے بیڑے بنائے ان میں خواتین کے سر کے بال، کیل، پھین بلیڈوں کے



ہم میں سے بھی کچھ نیک فطرت، رحم دل، قابل احترام، اور کچھ بد فطرت، بد حرام، تیز طرار کام چور اور انسانیت دشمن تھیں۔

ان کا غور بھی، زندہ مغرور دولت میں کھیلنے والے لوگوں کی طرح سر چڑھا تھا۔ اپنے پیاروں کے درمیان ہم زندہ چڑیلوں کی زندگی ان دنیا دار دوزخ نما پیٹ اور شیطان کی آنت کی طرح طویل خواہشات کے مالک حریص دنیا داروں کو کھٹکتے تھے۔

دولت کی سیاہ کاری سے مقدر کو کالا کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے اٹلے سیدھے عمل چلے اور تعویذ گنڈوں کی مدد سے تیز طرار بد کردار چڑیلوں کو قبضے میں کر کے ناجائز کام کروانے کا وعدہ شروع کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کم و بیش نو سو سال تک زندگی گزارنے والے اللہ کے خاص بندے آخر کار موت کی وادی میں مقید ہو گئے اسی طرح ہر زندہ زندگی کا اختتام موت ہے، کسی بھی شخص کو جتنا عروج ہو آخر کار زندگی کے کنارے سے موت کے گڑھے میں چلا تک لگا تا ہے۔

نیک کام کا صلہ اگر چہ دیر سے ملتا ہے مگر نیکی اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اپنی وادی چمک سے ہر آنے والا سیاہ راستہ روشن کر دیتی ہے اور برائی کا انجام برا ہے۔ کیونکہ گندم ہونے سے بھی چنے نہیں اگتے۔

چڑیلوں کو اپنے قابو میں لانا اتنا بھی آسان نہیں، لیکن کچھ لوگ خدا اور ان کا مسئلہ بناتے ہیں۔ اکثر کہتے سنا گیا ہے کہ ”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“

اگر فر بادودھ کی نہریں کھود سکتا ہے تو چڑیلوں کو قبضے میں لانا کون سا مشکل کام ہے۔

جس طرح ایک پرہیزگار شخص وقتی طور پر آزمائش کے جھنجھکے میں جکڑا جاتا ہے مگر اس کی سچائی پرہیزگاری اور ایمان کی مضبوطی پر مشکل گھڑی کے سامنے دیوار چین کی طرح سینہ سپر ہوتی ہے۔

مشکلات کی گھڑیاں دھوئیں کے باد کی طرح

مٹ کر فتنہ ہو جاتی ہیں۔ مگر شیطان انسان کا ازلی دشمن ہمیشہ مصائب کے اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کے منصوبے بنا رہتا ہے جو انسان اس کو اپنا رہنما مان لیتا ہے شیطان خوب چن چن کر اس سے بدلے لیتا ہے چڑیلیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں دودھ کی طرح صاف کردار کی مالک چٹانوں کی طرح مضبوط حوصلوں اور ارادوں کی مالک چڑیلوں کو لاکھ چلے کٹی تھویر آدھی رات کے وقت ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر کچھ دریا میں مخصوص کلمات پڑھے جائیں دم، مرا تے جو مرضی پاؤں نیلے جائیں قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔

مگر بد کردار چڑیلوں کو فطرت کے خلاف کام اور گندی جگہوں پر گندے عمل کر کے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

ایسے بد کردار شخص کی شکل پر منحویت برستی ہے، رب کی پھلکار سے چہرہ بے نور ہوتا ہے شیطان کا ہیر و کار اور قریبی سامھی بن جاتا ہے۔

جس طرح شیطان روز ازل سے ملعون ہے اسی طرح ایسا مکروہ کردار کا مالک شخص بھی ہمیشہ ملعون سمجھا جاتا ہے سوائے روپے کی زیادتی کے باقی تمام دنیاوی فتنے اور روحانی آسائشات اور سکون کو اس سے چھین لیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ بے اولاد ہوتا ہے شکل قابل نفرت ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے کو اس سے دشمن اور بد بو آتی ہے۔

یہ شخص انتہائی سفاک، پتھر دل اور ظالم ہوتا ہے، رحم دلی کے معنی بھی نہیں جانتا انتہائی حریص، خود غرض اور مفاد پرست ہوتا ہے۔

روپے پیسے کا پجاری ہوتا ہے، اس کا دین، ایمان اور زندگی کا مقصد صرف پیسہ ہوتا ہے ایسا شخص جب مرتا ہے تو اس کی شکل بگڑ جاتی ہے۔

جیسے مردار کا گوشت گدھ کھاتے ہیں ایسے ہی اس کا مال کھانے والے گدھوں کی طرح جھنڈوں کی شکل میں مال پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

جس مال کو وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر اکٹھا کرتا ہے، موت کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح لحوں میں ختم ہو جاتا ہے۔

جو چڑیلیں ایسے بد قماش لوگوں کے قبضے میں آ جاتی ہیں وہ انسان کی طرح ظالم، بد طبیعت، بد کردار، بد دل اور لالچی نہیں ہوتیں کہ بلا وجہ انسانوں کو تنگ کریں ان کا جانی اور مالی نقصان کریں۔

ہم چڑیلیں کون ہوتی ہیں انسانوں کو ان کی مالوں کی سزا دینے والی، ہم نے اس زمین پر کبھی بھی زمین یا اس کے ہیر و کاروں کی طرح خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔

تمام مخلوقات کی طرح ہم چڑیلیں بھی امتحان لئے اس دنیا میں ہیں اور زندگی کی ہر سانس، فعل و عمل کی جواب دہ ہیں۔

انسانوں کی طرح نیک عمل کو آنے والی کل تک بھی بھی ملتوی نہیں کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ مالک و خالق کی یاد سے خالی ہو نہ کر گزرے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اوپر والا ہم سے راضی ہو جائے کیونکہ اگر اوپر والا راضی ہو گیا تو ہم اس دنیا میں بھی ایسا ہو جائیں گی اور جب اس کے حضور پیش ہوں گی تو شرمندگی نہیں ہوگی اور وہ بھی ہم انسانوں کی طرح دلیر نہیں کہ موت کے بعد دیکھا جائے گا زندگی سے الگ مرے گا اور حرام حلال کو پس پشت ڈال دو۔

ہمیں قابو کرنا اتنا بھی آسان نہیں، یہ جتنے بھی بابا، پری بابا، تعویذ گندے والے بابا ہیں ہمارے بے میں سراسر جھوٹ بولتے ہیں ہم اتنی بھی کمزور انسانوں کی جان اور مال کو نقصان پہنچائیں۔

ایسے بابا سراسر جھوٹے، دغا بازار اور بے ان ہیں اور یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم ان کے ناجائز امیر انجام دیتی ہیں۔

نی وی، اخبارات اور رسالوں میں جو بے لے اشتہارات دیئے جاتے ہیں ان کا حقیقت سے

قطعا کوئی تعلق نہیں۔ سالوں اور مہینوں کا کام، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں میں کرنے کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے ایسا نہیں ہے لیکن اگر بغیر محال مان بھی لیا جائے تو جو چڑیل ایک پلید کام کرنے والے شخص کے قاب و میں پلیدی کی حالت میں چلے کٹی کے بدلے قابو میں آ جاتی ہے تو جو چڑیل ایسے مکروہ بے دین شخص سے جان نہیں چھڑا سکتی وہ دنیا محرم لڑکے اور لڑکی کے درمیان پیار کی بیٹگیں کیسے بڑھا سکتی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ اولاد دے اس کو ایک چڑیل اولاد کیسے دے سکتی ہے ایسا ممکن نہیں بلکہ یہ طاقت صرف اور صرف اوپر والے مالک کے پاس ہے۔

جن میاں بیوی کا آپس میں جائز طریقے کے مطابق نکاح ہوا ہے وہ لوگ اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتے تو ایک چڑیل کیسے ان کے درمیان پیار و محبت اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے۔

یہ رٹے رٹائے جملے ہیں دشمن قابو میں من پسند جگہ شادی، اولاد کا نہ ہونا، لاٹری ٹکٹ اور پرائز پاٹر کا پہلا انعام لگتا۔

پڑھے لکھے اور ان پڑھ لالچی لوگ ایسے جھانے میں آ جاتے ہیں۔ انسانوں میں ایک عجیب خواہش پائی جاتی ہے کہ بیٹھے بیٹھے بغیر حرکت کئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے کی بجائے روپے پیسے کے بل بوتے پر جائز ناجائز خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں پانچ وقت نماز پڑھنے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکتے اس کی اطاعت و بندگی کرنے کی بجائے اس کے احکامات کی صریح خلاف ورزی کرنے کے لئے کالے پیلے جادو کرنے والے چڑیلوں کو تابع رکھنے کا دعویٰ کرنے والے بابوں، پریوں کو کتنی کاناچ بچانے کا ڈھونگ رچانے والے جعلی عاملوں کے آستانوں پر حاضری دینا فخر محسوس کرتے ہیں اور روپے پیسے کے عوض فطرت تبدیل کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

جبکہ ایسا قطعا ممکن نہیں، جو بھی ہوتا ہے اللہ



## شہر خموشاں

نسرین رانا - کراچی

رات کا ہولناک اندھیرا قبرستان کی ویرانی ہر سو دہشت پھیلا  
دھی تھی کہ اتنے میں ایک خوفناک شکل انسان نظر آیا جو کہ  
اپنا ہی ایک ہاتھ چبا کر مزے سے کھا رہا تھا کہ.....

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والے دلت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے جنم لینے والی وحشت ناک کہانی

**اچانک** ای ان کی کار جو کہ اسپڈ سے لگا ہوں سے بولا۔  
”مطلب یہ ہے توحید صاحب جسے میں خوب جانتی ہوں۔“  
”یہ کار کو کیا ہوا۔“ توحید نے پریشانی سے کہا۔  
”میں خوب سمجھتی ہوں اس میں تمہاری کوئی شے ہوگی۔“ مہمانے شک بھری نگاہوں سے دیکھ لیا۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ توحید معنی خیز لگا ہوں سے بولا۔  
”مطلب یہ ہے توحید صاحب جسے میں خوب جانتی ہوں۔“  
”کیا جانتی ہو کیا کہے جارہی ہو۔“ توحید جھنجھلاتے ہوئے بولا۔  
”گاڑی اسٹارٹ کرو۔“ صبا غصے سے بولی۔  
”تو اور کیا کر رہا ہوں اتنی دیر سے۔“

ایسی کسی بھی حقیقت، واقعہ کا روناہہ جو ہے،  
کرامت اور پراسراریت سے ہمارا دور دور تک کوئی  
تعلق نہیں۔

یہ سب ہم پر اترام تراشی اور بہتان ہے ان  
جھوٹی کہانیوں کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کو دھوکہ  
دے رہے ہیں۔

حمیدہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے، ایسے کسی بھی  
واقعہ، کارروائی یا واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

گائے کی ہلاکت میں ہمارا ذرہ برابر کردار نہیں  
جس نے اسے ہلاک کیا ہے اس کو تلاش کرو۔

جھوٹی کہانی سنا کر ہماری کردار کشی کی گئی ہے،  
گائے کی ہلاکت کے بارے میں حمیدہ اور اس کے  
چاہنے والے بابا بہتر جانتے ہیں انسانوں کے مسائل  
انسان جانیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“

تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے پر بزرگ نے  
چیزیل کا شکریہ ادا کیا جبکہ ان حقائق کو سنتے ہی حمیدہ شرم  
سے زمین میں دھنسے لگی۔ جھوٹ کا پردہ چاک ہونے  
پر پوری پختائیت نے لعن طعن کی اس کی اور گھر والوں  
کی سخت سرزنش کی۔

تعوذ گنڈوں کی مدد سے گائے کے قاتل  
کو تلاش کرنے کا یہ طریقہ ایک سازش اور خائفین  
کو بلا وجہ بغیر جرم کے پھنسانے کا منصوبہ قرار دیا۔

حمیدہ کو وارننگ دی گئی کہ جب تک ٹھوس ثبوت  
نہ ہو کسی پر بہتان، الزام لگا کر تنگ نہ کیا جائے۔

اگر آئندہ خائفین کو پھنسانے کی جھوٹی حرکت  
کی گئی تو اس پورے خاندان کو گاؤں بدر کر دیا جائے گا۔

حمیدہ اور گھر والے سخت ہراساں اور پریشان  
تھے پختائیت اور عجیب سے معافی مانگی اور شرمندہ  
بشرسار چہروں کے ساتھ گھر چلے گئے اور ایک لمبے  
عرصے تک لوگوں سے منہ چھپا کر جھوٹ کی منہ پرکھی  
کالک کو مٹانے کی کوششیں کرتے رہے۔



تعلاتی کے حکم سے ہوتا ہے پوری کائنات میں بکھرے  
ادنیٰ سے لے کر انسان، حیوان، دریا، سمندر، دیو و پریکل  
پہاؤ تک اس کے حکم کے پابند ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ ایک قطرے سے جھوٹ کا انسان  
خلق کر سکتا ہے شیر جیسے طاقتور اور ہاتھی جیسے دیو پریکل  
جانور کو پیدا کر سکتا ہے چوٹی سے لے کر زراف تک  
کو تخلیق کر سکتا ہے ہجر زمین سے جاندار فصل، بے جان  
اٹھ سے جاندار چوڑا پیدا کر سکتا ہے۔

جس نے کروڑ ہا سال قبل زمین کی تخلیق کے  
وقت قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے ان  
کے استعمال کی اشیاء سونا، چاندی، لوہا، تانبا، کرومائیٹ  
، پورینیم، دھاتیں، گیس، اٹھیل، کوئلے کے ذخیرے  
زمین کے نیچے چھپا دیئے اور ان کے تحفظ کے لئے  
اوپر پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

قیامت تک انسان ان اشیاء کو استعمال کر کے تھک  
جائے گا مگر ان کی مقدار میں ریت کے ذرے کے  
برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔

جس مالک نے بغیر ستونوں کے صدیوں سے  
نیلگوں آسمان کو کھڑا کر رکھا ہے زمین کے چھوٹے سے  
نگوے کو پانی کی سطح کے اوپر چٹا کر رکھا ہے۔

اس مالک کائنات کو بیٹا دینا مشکل ہے، میاں  
بیوی کے درمیان پیار کا جذبہ پیدا کرنا آسان نہیں  
، رشتوں ناٹوں کو طے کروانے اور ارب ہا مخلوق کو  
روزی دینے کے لئے کسی سے مشورہ کرنے کا پابند ہے۔  
نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

ہم چڑھیں، آسیب اور جنات بلا وجہ بدنام  
ہورہے ہیں۔

محترم بزرگوا! ہم دست بستہ عرض گزار ہیں کہ  
انسان ہی انسان کا دشمن نہ ہے انسان ہی انسان کو دھوکہ  
دے رہا ہے اس سے فراڈ کر رہا ہے جھوٹ بول کر ریت  
کے ٹھکڑے تعمیر کر کے روپے ایشورہا ہے پیار، محبت، عشق  
، مشق، روزی، اولاد، من چاہی خواہش کی تسکین کے  
جھوٹے وعدے تسلیم کر رہا ہے۔

توحید برابر گاڑی اشارت کرنے کی سعی کر رہا تھا۔  
 ”یہ ناکک چھوڑو اور گاڑی اشارت کرو۔ سیدھی طرح سے۔“ صبا ناگواری سے بولی۔  
 ”کیسا ناکک۔“ توحید حیرت سے بولا۔  
 ”کیسا ناکک جیسے کچھ جانتے ہی نہیں کتنے بھولے بن رہے ہو سڑ تو حید میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہارے اس ناکک کا مطلب مجھے سب معلوم ہے کوئی گاڑی واڑی خراب نہیں ہوئی ہے یہ سب تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تاکہ مجھ سے بات کر سکو اور.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔  
 پھر بولی۔ ”فورا گاڑی اشارت کرو۔“  
 ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔“ توحید بولا۔  
 ”تمہیں نہیں معلوم کیا۔“ صبا اسے دیکھتے ہوئے طنز یہ بنی کے ساتھ گویا ہوئی۔  
 ”تم نے مجھے اتنا دکھایا سمجھا ہے کہ میں تمہارے رشتے سے انکار کے بعد ایسا کچھ کروں گا۔“ توحید غصے سے بولا۔  
 ”میں کچھ نہیں جانتی بس فورا گاڑی اشارت کرو۔“ وہ چہرے کو دوسری طرف کرتے ہوئے بولی۔  
 ”گاڑی حقیقت میں خراب ہوئی ہے تم یقین کرو۔“ وہ کار سے اترتے ہوئے لا پرواہی سے بولا۔  
 اور پھر وہ کافی دیر تک کار ٹھیک کرنے کی اپنی سی سعی کرتا رہا۔  
 اچانک ہی بہت زور سے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔  
 واقعی ہوا بہت تیز ہوئی تھی درختوں کے پتے جیزی سے چلنے لگے لگے کار کے اندر بیٹھی صبا چاروں طرف دیکھتے ہوئے گھبراہٹ میں تھی۔  
 توحید جو کار کے اشارت نہ ہونے کی وجہ سے صبا کے سوال سے اور اب اس تیز ہواؤں سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر کار میں واپس آ کر بیٹھ گیا۔  
 ”کیا ہوا.....؟“ صبا پریشان ہوتے ہوئے

بولی۔  
 ”کچھ نہیں گاڑی اشارت نہیں ہو رہی ہے نامعلوم کیا ہو گیا ہے۔“  
 ”تو معلوم کرو تا۔“  
 ”کیسے معلوم کروں اپنی سی کوشش کرتی سمجھ نہیں آ رہا ہے کیا ہوا ہے۔“  
 ”اب کیا ہوگا۔“  
 ”کوئی نظر بھی تو نہیں آ رہا ہے جس سے ہیلپ لیں، یہاں تو دور دور تک نہ کوئی گھر ہے نہ کوئی انسان، عجیب سی جگہ ہے۔“ وہ پریشان ہوتے ہوئے چاروں طرف نظر ڈالنے لگا شاید کوئی مل جائے۔  
 اچانک کار کی کھڑکی کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا اس کا عجیب و غریب لباس تھا پھر وہ کھڑکی میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔  
 ”سفری ہو بیٹا۔“  
 ”جی بابا ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے کیا آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔“  
 ”بیٹا گاڑی ٹھیک کرنی مجھے کہاں آتی ہے اور نہ یہاں کوئی گھر نہ کیراج وغیرہ ہے۔ تم ایسا کرو اس قبرستان کو پار کر کے دوسری جانب چلے جاؤ وہاں آبادی ہے کیراج بھی ہے کسی کو لے آؤ وہاں سے گاڑی ٹھیک کروانے کے لئے، یہاں مت رو کیونکہ یہ جگہ آسپ زدہ ہے۔“  
 قبرستان کو پار کرنے کے خیال سے صبا نے ڈرتے ہوئے توحید کا ہاتھ پکڑ لیا، جانے کیوں اس بوڑھے سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔  
 بوڑھا کافی پراسر اسرا لگ رہا تھا صبا کو بوڑھے سے اور اتنی رات میں قبرستان میں جانے سے ڈر لگ رہا تھا توحید اسے حیرت سے دیکھنے لگا یہی لڑکی تھی جب توحید نے اسے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے اس کا نازک ہاتھ پکڑا تھا تو اس نے کتنی بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور آج نہ صرف اس کا ہاتھ پکڑا تھا بلکہ اس کے سینے سے لگ گئی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو بیٹے جلدی کرو رات گہری ہو رہی ہے۔“ بوڑھے نے دونوں کو غور سے دیکھ کر کہا۔  
 ”اتنی رات میں قبرستان سے پار جانا ٹھیک رہے گا۔“  
 ”کیا کوئی اور حل نہیں۔“ توحید نے بوڑھے سے پوچھا۔  
 ”نہیں.....“ بوڑھے نے سخت لہجے میں کہا۔  
 ”وہاں جانا ہی پڑے گا کیونکہ وہاں آبادی ہے۔“  
 توحید نے صبا کے نازک ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ چلو“  
 ”وہ اس کا ہاتھ پکڑے کار سے باہر آ گیا۔“  
 قبرستان سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ وہ بوڑھا بھی ان دونوں کے ساتھ ہوا۔  
 صبا نے توحید کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا، ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے ہاتھ سے توحید کے ہاتھ کو مضبوط سے تھامے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔  
 ”بابا اتنی دیر سے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ کوئی مل جائے مدد کے لئے مگر کوئی نظر نہیں آیا اور پھر آپ اچانک ہی نظر آ گئے۔“ توحید نے سوال کیا۔  
 ”مگر یہ کیا بوڑھا غائب تھا۔“ بابا کہاں گئے؟“  
 توحید بولا۔  
 ”مجھے تو وہ کوئی بھوت لگتا ہے جو اچانک ہی غائب ہو گیا۔“ صبا بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔  
 ”میں قبرستان میں نہیں جانا چاہتا ہوں، دیکھو وہاں غائب ہو گیا ہے۔“  
 ”اس کے غائب ہونے سے میں بھی پریشان ہوں مگر جانیں تو کہاں جائیں قبرستان کی دوسری طرف آبادی ہے اس لئے وہاں جانا ضروری ہے۔“  
 توحید بولتے ہوئے قبرستان میں صبا کا ہاتھ تھامے گئے داخل ہو گیا۔  
 دونوں کے داخل ہوتے ہی تیز ہوائیں چلنے

لگیں تو توحید نے صبا کے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید سخت کر دی اور آگے بڑھنے لگا۔  
 توحید جلد از جلد اس شہر خاموشاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ صبا بہت ڈر رہی تھی۔ اور رات بھی آگے بڑھ رہی تھی۔  
 وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے کہ کسی چیز سے ٹکرائے صبا گرنے لگی تھی کہ توحید نے صبا کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ ڈال کر سنبھال لیا ساتھ اس نے نیچے دیکھا تو زمین پر ایک انسانی کھوپڑی پڑی تھی، ان دونوں کے پاؤں سے یہی کھوپڑی ٹکرائی تھی۔  
 صبا ڈر کر توحید سے لپٹ گئی۔  
 توحید نے اپنے پاؤں سے کھوپڑی کو ایک طرف کرنا چاہی تھی کہ اچانک انسانی کھوپڑی نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوپڑی کی دونوں آنکھیں اب روشن ہو چکی تھیں۔ توحید نے صبا کا ہاتھ پکڑے اس جگہ سے آگے بڑھ گیا۔  
 وہ تو اچھا تھا کہ صبا نے اس کھوپڑی کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں ورنہ تو وہیں بے ہوش ہو جاتی۔  
 توحید اور صبا دونوں ہی قرآنی آیات پڑھ رہے تھے اور ڈر جو کہ ان دونوں کو اپنے گھٹنے میں جکڑنے کے لئے تلا ہوا تھا۔  
 کافی چلنے کے بعد بھی قبرستان سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔  
 مزید کچھ دور چلنے کے بعد دونوں کے قدم ایک آدمی کو دیکھ کر رک گئے۔  
 وہ آدمی تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور کوئی لمبی سی چیز ایک ہاتھ میں دبائے کھا رہا تھا رات بڑھ جانے سے اندھیرا کافی ہو گیا تھا ایک تورات اور چاروں طرف اندھیرا، دوسرے وہ آدمی کا لایا ہوا تھا۔ اس آدمی نے عجیب سا لباس پہنا ہوا تھا۔  
 ”چلو اس کے پاس چلتے ہیں۔“ توحید بولا۔  
 ”نہیں مجھے تو لگتا ہے یہ کیوں ڈاکو ہے۔“ صبا نے اپنا خشک ظاہر کیا۔



## اشتر

”یہ آج پارک میں اتنا کوڑا کیوں پھیلا ہوا ہے اس سے پہلے میں نے بھی پارک میں اتنے کاغذ کھڑے ہوئے نہیں دیکھے۔“

”کل پارک میں آنے والوں میں پمفلٹ تقسیم کئے گئے تھے جن میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ کوڑا کرکٹ پارک میں ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ یہ سب وہی پمفلٹ ہیں۔“

(انہیں ستار-کھڑو ضلع ساکھڑ سے)

دیکھتے ہوئے صبا سے مخاطب ہوا۔

”صبا اپنا دوپٹہ کس کے باندھ لو اور قرآنی آیات کا اور شروع کر دو اور یہاں سے بھاگو۔“

صبا کو تو جیسے سکتے سا ہو گیا تھا۔

پھر توحید صبا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جھوپڑی کی طرف تیزی سے بھاگا۔

پھر اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک اور منظر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔

صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی تو توحید دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

ساری قبریں پھٹ گئی تھیں اور مردے اپنی اپنی قبروں میں کھڑے تھے۔

اب تو توحید بھی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اب اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ صبا کا ساتھ اور اب مردوں کا نظر آنا دلدار ہوا تھا توحید نے قرآنی آیتوں کا پڑھنا بند نہیں کیا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا اور اللہ سے مدد مانگنے لگا تھا۔ صبا کو اٹھا کر اس نے اپنے کندھے پر ڈالا، اتنی سردی کے باوجود وہ سینے میں شرابور تھا۔

سارے مردے اپنی اپنی جگہ سے سیدھے

اچانک ہی تیز ہو گئیں چلنے لگیں ادھر صبا کو ہوش آ گیا تو توحید نے فوراً صبا کو چلنے کے لئے کہا اور دونوں تیز ہوا کے باوجود راستہ ڈھونڈنے لگے۔

ہوا کچھ اور تیز ہوئی تو صبا کا دوپٹہ اڑا اور ایک درخت پر جا کر لنگ گیا سردی بھی بڑھ گئی تھی توحید نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا اور خود دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

”رہنے دیجیے.....“ صبا نے توحید کو دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرتے دیکھا تو کہا۔

”ہمیں یہاں سے جلدی نکلتا چاہئے۔“

ہوا بہت تیز چل رہی تھی دوپٹہ درخت کی شاخ پر لہراتا تھا توڑی اور کوشش کر کے آخر توحید نے دوپٹے کے پلو کو پکڑ ہی لیا۔

”یہ لیں مختصر صبا۔“

صبا نے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔ ”اتنی دیر ہو گئی چلتے چلتے مگر راستہ باہر جانے کا نہیں مل رہا ہے۔“

”ہمیں واپس جانا چاہئے جہاں ہماری گاڑی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو پہلے یہ سامنے جھوپڑی نظر آ رہی ہے یہاں دیکھ لیتے ہیں شاید یہ گورن کا گھر ہے لگ رہا ہے کہ وہ مل جاتا ہے اور ہماری مدد کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلتے ہیں۔“

ہوا کافی تیز چل رہی تھی اچانک کسی شور کی آواز سنائی دی تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب سا منظر دکھائی دیا۔

ساری قبریں زور زور سے ہلنے لگی تھیں درخت اپنے ہلنے لگے جیسے چھوٹا سا پودا تیز ہوا سے ہلتا ہے

مردے قبرستان میں قبروں کی ہلنے کی آوازیں گونجنے لگے ایک ہنگامہ سا ہو رہا تھا آہستہ آہستہ آوازیں تیز ہونے لگیں اور پھر ساری قبریں چلنے لگیں۔

ترتربز آوازیں ایسی آئے لگیں جیسے کوئی پتھر پڑ رہا ہو۔ آوازیں اور بلند ہونے لگیں اور قبریں بہت

تیزی سے ہلنے لگیں توحید حیرت اور خوف سے یہ سب

”مگر مجھے تو بس اپنا ہی گوشت کھانے کی عادت ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے پاؤں پر زور سے مارا اور ہاتھ جسم سے الگ ہو کر گر پڑا تو نیچے سے اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر کھاتے ہوئے بولا۔

”یہ میری عدا ہے میرا کھانا ہے۔“ وہ اپنا ہاتھ بھینچوڑنے لگا۔

توحید کو کراہیت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو بھانسنے بھی نہیں دے رہا تھا اسے اور صبا کو مار بھی نہیں رہا تھا

آخر یہ چاہتا کیا ہے میں کب تک یونہی صبا کو لئے اس خوف ناک آدمی کے آگے کھڑا ہوں گا۔

پھر توحید کو خیال آیا یہ ہمیں کھائے گا بھی نہیں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا ہے، اب تو اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں، مجھے فوراً یہاں سے نکلتا چاہئے اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت آئے جلدی یہاں سے نکلتا چاہئے۔

توحید نے بھانک کر آدمی کو دیکھا جو اپنا ہی پیرا ہاتھ کھا کر اس کی ہڈیاں بھی چبا گیا تھا اور اب دوسرا ہاتھ بڑے مزے سے سر جھکائے کھا رہا تھا۔

اور پھر توحید موقع غنیمت سمجھ کر فوراً وہاں سے صبا کو کندھے پر ڈالے بھاگ کھڑا ہوا۔

صبا کو کندھے پر اٹھائے کافی دور تک بھاگتا رہا پھر ایک گھنا درخت اس کے سامنے آ گیا تو توحید نے

صبا کو نیچے گھاس پر لٹا دیا اور صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا اور اس وقت توحید کو صبا کے لئے پانی کی اشد ضرورت تھی مگر پانی نہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں وہ سوچنے لگا یہاں کا گورن کہاں چلا گیا ہے سارا شہر خوشاں دہلیہ

لیا ہے ہو سکتا ہے وہ بھی یہاں سے ڈر کر بھاگ گیا ہو۔

توحید بہت مضطرب ہو رہا تھا رات کافی ہو گئی تھی باہر جانے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا اور کوئی رہبر بھی نہیں تھا ایک ملا بھی تو بھانک بولا نما آدمی

ہر طرف بڑی عجیب سی خاموشی تھی اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا جیسے بہت شور و غل ہو رہا ہے۔

”اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی رہبر ہو اور ویسے بھی یہاں اور کون ہے جس سے ہم راستہ پوچھیں باہر جانے کا۔“ توحید یہ کہتے ہوئے صبا کا ہاتھ پکڑے اس آدمی کی طرف چلنے لگا۔

”سنئے۔“ توحید نے اس کے قریب جا کر بولا۔

”باہر جانے کا راستہ بتا سکتے ہیں کیا۔“

وہ آدمی جو گوشت کھانے میں مصروف تھا اس نے اپنا سر اٹھایا تو صبا اور توحید دونوں ہی ڈر گئے، صبا تو توحید سے لپٹ گئی۔

وہ آدمی اپنا ہی ہاتھ کھا رہا تھا اس کا ایک ہاتھ موجود تھا جسم کے ساتھ دوسرا ہاتھ بازو سے الگ تھا اور وہی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لئے ایسے کھا رہا تھا جیسے

بہت ہی سن پند کھانا کھا رہا ہو۔

توحید اور صبا کو دیکھ کر اس آدمی کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔

”یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں۔“

اور یہاں جو آتا ہے وہ واپس نہیں جاتا ہے یہ ہمارا شہر خوشاں ہے۔ یہاں ہمارا راج ہے۔“ اس نے تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”صبا بھاگو یہاں سے۔“ توحید صبا کا ہاتھ پکڑے بھاگنے کو تھا کہ صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

اور توحید کو پتا ہی نہیں چلا وہ کب بے ہوش ہو گئی تھی۔

”ہاہاہا.....“ اس آدمی کے بھانک تہقہہ سے سارا شہر خوشاں دہلیہ گیا۔

توحید نے فوراً صبا کو اپنے کندھے پر ڈالا اور بھاگنے کو تھا کہ وہ آسیب نما آدمی جھٹ توحید کے سامنے آ گیا۔

”بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے ڈر مت کیونکہ میں تمہیں اور اس خوب صورت لڑکی کو نہیں

کھاؤں گا اگر کھانا ہوتا تو اب تک تم دونوں میرے پیٹ میں پہنچ گئے ہوتے۔“ وہ بھانک ہنسی کے ساتھ

اپنے بڑے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

کھڑے تھے ان کی کوئی آواز تھی نہ ان میں کوئی حرکت تھی۔

توحید جمو پڑی کی طرف دوڑتا چلا گیا اور چند لمحوں میں وہ جمو پڑی کے اندر موجود تھا اس نے جمو پڑی کے باہر نہ دستک دی اور نہ آواز پریشانی اور خوف کے عالم میں وہ جلجت میں جمو پڑی کے اندر گھس گیا تھا۔

اندر جا کر اس نے سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔

”اوہ..... تم۔“ وہ حیرت سے بولا۔  
وہی گوشت خور آدمی اپنی ٹانگ کھا رہا تھا اسے دیکھتے ہی عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا۔

آگے تم اچھے معلوم تھا تم یہاں ضرور آؤ گے اور جاؤ گے بھی کہاں اس شہر خوشاں سے بچ کر۔ یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں، یہاں ہمارا راج ہے۔“ وہ زوردار تجھ کے ساتھ بولا۔

توحید پریشانی اور خوف سے کبھی جمو پڑی کے باہر کے منظر کی فکر کرتا تو کبھی اندر کا اس گوشت خور انسان جو بظاہر انسان نما تھا مگر حرکتیں درندوں جیسی تھیں گویا ہوا۔

”کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ بھوک مگی ہے کیا تمہیں، لو کھانا کھاؤ۔“ اس نے اپنی چٹائی ہوئی ٹانگ توحید کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

توحید نے پھر پھری سی لی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا کیونکہ اگر وہ اسے بغور دیکھتا تو اسے ایسی ہوجاتی۔ پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”ہاں تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گے کیونکہ تم تو انسان ہو۔“

توحید نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پٹنگ پر مباحثہ کرنا شروع کیا۔ ”قبرستان میں بھائے بھائے وہ بری طرح تھک گیا تھا اس نے دوبارہ منہ ہی منہ میں آہستہ آہستہ تلاوت شروع کر دی تھی۔

گوشت خور آدمی ہنسنے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے ڈر کر یہ پڑھ رہے ہوتا مگر ڈرو نہیں میں تمہیں

لیتا ہوں۔“

اور کوئی مردہ نہیں آتا ہے تب کیا کرتے ہو۔“ توحید کو اپنی صبا کی فکر ہوئی۔

”تو کیا سارا رہتا ہوں.....“ اس گوشت خور نے جواب دیا۔

پھر توحید بولا۔ ”محترم کیا آپ ہمارے لئے کچھ کر سکتے ہیں، میرا مطلب ہے ہمیں اس خوف ناک قبرستان سے باہر نکال سکتے ہیں؟“

”نہیں سا شہر خوشاں سے کوئی باہر نہیں جاسکتا ہے۔“ اس نے دوسری ٹانگ زمین پر کس کر ماری تو وہ ٹوٹ کر گر پڑی۔ اب سر اور دھڑ رہ گیا تھا پھر وہ دوسری ٹانگ کو بھی بھینچوڑنے لگا۔

وہ درندہ کھانے میں مصروف تھا اور توحید اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔

”پروردگار اس مشکل وقت میں ہماری مدد فرما نجانے ہمارے گھروالے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ رشتہ سے انکار کے بعد صبا کے گھروالے یہ نہ سمجھیں کہ صبا کے انکار کرنے پر میں نے صبا کو اغوا کر دیا ہے یا بھاگ کر لے گیا ہوں۔“

ایک بار پھر توحید اچھبے میں پڑ گیا، کیونکہ اس گوشت خور آدمی کے اب دونوں نے ہاتھ نظر آنے لگے تھے اور ساتھ ہی دونوں ٹانگیں بھی ثابت نظر آ رہی تھیں۔

توحید حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”کیوں پڑ گئے ناں حیرت میں۔“ وہ ہنسنے ہوئے منکے کی جانب بڑھا اور منکے سے خون نکال کر پینے لگا کہ اچانک توحید کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا پھر توحید گویا ہوا۔

”آپ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں واقعی اس خوف ناک شہر خوشاں پر آپ کا قبضہ ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ بولا۔  
”ہمارے لئے بھی کچھ کریں ہمیں کسی طرح

یہاں سے نکال باہر کریں شہر خوشاں سے جہاں ہماری گاڑی کھڑی ہے۔“ توحید کے لہجے میں التجا تھی۔

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے صاف انکار کیا تو توحید اس کی خوشامد کرتے ہوئے پھر بولا۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپ کو آپ کے گوشت کی قسم اس نئے نکلے دونوں ہاتھ پاؤں کی قسم۔“

”اوہو یہ کیا کہہ دیا تم نے زندگی میں سب سے زیادہ جو چیز اہم ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے جس کے بغیر میں رہ نہیں سکتا اور تم نے اسکی قسم دے دی جو میری غذا ہے میرا پسندیدہ کھانا ہے میرا اپنا گوشت اپنا کھانا میرے گوشت کی قسم دے دی اب تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔“

”اب ان کے لئے غذا کہاں سے لاؤں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”غدا مگر آپ تو اپنا گوشت کھاتے ہیں ناں۔“ توحید اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”بے وقوف انسان میں اپنا گوشت کھانا ہوں مگر میرے ساتھی تو دوسروں کا گوشت کھاتے ہیں۔“ بھیا تک آدمی توحید کو اور پٹنگ پر لپٹی بے ہوش صبا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

توحید اس کی باتوں سے مزید ڈر گیا۔ ”یا اللہ مجھ پر اور صبا پر رحم فرما۔“

پھر توحید گویا ہوا۔ ”میں نے آپ کو قسم دی ہے کیا آپ میری دی ہوئی قسم کو توڑ دیں گے۔“ توحید کو اپنے صبا کے بچنے کی جوا امید نظر آئی تھی وہ ڈھتلی ہوئی نظر آتی تو توحید نے اسے اپنی دی قسم کی یاد دلانی۔

”نہیں بالکل نہیں میں تمہاری دی ہوئی قسم کو نہیں توڑوں گا کیونکہ تم نے مجھے میرے ہی گوشت کی میری غذا کی قسم دی ہے اس لئے تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو کیسے بہلاؤں ان سے کیا کہوں انہیں کیا دوں گا۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”خیر جانے دو کوئی اور شکار آ جائے گا۔“

”چلو تمہاری مدد کرتا ہوں۔“ وہ ایسے بولا جیسے بہت بڑا احسان کرنے جا رہا ہو۔

اور اگر دیکھا جائے تو وہ حقیقت میں ان دونوں پر احسان ہی کرنے جا رہا تھا، ان کی زندگی بخش کر۔

پھر توحید جھٹ بولا۔ ”ذرا ٹھہریں میں صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں جب تک آپ باہر کے منظر میرا مطلب ہے ان مردوں کو ہمارے راستے سے ہٹا دیں۔“ توحید نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”اس کی فکر نہیں کرو، وہ سب اپنی اپنی قبروں میں اب تک جا چکے ہوں گے اور ہنوتم اس کے سامنے سے۔“ گوشت خور نے توحید کو صبا کے سامنے سے ہٹنے کا کہا۔

”کیوں.....؟“ توحید حیرت سے بولا۔

صبا کو ہوش میں لانے کے لئے اس گوشت خور نے یہ کہتے ہی صبا کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ شاید کچھ پڑھا بھی تھا۔ اور پھر اس نے صبا کے چہرے پر چھوٹک ماری تو صبا نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے اس گوشت خور کو دیکھ کر خوف سے اٹھ بیٹھی اور جھٹ پٹنگ سے اتر کر توحید سے لپٹ گئی تو توحید نے بھی اسے اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں فوراً لے لیا۔

”اب چلو بھی یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔“

گوشت خور نے خوف ناک ہنسی بھرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں چلے ہم چلے کو تیار ہیں۔“ توحید نے کہا۔

”میرا ہاتھ پکڑ لو اور اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

اس نے اپنا کالا بال بڑے بڑے بالوں سے بھرا ہاتھ توحید کے آگے کیا اور تم لڑکی میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لو۔“ تو صبا خوف سے توحید کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کے اشارے سے نہیں کرنے لگی۔

تو گوشت خور بولا۔ ”تم انسان بڑے ہی عجیب

ہو ایک بات مان لو تو ساری بات منواتے ہو ارے بابا میں تمہیں کھاؤں گا نہیں۔ ہاتھ پکڑو۔“ وہ جھنجھلا

کر بولا۔

توحید نے فوراً صبا کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

صبا یہ ہمیں ہماری گاڑی تک باہر پہنچا رہے ہیں ان کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”دیر نہیں کرو جلدی سے ہاتھ پکڑ لو ورنہ اس کے سوا کوئی اور چار نہیں ہے دیکھو انہوں نے ہمیں ابھی تک کچھ نہیں کہا ہے۔“ توحید صبا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

صبا نے ڈرتے ہوئے گوشت خور کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی۔

”ہماری گاڑی تو خراب پڑی ہے تو پھر۔“ صبا توحید پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی۔

”وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اب دونوں آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہیں کہوں آنکھیں مت کھولنا اور نہ ہی بات کرنا۔“

دونوں نے آنکھیں بند کر لیں تو انہیں ہلکا سا جھٹکا لگا اور محسوس ہوا کہ وہ ہوا میں معلق ہوں پھر تھوڑی دیر بعد گوشت کی آواز آئی۔

”آنکھیں کھول دو۔“ تو دونوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ گوشت گور اور وہ دونوں اب اپنی کار کے پاس کھڑے تھے۔

”اب تم دونوں بے خوف و خطر اپنی گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے باہر نکل جاؤ۔“ گوشت خور نے کہا۔

دونوں کار میں بیٹھتے ہوئے گوشت خور کو احسان مند نظروں سے دیکھتے گئے تو گوشت خور نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ اب چلے جاؤ۔

اور اچانک ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔ توحید نے کار اشارت کی تو دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے گاڑی اشارت ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

توحید اور صبا دونوں چچا زاد کزن تھے۔ توحید

صبا کو پسند کرتا تھا اور جانے کب یہ پسند محبت میں بدل گئی تھی۔

توحید نے اپنا رشتہ بھی بھیجا مگر صبا نے اپنے والدین سے صاف کہہ دیا تھا کہ توحید کو پسند نہیں کرتی اور جب پسند نہیں تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور توحید کو اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے سے اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی اور اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے اسلٹ کا بدلہ ایسے لیا کہ اس نے صبا سے قطع کلامی کر لی۔

اس شام کو توحید کے گھر دعوت تھی تمام رشتہ دار آئے تھے صبا کی فیملی بھی آئی تھی۔

توحید کے والد وحید علی جو صبا کو بہت پسند کرتے تھے ان کی یہ خواہش تھی کہ صبا ان کے گھر کی بہو بنے رشتہ سے انکار کے بعد وہ افسردہ تھے، سب مہمان چلے گئے اور پھر انہوں نے بہت ضد کر کے صبا کو روک لیا تھا اور پھر صبح کے وقت صبا کو اس کے گھر چھوڑنے کے لئے انہوں نے توحید سے کہا تو توحید نے چاہتے ہوئے بھی والد کی بات رکھ لی اور پھر صبا کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی دونوں خاموش تھے، سڑک سسنا تھی اس لئے توحید نے کار کی اسپینڈ بڑھا دی تھی اور ایسے بھی وہ جلد از جلد صبا کو اس کے گھر پہنچانا چاہتا تھا۔

کل تک صبا جو توحید کو پسند کرتی تھی آج ایسے موقع پر اس کی مدد حاصل کی اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ نہ صرف اسے پسند کرنے لگی تھی بلکہ دل کے کونے میں توحید کے لئے پیار پیدا ہو گیا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی شہر خوشاں کے ان جان لیوا خوف ناک مناظر کو یاد کرنے لگی تھی بار بار توحید کا ہاتھ پکڑنا اور جب وہ کئی بار بے ہوش ہوئی تو توحید کا اپنے کندھوں پر اسے ڈال کر شہر خوشاں سے باہر نکلنے کی

کوشش کرنا۔

لیکن اگر توحید چاہتا تو صبا کو وہیں چھوڑ کر خود اپنی جان بھاسکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

کیونکہ توحید اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے اور سچا پیار کرتا ہے اور میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، نا پسند کر کے رشتہ سے انکار کیا، شہر خوشاں میں داخل ہونے سے پہلے اس نے توحید کو جو کہا اس سے صبا کافی اذیت کی کیفیت میں ہو گئی تھی۔

گاڑی ہو اسے باتیں کرتے ہوئے چلی جا رہی تھی کہ توحید نے ایک نظر سر جھکائے صبا پر ڈالی جوڑکی اس سے دور رہنا چاہتی تھی آج وہ خود اس کے کتنے قریب آ گئی تھی۔ رشتے سے انکار کے بعد خود توحید اس سے دور رہنا چاہتا تھا اسے بھلا دینا چاہتا تھا مگر آج قسمت نے ان دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ توحید نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں.....؟“

”کیسے کہوں کہ میں بہت شرمندہ ہوں اپنے سلوک سے کاش آپ کو نہ ٹھکرایا ہوتا۔“ وہ دل میں سوچتے ہوئے پشیمردہ چہرے سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے۔“ توحید پر سوچ انداز کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو اچھا ہے میرا ہاتھ نہ سسکی اس گوشت خور کا ہاتھ تمام لیا۔ یعنی تم نے اسے میرے مقابل لاکھڑا کیا تو یہ ہے تمہاری پسند جس کے لئے تم نے مجھے ٹھکرایا۔“ توحید اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”چلو جو مرضی۔“ وہ شرارت سے بولتے ہوئے صبا کے خوب صورت چہرے کو دیکھنے لگا۔

”آپ کچھ کیا رہے اپنے آپ کو۔“

”کیوں اس طرح کی باتیں کر کے میرے دل کو مزید دکھ دے رہے ہیں ایک تو میں پہلے ہی آپ کو ٹھکرا کر شرمندہ ہوں اوپر سے آپ مجھے اور پریشان





## گمنام اسٹیشن

گلاب خان سوگی - کشمور

رات اپنے پچھلے پھر میں داخل ہو چکی تھی قرب و جوار کی ویرانی دل دھلا رہی تھی ہر طرف خوف مسلط تھا رات کے اندھیرا بھاڑ جیسا منہ کھولے آگے ہی آگے بڑھتا آ رہا تھا کہ اچانک.....

خوف کے افق پر رواں دواں عجیب و غریب دل گرفتہ دل شکستہ اور دل فریفتہ کہانی

**طوفانی** ہواؤں کا شور اوپر سے کالے سے گاؤں سے دور واقع اس ویران ریلوے اسٹیشن کا بوڑھا چوکیدار اپنی عمر کی طرح سروں کے آخری ایام پورے کر رہا تھا جو سر شام ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن کے ویران انتظار گاہ میں چار پائی لگا کر شاید ڈیوٹی کر رہا تھا یا اس عمر میں گھریلو حالات و معاملات سے دور بھاگ کر ریلوے اسٹیشن کی ویرانی میں زندگی کے آثار لانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ہواؤں کا شور اوپر سے کالے سے گاؤں سے دور واقع اس ویران ریلوے اسٹیشن کا بوڑھا چوکیدار اپنی عمر کی طرح سروں کے آخری ایام پورے کر رہا تھا جو سر شام ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن کے ویران انتظار گاہ میں چار پائی لگا کر شاید ڈیوٹی کر رہا تھا یا اس عمر میں گھریلو حالات و معاملات سے دور بھاگ کر ریلوے اسٹیشن کی ویرانی میں زندگی کے آثار لانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”سسرالی..... کون سسرالی.....؟“ مباحثت سے بولی۔

”ارے بھائی تمہارے گھر والے میرے سسرالی تو ہیں۔“

”مطلب تم میرا مطلب..... اب۔“ اور مباحثہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بھئی ہم تو وہی کریں گے جو مرضی یار ہو۔“ تو حید ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے اتنا چاہنے والا مل جائے گا اور میرے لئے جان کی بازی لگا دے گا۔“

پھر تو حید بولا۔ ”ہمیں اس شہر خوشاں کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے ہمیں ایک جان دو قالب بنادیا۔“

پھر تو حید کار کی کھڑکی سے باہر سر نکال کر زور سے چیخا۔ ”شکریہ شہر خوشاں شکر یہ شہر خوشاں۔“

”ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔“ مباحثی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک ہنس پڑی تھی۔

”اب چلے بھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ گھر والے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں کہ آپ نے.....“ مباحثے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہاں وہ دوبارہ بولی۔

”ابھی ہم تھوڑی ہی دور آئے ہیں شہر خوشاں سے، کہیں آپ کی آواز وہ گوشت خوردن نہ لے۔“

تو حید بھی ہنستے ہوئے۔ ”ہاں بھئی اب تو شہر خوشاں سے بہت دور جانا چاہئے کیونکہ اب ہمیں ہماری زندگی مل گئی ہے۔“ تو حید نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھاتے ہوئے مسکرایا تو مباحثے نے شرماتے ہوئے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور اپنا سر تو حید کے بازو پر لگا دیا اور تو حید کا داغ باغ ہاں ہو گیا اور گاڑی مزید فرار نے بھرنے لگی۔

”دل کی بات صبا کی زبان پر آ ہی گئی وہ شرمندہ نگاہوں سے تو حید کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو حید نے گاڑی روک دی۔

”کہیں آپ کی باتیں سننے سے ایک سیڈنٹ نہ ہو جائے۔“ تو حید چنکا۔

”تو تم اقرار کر رہی ہو کہ تم نے مجھے ٹھکرا کر غلطی کی ہے۔“ اب تو حید سیرس ہو گیا تھا۔

”ہاں.....“ وہ اشک ندامت کے ساتھ ہاں کہہ گئی۔

”تو پھر کیا ارادے ہیں؟“ تو حید اس کے دل کی بات زبان پر لانے کے لئے مضطرب ہو گیا۔

”اب کیا فائدہ اب تو رشتے سے انکار ہو چکا ہے۔“ وہ دل شکستہ سے تو حید کو انگلیاں لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اب میری بات کون سنے گا۔“

”میں ہوں ناں۔“ تو حید مسکراتے ہوئے بولا۔

”بس تم بتاؤ تم راضی ہونا کہیں پہلے کی طرح انکار تو نہ کر دو گی۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”مباحثے لئے اتنا مضطرب دیکھ کر تو حید کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ابھی وہ لڑکی تھی جس کے لئے تو حید اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتا تھا اس کے گھر کے چکر لگاتا اگر مباحثے سے اسے پیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے گھر شوق دیدار کو نہ جاتا۔

مباحثہ خوش بیٹھی نظریں جھکائے افسردہ تھی اس کی آنکھوں سے اشک ندامت اس کے گال بگور رہے تھے اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔

”اچھا اب یہ آنسو بہانا تو بند کرو۔ ایسے گھر جاؤ گی تو میرے سسرالی کیا کہیں گے۔“ تو حید شرات سے بولا۔

”اب میری بات کون سنے گا۔“

”میں ہوں ناں۔“ تو حید مسکراتے ہوئے بولا۔

”بس تم بتاؤ تم راضی ہونا کہیں پہلے کی طرح انکار تو نہ کر دو گی۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”مباحثے لئے اتنا مضطرب دیکھ کر تو حید کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ابھی وہ لڑکی تھی جس کے لئے تو حید اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتا تھا اس کے گھر کے چکر لگاتا اگر مباحثے سے اسے پیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے گھر شوق دیدار کو نہ جاتا۔

مباحثہ خوش بیٹھی نظریں جھکائے افسردہ تھی اس کی آنکھوں سے اشک ندامت اس کے گال بگور رہے تھے اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔

”اچھا اب یہ آنسو بہانا تو بند کرو۔ ایسے گھر جاؤ گی تو میرے سسرالی کیا کہیں گے۔“ تو حید شرات سے بولا۔

”اب میری بات کون سنے گا۔“

”میں ہوں ناں۔“ تو حید مسکراتے ہوئے بولا۔

”بس تم بتاؤ تم راضی ہونا کہیں پہلے کی طرح انکار تو نہ کر دو گی۔“

”نہیں..... نہیں.....“ وہ لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”مباحثے لئے اتنا مضطرب دیکھ کر تو حید کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ ابھی وہ لڑکی تھی جس کے لئے تو حید اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتا تھا اس کے گھر کے چکر لگاتا اگر مباحثے سے اسے پیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے گھر شوق دیدار کو نہ جاتا۔

مباحثہ خوش بیٹھی نظریں جھکائے افسردہ تھی اس کی آنکھوں سے اشک ندامت اس کے گال بگور رہے تھے اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔



پتا نہیں؟ مگر ہمیں فی الحال طوفانی ہواؤں نے پریشان کر رکھا تھا رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ ہمیں وہاں دور سے آگ روشن نظر آئی اور تین سائے وہاں اپنے ہاتھ تپ رہے تھے ہمیں بھی سردی نے آگھیرا تھا وہ تین لوگ تھے اور چوتھا بھی ان میں شامل ہو گیا۔

”آؤ پردیس پاؤ! بیٹھو آگ تاپو۔“ خشک لکڑیوں کا ایندھن وافر مقدار میں موجود تھا، میں بھی آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور سب کا سرسری جائزہ لینے گا دو بوڑھے تھے ایک اکوڑو جوان تھا جو بالکل میری طرح دکھائی دے رہا تھا ان سب میں ایک بات یکساں تھی سب ہی ایک دوسرے کو ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے اور ڈراؤنی قصے بیان کر رہے تھے، میں بھی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا، شاید اس طرح قصہ خوانی سے رات گزر جائے اور صبح ہوتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔

بوڑھے چوکیدار کی کھانسی میں سردی کی شدت کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا ایسی طوفانی ہواؤں میں بھی دور اسے دھواں اٹھائی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ زیر لب بوڑباؤا۔

”پتا نہیں یہ آگ کس نے جلائی ہے، یہاں تو اس وقت کوئی ٹرین نہیں آتی اور مسافر بھی نظر نہیں آ رہے؟ مجھے کیا.....؟“ وہ پھر رضائی میں منہ کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا پر نہ جانے آج نیند اسے کسوں دور تھی، اک عجیب سی بے چینی نے اسے آگھیرا تھا۔

وہ چاروں مسافر نما سائے بدستور آگ سینک رہے تھے۔ ایک بوڑھا مسلسل بولے جا رہا تھا وہ اپنی خود نوشت سن رہا تھا اور باقی ہم تین ہر تن کوش ہو کر اس کی کہانی سن رہے تھے۔

”تو دوستو.....! میری کہانی کافی طویل ہے چونکہ ہر کوئی اپنی اپنی کہانی بیان کرے گا اس لئے مختصراً میرا قصہ کچھ اس طرح ہے۔

”میں ایک تھانیدار تھا بے حد ظالم اور بے رحم۔ پتا نہیں کتنے مظلوم قیدیوں کو اپنے ظلم کا شکار بنا چکا تھا ان

میں بے گناہ بھی تھے اور گناہ گار بھی میرے کاغذوں کسی کے لئے معافی نہیں تھی میرا اور جتنا چھوٹا بس، جیل خانہ تھا جہاں میں تعینات تھا۔ لیکن ان سب میں ایک قیدی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا اور وہ تھا قیدی نمبر 53 جی یہاں قیدی نمبر 53 خاموش طبع، ڈرپنا اور سنجیدہ، لیکن میرا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا ان پر الزام تھا کہ اس نے اپنے والد کا خون کیا تھا، کسی ایسا اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملنے آتی تھی ورنہ وہ ہرانا چپ بیٹھا رہتا تھا مجھے صرف اتنا پتا چلا کہ ایک دن ان کے باپ نے اس کی ماں کو جو پرہیز دیا اور طیش میں آئے اس نے اپنے ہی باپ کا خون کر دیا۔

عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ 53 نمبر سے بلاوجہ نفرت ہو گئی تھی، ایک دن اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملاقات کرنے آئی تھی میرا دل دماغ کھو ہوا تھا میں نے ایک زور کا دھکا دے کر اس کی بوڑھی والدہ کو گرا دیا جس سے قیدی نمبر 53 کا دل تکلیف پہنچی پھر تو اس نے حد ہی کر دی، دنیا جہاں لگایاں مجھے ساڈا لیں بھلا میں بھی کہاں چپ بیٹھا تھا اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا اور آؤ دیکھا! ایک بڑا سا ڈنڈا لے کر جیل کے کمرے کے اندر گیا اور اس پر ڈنڈوں کی برسات کر دی کب اس کی واقع ہوئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دوسرے کا شیش بھاگ ہوئے اندر آئے اور میرا ہاتھ روکا لیکن تب دیر ہو چکی تھی ایک بوڑھی ماں کے سامنے اس نے بیٹے کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی پڑی تھی۔

بوڑھی عورت رو رو کر مجھے بددعا میں تھی ویسے میرے کیرئیر میں ایسے واقعات کی بہت سی اس لئے میں نے اپنے ماتحتوں کو لاش ٹھکانے خودکشی کی رپورٹ بنا کر پیش کرنے کو کہا۔ میں کمرے میں واپس آ گیا ویسے میرا کمرہ جیل کے والے ایریا میں ہی واقع تھا اور ویسے بھی میں انکس اور شادی بیاہ کو فضول رسم سمجھتا تھا ڈیوٹی کے بعد وہاں وہاں شہاب کا اہتمام ریکورڈ کرتا تھا۔“

میرے ماتحت روز کوئی نہ کوئی کال گرل پیش کرنے کا انتظام کرتے تھے اور بدلے میں وہ مجھ سے پیش آنے کی توقع کرتے تھے کیا بتاؤں دوستو! اتنا کم کار ظالم شخص تھا اور ایک دن اس بوڑھی عورت دے جانے کا کام کر دکھایا۔

رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے آیا تو ایک کسین حینہ کو اپنا منظر پایا۔ اس کے حسن کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اس کی طلسماتی آنکھوں سے میرا گیسوا کسین حینہ کو اپنی ہانہوں میں لینے کے لئے ہی اس کے قریب گیا اس نے اپنے ہاتھ کے بے سے مجھے روک دیا۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے جیلر صاحب، شہاب سے اب کامزہ نہیں چھوگے.....“ اب شہاب پینے کی کتے تھی۔ بہر حال میں بستر پر دراز ہو گیا اور وہ بیلے لگی کدچا تک کمرے کی لائٹ چلی گئی۔

”ارے یہ لائٹ اس وقت جاتی تو نہیں ہے موم بتی ہاتھوں میں اٹھائے جانے کس طرح نڈل کی بات سن لی۔

باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں میں بتدریج ہوتا جا رہا تھا بالکل ویسے جس طرح جیل میں کسی کے موت آ جانے سے پہلے سارے کتے زور زور لاتے تھے لیکن آج کسی کی موت تو نہیں ہوئی جیسے اس حینہ میرے قریب آئی تو، تو موم بتی کی روشنی اس کا چہرہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے کیونکہ وہ جیل میں قیدی نمبر 53 کا چہرہ تھا جسے میں کبھی نہیں لکھا اس کا چہرہ اور بھی ہمایا تک ہو گیا تھا۔

میں نے اپنا پلٹل اٹھانے کی کوشش کی لیکن بغیر طور پر میرے ہاتھ جبرن ہو چکے تھے اور میں خوف کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

قیدی نمبر 53 بولا۔ ”سچا نا جیلر..... آج کیوں کوئی اپنی دنیا میں ساتھ لے جاؤں، ویسے تو بڑا بھرتا ہے۔ میری بوڑھی ماں کی بددعاؤں نے اپنا لہا ہے اور مجھے تم سے بدلہ لینے کی قوت مل گئی ہے

بڑا شوق ہے ناں کال گرل کو بلانے کا.....“ وہ منہ سے وار کرتا گیا اور میرے جسم کا ہر عضو الگ ہوتا گیا اور اس طرح مجھے زندگی سے نجات مل گئی اور قیدی نمبر 53 نے اپنا بدلہ لے کر ثابت کر دیا کہ ظالم کو اس دنیا میں ہی اپنے ظلم کا بدلہ چکانا پڑتا ہے۔

”میری روح تب سے بھگ رہی ہے اور راہ نجات کے لئے یہاں وہاں بھٹکتا رہتا ہوں، تو دوستو یہ بھی میری کہانی۔“

اس کی کہانی سن کر ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خوب ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔ ”کیا شیل سے ہم لوگ آپ کو بے وقوف نظر آ رہے ہیں جو آپ اس طرح ہمیں ڈرانے کی ناکام کوشش کریں گے۔“

”کیا کہا روح.....!“ دوسرا بوڑھا بول پڑا۔

”ساتھیو، ہمیں ڈرانا آسان نہیں ہے پر مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر آپ لوگ ضرور ڈر جائیں گے، تو وقت ضائع کے بغیر میری کہانی سنو۔“

”میں ایک کامیڈی بن تھا اور مذاق کر کے پھٹ پاتا تھا کبھی ٹھٹھیر میں کبھی فلم میں کبھی ڈرامے میں اور کبھی میلے میں..... میں ہر جگہ لوگوں کو ہنساتا تھا لیکن ایک چیز کو لے کر میں روتا تھا وہ تھا ایک خواب جو اکثر میں دیکھا کرتا تھا ایک جنگل ہے اور میں راستہ بھٹک گیا ہوں اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور ہر طرف جنگلی جانوروں کی آوازیں نے مجھے کافی ڈرا دیا تھا کدچا تک ایک سفید ریش سفید پوش اجنبی میرے سامنے نمودار ہوا۔“

”ڈر نہیں مسخرے تم لوگوں کو ہنساتے ہو اور آج کے دور میں یہ کام نہایت مشکل ترین کام ہے جو تم بخوبی سے سرانجام دیتے آ رہے ہو، لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، یہ دنیا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے تم اپنی تلکافیں چھپا کر دوسروں کو ہنساتے ہو، لیکن جس اولاد اور بیوی کے لئے یہ سب کر رہے ہو وہی لوگ ایک دن تم کو رلا دیں گے..... یاد رکھنا موت کو“ سفید پوش اجنبی غائب

ہو گیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہی بات مجھے ہر وقت رلا تی رہتی تھی۔

ایک دن میں ایک تھیر میں تماشہ کر رہا تھا کہ اچانک مجھے دل کا شدید دورہ پڑا انتظامیہ والے مجھے شہر کے بڑے اسپتال لے کر گئے درد کم نہیں ہو رہا تھا اور ڈاکٹر مجھے بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے مجھے کوئی ہوش نہیں تھا میرے سامنے تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا بس یوں سمجھو کہ میرا آخری وقت تھا، قریباً 20 منٹ بعد مجھے ڈاکٹروں کی سرگوشی سنائی دی۔

”نہی از تو مور“

میں خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہا تھا، لگتا تھا جیسے کسی بھاری چیز کی دباؤ سے نجات مل گئی ہے۔

”ارے یہ کیا میں تو اندھیرے میں اڑتا جا رہا تھا، لگتا ہے میں کسی انجمانی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں لیکن اندھیرا تھا کہ جھٹکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اچانک ایک روشن چہرے والا سفید ریش میرے سامنے آ گیا اس کے چہرے کی روشنی سے اندھیرے میں اجالا سا ہو گیا ارے میں تو اسے پہچانتا ہوں یہ وہی انجمنی سفید ریش تھے جو اکثر خواب میں مجھے دکھائی دیتے تھے وہ بہت ہی نرمی سے گویا ہوئے۔

”میاں مخرے، حیران مت ہو تم ابھی مرے نہیں ہو بس موت کی سرحد پر کھڑے ہو، تم نے واپس جانا ہے اور خواب میں دیکھے مجھے دیکھے مزید جھیلنے ہیں بس انتظار خیال رہے کسی کا دل نہیں دکھانا۔“

ایک زوردار ہوا کا جھونکا سا محسوس ہوا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہی پرانا وزن میرے ناتواں کندھوں پر آ گیا ہے۔

ڈاکٹروں کی آواز پھر گونجی۔ ”ناممکن، ارے یہ کیسے ہو گیا تھوڑی دیر پہلے اس مریض کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تھی اور ہم نے اسے مردہ قرار دیا تھا لیکن یہ اچانک اس کا دل کیوں دھڑک رہا ہے ارے یہ تو زندہ ہو گیا۔“

”میں کہاں ہوں۔“ میں نے آنکھیں کھولتے

ہی سوال کیا۔ سارے ڈاکٹر وہاں جمع ہو گئے، کسی کو بلیڈ نہیں ہو رہا تھا کہ میں مرکز زندہ کیسے ہو گیا ڈاکٹر نے استفسار پر میں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا مگر کسی کو بھی باتوں کا یقین نہیں ہوا وہ سارے مادہ پرور اور منکر لوگ تھے جو سائنس کو ہی سب کچھ مانتے اور سائنس روحانیت سے عاری ہے۔

خیر کچھ دن میں وہاں زیر علاج رہا اب میں باہر ہو چکا تھا اور کامیابی بھی چھوڑ دی تھی پوری زندگی، اولاد کی خاطر دھکے کھائے، وہ اب مجھے فالٹو پر زہ لگے تھے، میری بیٹی کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی، بی بی اپنے میکے چلی گئی اور میرے بڑے بیٹے نے اہل

کرویا مجھے اولاد ہاؤس میں بھرتی کر دیا جہاں میرے سینکڑوں اولاد کے ستارے ہوئے بوڑھے اور بزرگ سے دھکے کھا رہے تھے۔ میں اس غم میں بیمار رہنے لگا خواب والی بات سچ ثابت ہو گئی اولاد ہاتھوں ملنے والے غم نے مجھے بڑھ چلا کر لے دیا۔ میں برسوں وہاں پڑا رہا لیکن کوئی بھی مجھے نہ سمجھا آیا اور آخر کار سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی اور آج کے سامنے بیٹھا ہوں۔“

مخمرے کی باتوں پر ہمیں خوب ہلانی آئی مگر ڈاکٹروں دور تھا۔ البتہ اس کے حالات جان کر افسردہ ضرور ہوئے۔ اب باری تھی تو جوان کی اس کچھ کھڑیاں آگ میں ڈالی پھر گویا ہوا۔

”میں کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا کرکٹ کی سے میری طرز زندگی خاصی خوشحال تھی اور مگر ملے بھی خوشگوار تھے کھیل کود کو ہی میں نے اپنی زندگی مقصد بنایا تھا والد ایک سیاست دان تھے جو کرپشن الگ ہمارے لئے دولت اکٹھی کر رہے تھے، والدہ ایک این جی او کی سربراہ تھیں والدین کی مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے ٹائم کم تھا، تو کرکٹ میں کافی کمائی ہو رہی تھی لیکن جب بازی شروع کر دی گئی تھی میری توپاں انجمنی الگیاں گئیں

میں میرے لئے دولت ہی سب کچھ تھی وطن

Dar Digest 158 April 2018

نقداری کر کے دوسری ٹیم کو جتنا جان بوجھ کر روکتا ہوتا ہوا اور بدلے میں بھاری دولت جوا کے ذریعے کماتا تو میرا مقصد حیات تھا۔

دین سے دوری کی وجہ سے دل تنگ آلودہ ہو گیا تھا پھر اچانک ایک دن دل کا دورہ پڑا اور والد صاحب اور میری بے پناہ دولت بھی مجھے بچا نہیں سکی اور نو جوانی کے عالم میں ہی خالی ہاتھ دنیا سے آنا پڑا اور اب یہاں آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنے کی تلقین بھی کر رہا ہوں اور ڈرانے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔“

کرکٹ کی کہانی سن کر ہم لوگ کافی دیر خاموش رہے۔

رات اپنے پچھلے حصے میں داخل ہو چکی تھی۔ گمنام

”تو دوستو! میری کہانی بھی زیادہ طویل نہیں ہے، میں ایک بے روزگار نو جوان تھا جو ایم اے کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی نوکری کی تلاش میں دردر بھٹکتا رہتا تھا، مگر سفاک، پرہیزگار اور رشوت کے بغیر نوکری کی

فرمائش میرے دل کے اندر ہی دفن ہو گئی۔ اور ایک دن حد ہو گئی بے روزگاری کی وجہ سے میری معیشت بھی مجھے چھوڑ گئی اور رشتے سے انکار کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ایک ادیبزمر

میں سے اس کا بغیر ہوا اور بعد ازاں انجمنی شادی میں بدل گیا، اسے دولت تو بہت ملی لیکن عزت.....؟“

وہ بزنس میں اسے بھی بزنس کے طور پر چلانے کا وہ اب ہائی سوسائٹی کال گرل بن چکی تھی شکر ہے میں اس عورت سے بچ گیا ہے روزگار ہوا تو کیا ہوا، عزت بھی میں نے حالات کا کافی دنوں تک مقابلہ کیا مگر اب تک چکا تھا، ملکی حالات ٹھیک نہیں تھے، سیاست کارو بار بھی چکی تھی، مہنگائی کنٹرول سے باہر تھی فاشی و عریانی دور دور تھا، لوگ درندے بن گئے تھے۔ معصوم بچے بچوں سے زیادتی و قتل کے واقعات عام ہو چکے تھے صاف کا پرندہ اڑ کر جنگلوں میں چلا گیا تھا۔

آخر تک ایک بے روزگار ایسے حالات کا

ایلاہ کرتا، آخر کار شہر کے ایک مشہور چوک پر انٹرویو

سے ناکام واپسی پر میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور بے روزگاری سے ہمیشہ نجات مل گئی لوگوں نے مجھے اسپتال پہنچایا لیکن بہت دیر ہو گئی تھی۔

”ایک راز کی بات بتاؤں دوستو! لوگوں کے لئے تو وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا لیکن حقیقت میں وہ ایکسیڈنٹ نہیں بلکہ خوشی تھی..... ہاں میں نے خود شادی کی تھی اور جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آ گیا تھا لیکن اب مجھے پچھتاوا ہوتا ہے، کاش میں نے ایسا نہیں کیا ہوتا اور زندگی جیسی نعمت کی قدر کی ہوتی۔“

میری کہانی نے سب کو رلا دیا تھا۔ رات ابھی باقی تھی ایک سایہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا، وہ کافی عمر رسیدہ اور لاغر تھا اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گیا، ہمارے پوچھے بغیر ہی خود وہ بول پڑا۔

”میں سامنے والے ریلوے اسٹیشن کا چوکیدار ہوں، کافی سردی لگ رہی تھی سوچا آپ لوگوں کے ساتھ آگ سیٹنگ لوں، ویسے رات کو یہاں گاڑی نہیں آتی عمر بیت گئی اس بچا کی جگہ باری کرتے، لیکن آج تک میں نے کسی ٹرین پر سفر نہیں کیا! کیا آپ لوگ بھی ٹرین کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟“

ہمیں خاموش پا کر وہ خود ہی بولا۔ ”میں بھی کتنا بھولا ہوں جو مسافروں سے اس طرح کے سوال پوچھ رہا ہوں.....“

اچانک ایک ٹرین نمودار ہوئی لیکن اس کی ہولناک آواز سے ہماری روح تک کانپ گئی، جیسے کوئی زلزلہ ہو، پتھروں کی بارش ہو، ٹرین صدیوں پرانی معلوم ہو رہی تھی وہ عین ہمارے سامنے آ کر رک گئی اور باری باری ہم سارے لوگ اس پر سوار ہوئے، وہ طلسمانی ٹرین ایک جانب قایم ہو گئی۔

صبح گاڑی والوں کو بوڑھا چوکیدار ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں اپنی چارپائی پر مردہ حالت میں ملا۔

☠



نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لہانے میں اپنی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنہاں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہاں کھلتی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کرے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چٹکھاتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

ایک چور راج کماری نے اور دوسرا چور شریم نے سنبھال لیا۔ اور کشتی کو لے کر چٹان سے آگے نکلے اب جنگلی لوگوں کی کشتیاں دائرہ بنا کر چکر لگا رہی تھیں جو بھی انہوں نے ان کی کشتی کو آتے دیکھا تو وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئے اب شریم کو خیال آیا کہ کیوں نہ ان لوگوں سے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی جائیں اس نے راج کماری کو پوری طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ان جنگلی لوگوں کو کہو کہ وہ جزیرے پر چلیں۔“

”میں تو ان کی زبان نہیں جانتی۔“

”تم اشاروں سے کام لو اور بولنا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ بات ہرگز نہ کرنا۔“

راج کماری نے کمال کی اداکاری شروع کر دی وہ کشتی میں کھڑی ہو گئی اور اپنا ہاتھ اپنے منہ کے قریب لے جا کر کچھ اس قسم کا اشارہ کیا کہ وہ پانی پیتا چاہتی ہے اتنا سنا تھا کہ سارے جنگلی اپنی اپنی کشتیاں لے کر راج کماری کی کشتی کے قریب آ گئے پھر انہوں نے راج کماری کی کشتی کو اپنی کشتی کے ساتھ ساتھ نزدیک رکھا۔ اور بار بار اپنی کشتی میں جھک کر اسے کچھتے ہوئے اپنے جزیرے کی طرف بڑھے جزیرہ وہاں سے ٹیس میل کے فاصلے پر تھا یہ بڑا سرسبز اور شاداب جزیرہ تھا۔

راج کماری اور شریم کشتی سے اتر کر کنارے کے ریت پر کھڑے ہو گئے جنگلی لوگوں کو شریم دکھائی نہیں دے رہا تھا انہوں نے راج کماری کے آگے گے چلنا شروع کر دیا اور دیوی کے نعرے لگانے شروع کر دیے جزیرے کے دوسرے جنگلی بھی نکل آئے اور دیوی کا نام سن کر وہیں جھک گئے۔ راج کماری بڑی ٹھاٹھ سے گردن اکڑا کر چل رہی تھی شریم بھی اس کے ساتھ تھا راج کماری کی خدمت میں پھل اور دودھ پیش کئے گئے جسے راج کماری نے بڑے شوق سے کھایا اور پیا، جنگلیوں کا ایک مکار جادوگر بڑے حسد سے راج کماری کو دیکھ رہا تھا اسے شک ہوا کہ یہ کوئی انسان ہے اور جنگلی لوگوں کو بے وقوف بناتا رہا ہے اس نے نیزہ اچھال کر کہا۔

”یہ دیوی نہیں ہے بلکہ کوئی عام عورت ہے۔“

اور ہمیں الو بتا رہی ہے۔“

شریم نے راج کماری کے کان میں کہا۔ ”گھبرا نہیں میں اس کو سنبھال لوں گا پھر وہ مکار جادوگر بولا اگر یہ دیوی ہوگی تو اس پر میرے حملے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اگر یہ جھوٹی عورت ہے تو میرا نیزہ اس کے پیٹ کے آر پار ہوگا۔“ سب جنگلی چپ ہو گئے جیسے ان ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی ہو۔

راج کماری گھبرا رہی تھی کیونکہ وہ اس پر تیز چلتا

کے لئے بالکل تیار تھا۔ شریم بھی چوکس ہو گیا تھا اس نے راج کماری کے کان میں سرکشی کی اپنی جگہ سے مت ہلنا میں اس کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے جا رہا ہوں..... اور شریم لپک کر جادوگر کے پیچھے آ گیا۔ اس نے نیزہ اوپر اٹھایا یہ تھا کہ شریم نے اس کی گردن پر اتنی زور سے اچھل کر لات ماری کہ وہ چیخ کر مرنے کے بل گرا اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ وہیں مر گیا۔ پھر شریم نے نیزہ اٹھا کر اس کے پیٹ میں گاڑ دیا یہ بھیا تک منظر دیکھ کر جنگلی دم بخود ہو کر رہ گئے پھر انہوں نے اس قدر بلند آواز میں دیوی زندہ باد کا نعرہ لگایا کہ سارا جنگل گونج اٹھا۔

دو روز راج کماری نے دیوی بن کر جزیرے کے جنگلی لوگوں کی مہمان نوازی کا مزہ اٹھایا تیسرے روز راج کماری نے انہیں اشاروں میں بتایا کہ وہ آسمان پر جا رہی ہے۔ جنگلیوں کے ناریل اور کیلوں کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک بڑی کشتی راج کماری کی کشتی کے ساتھ دی سے باندھ دی۔ راج کماری کشتی میں سوار ہو گئی شریم پہلے ہی اس میں بیٹھ چکا تھا۔ جنگلی لوگ اونچی آواز میں اپنے بچپن گانے گئے شریم ہنس رہا تھا۔ راج کماری خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ ان آدم خور دشیوں کے درمیان سے صحیح سالم واپس جا رہی ہے۔ جنگلی جزیرے سے کافی دور تک راج کماری کے ساتھ آئے اور اس کی کشتی خود کھینچتے رہے پھر جب کشتی کھلے سمندر میں آ گئی تو راج کماری سے شریم نے کہا۔

”ان لوگوں سے کہو کہ اب دفع ہو جاؤ۔“ راج کماری نے ہاتھ سے اشارہ کر کے ان کو واپس جانے کو کہا۔ جنگلی اپنی اپنی کشتیوں میں ادب سے جھک گئے۔ اور پھر نعرے بلند کرتے واپس اپنے جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

راج کماری نے سکھ کا سانس لیا۔ اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کر کے بولی۔ ”شریم بھائی تم کشتی میں ہونا۔“

”ہاں تمہارے ساتھ ہوں۔“ شریم نے جواب دیا۔ اچھا ہوا کہ ان سے پیچھا چھوٹ گیا شریم نے کہا۔

”اب ایسا کرتے ہیں کہ کچھ پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ لیتے ہیں اور اس کشتی کو ہمیں سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ دی سے بندھی ہوئی یہ پھلوں سے بھری کشتی طوفان میں ہمیں بھی لے ڈوبے گی۔“ انہوں نے تھوڑے بہت پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ کر دوسری کشتی کو کھول کر سمندر کی وسیع لہروں کے حوالے کر دیا کچھ دور تک وہ کشتی انہیں نظر آتی رہی پھر سمندر کی بڑی بڑی موجوں کی اوٹ میں کھو گئی اب ان کا ایک اور سمندری سفر شروع ہو گیا تھا۔

شریم نے کہا۔ ”تم بخت ان جنگلیوں کی زبان ہماری سمجھ سے باہر تھی ورنہ ان سے پوچھتے کہ یہاں سے قریبی ملک کا ساحل کتنی دور ہے؟“

پھر شریم نے راج کماری سے پوچھا۔ ”کہ وہ کچھ حساب لگا کر بتا سکتی ہے۔“ راج کماری نے آسمان پر چمکتی دھوپ اور نیلے سمندر میں چاروں طرف دیکھا اور کہا۔ ”میرے حساب کے مطابق ہماری کشتی مشرق کی طرف جا رہی ہے۔ اور ہمارا ملک ہندوستان اسی طرف ہے۔“ شریم نے سر کو جھٹک کر کہا۔

”یہ تو تم نے پہلے ہی بتایا تھا اور ہم آتش فشاں پہاڑوں میں پھنس گئے تھے۔ خدا کے لئے اب کوئی اس قسم کی پیش گوئی نہ کرنا۔“ سارا دن ان کی کشتی لہروں پر اپنے آپ بہتی رہی۔

کھلے سمندر میں پہنچ کر شریم کو دور ایک گولی شے سمندر سے ابھرتی اور پھر ڈھکی دکھائی دی۔ شریم نے سمجھا کہ شاید اس کا وہم ہو۔ راج کماری اپنے ماں باپ کی یاد میں اداس ہو گئی شریم اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

اچانک دور وہ ہی گولی چیز ایک بار پھر سمندر میں سے باہر نکلتی شریم راج کماری سے بولا۔

”یہ کیا شے ہے راج کماری۔“ راج کماری اس گولی شے کو غور سے دیکھنے لگی دھوپ سمندر میں تپک رہی تھی لیکن ابھرتی ہوئی شے کافی فاصلے پر تھی راج

کماری ڈر گئی۔

”بھگوان کے لئے کشتی کا رخ موڑو۔ یہ کوئی بڑی خطرناک بلا لگتی ہے۔“ جسے شریم غور سے دیکھ رہا تھا۔ سمندر سے ابھرتی گولی شے حیرت انگیز زیادہ بڑی ہو گئی تھی مگر صاف پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے کوئی ویل چمکی کہ یہ سمندری عفریت ہے۔ شریم نے کشتی کا رخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن لہروں کا رخ اچانک اس ابھرتی ہوئی بلا کی طرف ہو گیا۔ کشتی سمندری عفریت کی طرف تیز تیز جا رہی تھی راج کماری نے گھبرا کر کہا۔

”ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں شریم بھائی۔“ شریم نے کہا۔ ”حوصلہ مت ہارو راج کماری ہم مصیبت کا مقابلہ کریں گے۔“ شریم کی نگاہیں ابھرتی ہوئی بلا پر لگی ہوئی تھیں کشتی اس کے قریب جا رہی تھی یہ بلا اس سیاہ چٹان کی طرح سمندر کی لہروں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی کیا سمندر میں کوئی نیا جزیرہ نمودار ہو رہا تھا یا پھر بس لاکھ سال پہلے کا کوئی سمندری عفریت سمندر سے باہر نکل رہا تھا۔

شریم کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا وہ پریشان ضرور تھا کیونکہ اگر یہ کوئی عفریت ہوتی تو پھر اس سے چھٹکارا مشکل تھا چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا وہیں شریم کیا کر سکتا تھا ابھرنے والی بلا اب کچھ کچھ نظر آنے لگی تھی۔

اچانک شریم کا نپ اٹھا اس بلا کے سر پر کالے گالے لمبے بال تھے جو سمندر کی لہروں کے ساتھ لڑا رہے تھے۔ پھر اس بلا کا سر موجوں سے اوپر ہو گیا اس کے ساتھ ہی عفریت نے اپنا سر باہر نکال لیا وہ ایک بہت بڑا سر تھا جس کی آنکھیں بڑے بڑے سرخ لالہوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں اور لمبے لمبے ہاتھ بھی کے دانٹوں سے بھی زیادہ لمبے تھے یہ کوئی بلا جتنا بڑا جن یاد یو تھا جس کے دو ٹوں بازو بہت لمبے تھے اور سمندر کی موجوں پر تیر رہے تھے۔ اس سمندری عفریت کو دیکھ کر راج کماری نے ایک چیخ ماری اور کشتی

میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ سمندری عفریت نے پورا منہ کھولا اور ایک ایسی چمکاڑی کی آواز اس کے حلق سے نکلی کہ اس کے دھماکے سے سمندر میں طوفان آ گیا۔

بڑی بڑی موجیں اٹھ کر سمندری عفریت کے پہاڑ جیسے جسم سے نکلنے لگیں ایک موج نے شریم کی کشتی کو نیچے سے اوپر اچھال دیا کشتی الٹ گئی اور شریم راج کماری سمیت سمندر میں گر پڑا۔ شریم نے سمندر میں آنکھیں کھول کر دیکھا وہ سمندر کی تہ میں اگی ہوئی جھاڑیوں میں ابھی ہوئی تھی اس نے راج کماری کو بھی ایک جھاڑی میں پھنسے دیکھا شریم لپک کر اڑ گیا اور اس نے راج کماری کو جھاڑیوں سے بچھ لیا وہ اسے اوپر اٹھانے پانی میں اوپر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمندر کے پانی کا دباؤ اسے اوپر نہیں آنے دے رہا تھا۔

راج کماری غوطے کھا رہی تھی شریم اپنے جسم کی ساری طاقت لگا کر راج کماری کو سمندر کی سطح پر لے آیا اس نے سمندر کے نیچے سمندری عفریت کی بڑی بڑی ٹانگیں دیکھیں جو اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھیں اس نے راج کماری کا منہ موجوں کے اوپر کر دیا تاکہ وہ سانس لے سکے سمندر سے باہر آ گئے ہی اس نے دیکھا کہ وہ سمندری عفریت سے زیادہ دور نہیں بلکہ وہ اس کے قریب اور شریم راج کماری کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو پکڑ کر چبانے کی کوشش کر رہا تھا وہ بار بار دھاڑ رہا تھا جس نے سمندر میں ایک دہشت پھیل کر رکھی تھی۔

شریم نے راج کماری کو کندھے سے پکڑ رکھا تھا جو نبی وہ سمندر کے اوپر آیا ایک بہت بڑی لہر نے اسے پیچھے سے اٹھایا اور بہا کر کافی دور لے گئی عفریت اب اس سے کافی دور چلا گیا تھا شریم نے راج کماری کی طرف دیکھا وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

شریم اسے لے کر سمندر میں تیرنا شروع کر دیا اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ کہیں کوئی چٹان بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ راج کماری کو ساتھ لے کر

تیرنا مشکل ہو رہا تھا وہ اسے لے کر اڑھیں جاتا تو ایک فرلانگ اڑنے کے بعد اسے دوبارہ سمندر میں اترنا پڑتا شریم نے محسوس کیا کہ راج کماری کو لے کر اگر وہ اسی طرح تیرتا رہا تو وہ جسم میں پانی بھر جانے سے مر جائے گی کیونکہ سمندری بڑی بڑی لہریں شریم کو تیرنے نہیں دے رہی تھیں پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور سمندری لہروں پر تیرتا چلا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا تھا اور یہیں اسے کہاں لے جائے گی۔ بہت دور تیرنے کے بعد شریم کی طاقت بھی جواب دینے لگی وہ تھک گیا اس کے ہاتھ ہلکے پڑ گئے اور بے ہوش راج کماری اس کے ہاتھوں سے نیچے گرنے لگی۔ شریم گھبرا گیا۔ وہ خود تو ایک روح تھا اور مر نہیں سکتا تھا اگر وہ تیرنا چھوڑ بھی دیتا تو سمندری لہروں پر بے حس و حرکت لیٹ کر بھی زندہ رہ سکتا تھا مگر سب سے زیادہ پریشانی اسے راج کماری کی طرف سے تھی وہ راج کماری کو ہر حالت میں زندہ رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات اسے ناممکن نظر آ رہی تھی راج کماری کے پیٹ میں سمندر کا کچھ پانی چلا گیا تھا اور وہ اس طرح بے ہوش تھی سمندری موجیں ان دونوں کو بہت دور لے آئی تھی۔

شریم نے اپنے سامنے راج کماری کو موت کے قریب دیکھا تو اس نے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا ہماری مدد کر دعا کے مانگتے ہی شریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کے نیچے اس کے پاؤں کسی ٹھوس شے سے لگ گئے ہیں اس سخت شے میں ٹھوڑی ٹھوڑی نری بھی تھی وہ حیران ہوا کہ اتنے گہرے سمندر میں یہ کون سی چیز ہے جس پر اس کے دونوں پیچ تک گئے ہیں کیا یہ کوئی سمندری چٹان تھی اس نے سوچا لیکن ایسا بھی نہیں تھا اگر چٹان ہوتی تو وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا۔ اور یہ وجود شریم کو اپنے سر پر اٹھائے سمندر میں آگے کو جا رہا تھا۔ پھر یہ کیا تھا شریم نے پہلا کام تو یہ کیا کہ راج کماری کو سمندر میں سے نکال کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا اس کے پاؤں چونکہ سمندر کے اندر کسی مضبوطی شے پر ٹکے ہوئے تھے اس لئے وہ بے فکر ہو گیا لیکن وہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اس

کے پاؤں کے نیچے یہ کون سی چیز ہے جو اسے لے کر آگے ہی آگے جا رہی ہے۔

شریم نے دیکھا کہ سمندر میں وہ شے ایک خاص سمت کی طرف سفر کر رہی تھی پھر اس شے نے ہیولے ہیولے سمندر میں اوپر کو ابھرتا شروع کر دیا شریم نے راج کماری کو اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا وہ شے پانی سے باہر آنے لگی ہوتے ہوتے وہ سمندر سے بالکل باہر آ گئی اور شریم نے نیچے جھک کر دیکھا چاہا کہ وہ کون سی چیز ہے کہ جس نے ان دونوں کو اٹھا رکھا ہے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سمندر میں سفر بھی کر رہی ہے۔

جونہی شریم کی نظریں اپنے پاؤں پر پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سات منہ والے ایک بہت بڑے اژدھاکے پھن کے اوپر کھڑا ہے اور اژدھا سانپ اسے لے کر سکون سے لہروں کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اچانک شریم کو نامن کا خیال آ گیا کہیں یہ نامن تو نہیں۔ شریم نے نامن کو آواز دی۔ ”نامن! ہم کیا یہ تم ہو۔“ اور اس کے ساتھ ہی شریم نے بے ہوش راج کماری کو اس اژدھا سانپ کے پھن کے اوپر لٹا دیا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ شریم خود بھی لیٹ سکتا تھا یہ بہت بڑا اژدھا تھا۔ اژدھانے اپنی زبان میں جیسے شریم سمجھتا تھا جواب دیا۔ ”مجھے بھی نامن ہی سمجھو بھائی شریم۔“

”کیا تم واقعی نامن ہو تمہاری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے۔“ شریم کے اس سوال پر اژدھانے کہا۔

”شریم بھائی میں نامن نہیں ہوں مگر نامن کا دوست ہوں۔ اور میرا نام سمندر کا شیش ناگ ہے۔ اتفاق سے میں اس سمندر کے نیچے سے گزر رہا تھا تو مجھے تمہاری آواز سنائی دی میں تمہاری طرف بڑھا تو مجھے تمہارے جسم اوپر پڑوں سے اپنے پرانے اور بہترین ساتھی نامن کی خوشبو آئی اسی وقت میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”یہ بات تو کہ تم نامن کو جانتے ہو.....؟“

شریم نے کہا۔ ”کیوں نہیں وہ تو میری بہن ہے۔ اور ابھی اس سمندر میں میرے ساتھ تھی کہ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹ جانے سے وہ مجھ سے بچ کر گئی مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے..... میں اور نامن راج کماری کو اس کے ماں باپ کے پاس ہندوستان لے کر جا رہے تھے۔“

”کیا نامن سمندر میں نہیں ہے۔“ اژدھانے کہا۔

”نہیں شریم نامن اس سمندر میں کہیں بھی نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو مجھے سمندر کی ایک ایک لہر آ کر بتا دیتی پھر نہ جانے وہ کہاں جا چکی ہے وہ سمندر سے نکل کر ضرور کسی جزیرے یا کسی ساحلی ملک میں پہنچ گئی ہوگی اگر سمندر میں ہوتی تو میں ضرور تمہیں بتا دیتا۔“

شریم کہنے لگا۔ ”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ ہمارا دوسرا بھائی شاہان کہاں ہے۔“

اژدھے نے کہا۔ ”شاہان کا نام سن کر مجھے خوشی ہوئی آج سے کئی سال پہلے ایک دریا میں میرا نامن سے تعارف کر گیا تھا مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ کہ شاہان اس وقت کہاں ہوگا..... ایسا کچھ معلوم کرنا میری طاقت سے باہر ہے کیا وہ بھی اس ہم میں تمہارے ساتھ تھا۔“

”ہاں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے اصل میں ہمیں اس سفر میں کئی مہینوں سے واسطہ پڑتا ہے اور کئی مصیبت میں پھنسنے ہوئے لوگ ملتے ہیں جن کی ہم کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم پھر روانہ ہوتے ہیں۔ راج کماری کو بھی ہم بہت بڑی مصیبت سے نکال کر اس کے ماں باپ کے گھر لے جا رہے ہیں۔ اس کا باپ ایک ریاست کا راجہ ہے۔“ اژدھا خاموشی سے شریم کی باتیں سنتا رہا۔ وہ برابر سمندر میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا شریم نے بات ختم کی تو وہ کہنے لگا۔

”شریم بھائی میں تم تینوں کی لمبی اور مصیبتوں سے بھری ہوئی آبِ ہیتی سے اچھی طرح واقف ہوں

کاش میں تمہاری اس سے زیادہ مدد کر سکتا۔ کیونکہ ابھی میری زندگی کے صرف تین سو سال ہی گزرے ہیں دو سو سال اور گزر جانے کے بعد میں بھی نامن کی طرح جو چاہے شکل بدل سکتا ہوں۔ لیکن ابھی میں تمہارے لئے صرف اور صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ میں تمہیں اس سمندر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں۔“

راج کماری اسی طرح اژدھے کے اوپر بے ہوش پڑی تھی۔ اژدھانے کہا۔

”کیا میں اس راج کماری کو ہوش میں لے آؤں۔“

شریم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ اگر اس وقت ہوش میں آگئی تو شاید تمہیں، میرا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو ایک اژدھے کے اوپر لیٹے دیکھ کر پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ زمین پر پہنچنے کے بعد ہوش میں لایا جائے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ اژدھانے کہا۔

شریم نے اس سے پوچھا۔ ”اس طرح زیادہ دیر بے ہوش رہنے سے وہ مرنے نہیں جائے گی۔“ اس کے جواب میں اژدھانے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا راج کماری کے بدن میں جو پانی داخل ہوا تھا وہ میرے سر کی گرمی کی وجہ سے خشک ہو چکا ہوگا زمین پر اترنے کے بعد میں تمہیں ایک مہرہ دوں گا وہ مہرہ راج کماری کے گلے میں باندھ دیتا پھر اسے کچھ نہ ہوگا اور اس پر زہریلے سے زہریلے سانپ کا بھی اثر نہ ہوگا۔“

شریم نے پوچھا۔ ”لیکن یہاں ارد گرد زمین کہاں ہے.....؟“

اژدھانے پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو؟“ شریم کہنے لگا۔

”ہمیں ہندوستان جانا ہے جیسا کہ میں نے پہلے تمہیں بتایا ہے کہ میں راج کماری کو اس کے راجہ باپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

اژدھا بولا۔ ”شریم بھائی فکر نہ کرو ہندوستان کا



ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“ دوپہر تک اسی طرح سمندر میں اڑوہا کے بچن پر لپٹ کر تیرتے رہے اور تیسرے پہر کے قریب دور زمین کے ساحل کی کالی لکیر نظر آنا شروع ہوئی اڑوہا نے شریم سے کہا۔

”وہ سامنے لکیر دیکھ رہے ہو یہ ہندوستان کا ہی ساحل ہے مگر یہ جنوب مغربی ساحل ہے کیا تم اسی جگہ جانا چاہتے ہو۔“ اڑوہا نے شریم سے کہا۔

شریم نے کہا۔ ”بس ٹھیک ہے تم ہمیں اسی جگہ پہنچاؤ کیونکہ راج کماری نے کہا تھا کہ اس کے باپ کی ریاست جنوب مغربی ساحل کے اندر کسی جگہ ہے۔“

یہاں شریم سے بھول ہوئی تھی کیونکہ راج کماری نے شریم کو یہ بتایا تھا کہ اس کے باپ کی ریاست ہندوستان میں ایک جگہ ہے اور اڑوہا انہیں جنوب مغرب کی طرف لئے جا رہا تھا جو کہ ہندوستان کا سب سے بڑا کنارہ ہے۔ اڑوہا نے سمندر میں اپنی رفتار

اور تیز کر دی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہ انہیں زمین پر پہنچا دے ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اڑوہا نے شریم کو ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر پہنچا دیا۔

شریم نے راج کماری کو ساحل کی ٹھنڈی ریت پر لیٹا دیا اڑوہا اپنا زبردست چھ منہ والا سر سمندر سے باہر نکالے لکڑا تھا اس نے شریم سے کہا۔

”میں تمہیں مہرہ دیتا ہوں اسے سنبھال کر رکھنا تم جس کسی کو میرا مہرہ دو گے اس پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوگا۔ اور راج کماری کے ماتھے پر لگاؤ گے تو ہوش میں آ جائے گی۔“ اس کے ساتھ ہی اڑوہے نے اپنے منہ سے ایک بزرنگ کا ایک چھوٹا سا پتھر شریم کے آگے اگل دیا۔

شریم نے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور اڑوہا کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

”اگر تم نہ ہوتے تو ہمارا یہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ کیونکہ میں راج کماری کو لے کر زیادہ دور تک پرواز

نہیں کر سکتا تھا۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”شریم تم ناگن کے بھائی ہو۔ اس حساب سے تم میرے بھی بھائی ہو۔ اور بھائیوں کی مصیبت میں مدد کرنا ہر بھائی کا فرض ہوتا ہے کاش میں اس سے زیادہ تمہاری مدد کر سکتا۔ اگر مجھے زمین پر بسر کرتے پورے پانچ سو برس ہو چکے ہوتے تو اس وقت میں تمہاری اور بھی مدد کر سکتا تھا پر ابھی میری عمر کے دو سو سال باقی ہیں۔“

شریم کہنے لگا۔ ”اڑوہا بھائی میں تو اب بھی تمہیں بھائی سمجھتا ہوں میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”اچھا خدا حافظ شریم بھائی اگر ناگن ملے تو اسے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ کبھی اس کا اس سمندر میں سے گزر ہو تو مجھ سے ضرور ملتی جائے۔“

شریم نے کہا۔ ”میں تمہارا پیغام ناگن تک ضرور پہنچا دوں گا خدا حافظ۔“ اور سات سروں والا اڑوہا واپس سمندر میں گم ہو گیا اس کے جاتے ہی سب سے پہلا کام شریم نے یہ کیا کہ راج کماری کے ماتھے پر مہرہ آہستہ سے رگڑا اور وہ ہوش میں آ گئی اس کی طبیعت پہلے سے اچھی تھی پیٹ کا سارا سمندری پانی اڑوہے کی گرمی نے جذب کر لیا تھا وہ آنکھیں کھولتی ہوئی بولی۔

”میں کہاں ہوں اور وہ..... وہ..... عفریت۔“ راج کماری نے سہم کر پھر سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خیال سے کہ کہیں راج کماری پھر سے بے ہوش نہ ہو جائے شریم نے کہا۔

”وہ عفریت چاچکا ہے راج کماری ہم سمندر سے نکل کر ہندوستان کی سرحد پر آ چکے ہیں۔“

”ہندوستان میرے باپ کا ملک ہے۔“ راج کماری نے آنکھیں کھول کر حیرانی اور خوشی سے کہا۔

”ہاں، ہاں، دیکھ لو کیا تم اپنے ملک کی زمین اور درختوں کو نہیں پہچانتی۔“ راج کماری نے اپنے اوپر بٹکے ہوئے ناریل اور تار کے لمبے ترچھے درختوں کو دیکھا

یہ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”لیکن ہم اس سمندری عفریت سے بچ کر کیسے۔“ شریم نے ہنس کر کہا۔

”ہمیں ایک دوسرا سمندری عفریت یہاں تک ہے۔“ راج کماری نے سہم کر پوچھا۔

”وہ کہاں ہے؟“ شریم نے اسے حوصلہ دیتے کہا۔

”میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا اس عفریت سے تمہیں بچا لیا ہے اور میں اڑا کر تمہیں یہاں لے کر شریم نے راج کماری سے پوچھا کہ وہ اندازہ

بتائے کہ وہ ہندوستان کے جس ساحل پر آ رہے ہیں اس سے اس کے راجہ باپ کا شہر کتنی دور ہے۔ راج نے بڑے غور سے چاروں طرف دیکھا

پس کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنے پتا کے شہر سے کافی دور ہوں جنوبی علاقے میں ہیں جبکہ میرے پتا کی

دور مانی علاقے میں ہے۔“ شریم کو کچھ پریشانی کیونکہ راج کماری کو اتنے خطرناک اور دردوں

رے ہوئے جنگلوں سے اکیلے لے کر جانا خطرے کا تھا مگر یہ کام شریم کا فرض بن چکا تھا اور وہ اس کے باپ تک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس

راج کماری سے کہا کہ کوئی بات نہیں ہمارا سفر جاری رہے گا۔ راج کماری نے سہم کر پھر سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس خیال سے کہ کہیں راج کماری پھر سے بے ہوش نہ ہو جائے شریم نے کہا۔

”وہ عفریت چاچکا ہے راج کماری ہم سمندر سے نکل کر ہندوستان کی سرحد پر آ چکے ہیں۔“

ہو رہا تھا۔ پہلے شریم نے سوچا تھا کہ وہ رات سمندر کے کنارے کی ریت پر ہی بسر کریں اور اگلے روز دن کی روشنی میں جنگل کا سفر شروع کریں۔ لیکن پھر یہ سوچ

کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہ وہ ہر قسم کی مشکل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس لئے وقت ضائع کرنے کے بجائے جی بھر بہت ہے کہ سفر جاری رکھا جائے تاکہ وہ جلد

سے جلد اپنی منزل پر پہنچ سکے۔ انہوں نے کچھ فاصلہ سمندر کے ساحل پر جنگل کے ساتھ ساتھ طے کیا۔ پھر سورج کے حساب سے جنگل کے اندر جاتی ایک

گڈنڈی پر آ گئے۔ راج کماری کا حساب بالکل درست تھا وہ ہندوستان کے درمیانی علاقے کی طرف جا رہے تھے۔

لیکن راج کماری کا کل وہاں سے ہزاروں میل فاصلے پر تھا اور وہاں میں کئی دشوار گزار گھاٹیاں شور جاتے پتھروں سے ٹکراتے دریا آبشاریں، دلدلیں، خوشخوار درندے

اور وحشی قبیلے تھے جو انسان کو دیکھ کر اس پر فوراً زہر ملا تیر چلا کر ہلاک کر دیتے تھے۔

شریم ایک نوجوان تھا اسے کئی خطرناک دہشت ناک سفروں کا تجربہ تھا جنگل گھنا نہیں تھا تاڑ کے لمبے

لمبے چھتروں والے درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اگے ہوئے تھے۔ زمین پتھر پٹی اور تار ہوا تھی سوچی

گھاس کی جھاڑیاں یہاں وہاں نظر آ رہی تھیں سورج کی سنہری روشنی دور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے اوپر آ رہی تھی۔

کسی وقت درخت پر کوئی پرندہ بولتا تو جنگل کی خاموشی ٹوٹ جاتی شریم راج کماری سے باتیں کرتا جا رہا تھا یونہی چلتے چلتے جب شام ہوئی تو راج کماری

تھک گئی اور کہنے لگی۔ ”شریم بھائی میں اب چل نہیں سکتی مجھے پیاس لگی ہے اور بھوک بھی ستانے لگی ہے۔“

شریم نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ہم کوئی مناسب جگہ دیکھ کر وہاں رات بھر بھی آرام کریں گے اور تمہارے کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔“ اس وقت دونوں ایک

یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا..... بس ایک گنڈی سی جی تھی جس میں اگی ہوئی بسی گھاس یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس پر سے بہت کم کوئی گزرتا ہے یہاں جانوروں کے پاؤں کے بھی نشان نہ تھے ٹیلے کا موڑ موم کر شرمیم سامنے آیا تو اسے ایک چشمہ نظر آیا جو ٹیلے کے پتھروں سے نکل کر وادی میں جا رہا تھا۔ راج کماری نے چشمے کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی یہاں جنگلی بیروں کے بہت درخت تھے۔ شرمیم نے راج کماری کو بھر توڑ کر دیئے جو اس نے بڑی مشکل سے کھائے۔ مخلوں میں رہنے والی راج کماری نے ہسلاک اس طرح کے کھنے جنگلی بھر کھائے ہوں گے لیکن مجبور تھی جب انسان پر کوئی بھاری مصیبت آتی ہے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

”میرا خیال ہے کہ اسی جگہ رات بسر کرتے ہیں۔“ شرمیم نے کہا۔  
راج کماری درختوں کو دیکھ کر بولی۔ ”بہتر ہوگا کہ ہم کسی درخت پر بٹیرا کریں کیونکہ زمین پر رات کو جنگلی درندوں کا خطرہ ہوگا۔ اور ہمارے پاس تو ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں۔“ ان کے پاس واقعی کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن شرمیم کو اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا۔ اور خدا پر بھروسہ تھا وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

کہنے لگا۔ ”تم کسی درخت پر چڑھ جاؤ میں یہاں زمین پر ہی رہوں گا۔“ اس پر راج کماری نے بڑی بہادری سے کہا۔ ”اگر تم زمین پر رہو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی درخت پر سانپوں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے آؤ مل کر اچھی سی جگہ بناتے ہیں۔“ انہوں نے چشمے کے پاس ہی ایک جگہ سے پتھر صاف کئے ادھر ادھر سے خشک گھاس اور گھرے پڑے پتے لاکر دو بستر تیار کئے اور ان پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شام کے سائے جنگل میں اتر آئے تھے خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی درختوں کے نیچے اندھیرا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا اور پھر رات آگئی چاروں

طرف تاریکی کا راج ہو گیا جنگل سنان ہو گیا درختوں پر بٹیرا کرنے والے پرندے بھی خاموش ہو گئے اس خاموشی میں صرف چشمے کا پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔ راج کماری دل میں خوف سا محسوس کر رہی تھی مگر اوپر سے وہ ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی خوف نہ ہو۔

شرمیم اس کے دل کا حال جانتا تھا اور اس کی حفاظت کا عہدہ کئے ہوئے تھا۔ راج کماری کو اس کی بھی زیادہ تہائی اور خوف محسوس ہو رہا تھا کہ شرمیم ا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ صرف اس کی آواز سن سکتی تھی۔

”شرمیم بھائی کیا تم مجھے نظر نہیں آ سکتے؟“ شرمیم ہنس پڑا۔ ”کاش ایسا کرنا میرے اہلکار میں ہوتا میں مجبور ہوں راج کماری خدا جانے وہ وہ کب آئے گا جب میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک دوسرے کو نظر آ سکوں گا۔“ راج کماری نے کمال جواب نہ دیا پھر خاموشی چھا گئی اس خاموشی سے اس پھر سے خوف ہونے لگا وہ چاہتی تھی کہ شرمیم اس باتیں کرنے۔ شرمیم بھی اب بولتے بولتے تھک گیا اس نے راج کماری سے کہا۔

”سو نے کی کوشش کرو بہن اور ڈرو نہیں تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوں میں سوؤں گا نہیں تمہارا پہرہ دوں گا۔“

راج کماری نے کہا۔ ”تم باتیں کرتے ہو سو نے کی کوشش کرتی ہوں۔“ راج کماری نے اسے بند کر لیں اسے شرمیم کی آواز برابر آرہی تھی وہ مصر کی ہزاروں سال پرانی کوئی کہانی سن رہا تھا پھر غود کی طاری ہونے لگی اور پھر وہ سو گئی۔

ضرورت پیش نہ آئی تھی مگر وہ کبھی کبھی شوقیہ سوچا تھا کمال کی بات تھی کہ سو نے میں اسے کسی چیز کی ذرا سی تھی اور اسے کوئی خواب بھی نہ آتا تھا آخری ب شرمیم نے کافی پہلے دیکھا تھا بھر حال راج کماری کی نیند سو رہی تھی اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سن سکتی تھی۔

شرمیم خوش ہو گیا اس نے بھی ایک پتھر سے ٹیک لائی آٹھیں بدن کر لیں خدا جانے کیا بات ہوئی شرمیم کی بھی آٹھ لگ گئی حالانکہ وہ اس قسم کے بات میں کبھی نہ سویا تھا لیکن قسمت میں جو ہونا تھا ہو کر رہتا تھا شرمیم گھاس پر راج کماری سے پانچ کی دوری پر دوسری طرف منہ کئے سو رہا تھا وہ سو نے کبھی کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا لیکن جہاں وہ سویا ہوا تھا اسے خشک گھاس اور پتے دب گئے تھے یہ کوئی سے میں فور سے دیکھتا تو اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہاں سویا ہے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر نیند کی دنیا کو چکے تھے۔

رات خاموش اور سنان تھی جنگل کے درختوں کیوں سے اور زیادہ ڈراؤنا بنادیا تھا سوائے چشمے پانی کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی پھر اچانک راتوں میں کوئی جنگلی پرندہ پھڑپھڑایا جیسے وہاں کے نیچے سے کوئی شیر یا پھینا گزرا ہو کیونکہ پھر آدھی رات کو ہی اپنے شکار کی تلاش میں جنگل میں بہت دور کسی باغی کے بولنے کی آواز اس کے بعد پھر گہرا سنانا چھا گیا۔ چند لمحوں کے بعد سب کے درختوں پر کوئی الو بول کر چپ ہو گیا زیادہ ڈراؤنی ہو گئی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ یہ کیا تھی کبھی کبھار نہ تھی۔

جنوبی ہند کے ایک براسرار قبیلے کے دو جنگلی رات کو انسانی بو یا کراہر کو بو سے آ رہے جنوبی ہند کے کچھ جنگلوں کا سب سے بدنام قبیلہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انسانی گوشت بڑے

شوق سے کھاتے تھے بلکہ انسان کا سر کاٹ کر اسے سکیڑ کر لٹی کے سر جھٹا بنانے کا فن بھی جانتے تھے۔ انسانی سر کاٹ کر یہ چندہ دن اس پر کوئی ایسا عمل کرتے کہ کٹا ہوا انسانی سر کی کھوپڑی ناک منہ اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہوتے بلی کے سر جتنی ہو جاتی پھر وہ انسانی سر کو اپنی جھوپڑی کے باہر لٹکاتے اور ان کا سردار اپنے گلے میں انسانی سکرزی ہوئی کھوپڑی کا ہار بھی شوق سے پہنتا تھا۔

دونوں جنگلی انسان کی تلاش میں ساحل سمندر کی طرف جا رہے تھے جہاں کوئی نہ کوئی ماہی گیر انہیں مل جاتا تھا اور وہ اسے پکڑ کر لے جاتے تھے پہلے اس کا سر کاٹتے اور پھر اس کا گوشت اُبال کر کھاتے۔

اچانک چلتے چلتے انہیں ہوا میں انسانی بو محسوس ہوئی جنگلوں میں ہی ساری زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے ناک بڑی تیز ہو گئی تھی اور یہ بڑی دور سے انسان کی بو سونگھ لیتے تھے انہوں نے کافی دور سے راج کماری اور شرمیم کے جسم کی بو سونگھ لی تھی اور وہ خوشوار درندوں کی طرح جھاڑیوں اور ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے اس چشمے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں راج کماری اور شرمیم گہری نیند سو رہے تھے۔

جنگلیوں نے اپنے ہاتھوں میں لمبے نیزے تھام رکھے تھے کاندھے پر تیر کمان لٹکے ہوئے تھے ان کے تیر زہر بھرے تھے اور نشانہ ایسا کہ اڑتی چڑیا کو مار گرا لیتے تھے۔

جب انسانی بو زیادہ تیز ہو گئی تو دونوں جنگلی رینگ رینگ کر چلے گئے۔ آخر وہ جھاڑیوں میں سے اس جگہ نکل آئے، جہاں چشمے کے پاس خشک پتوں پر انہوں نے ایک عورت کو لیٹے ہوئے دیکھا اگرچہ وہاں اندھیرا تھا مگر ان کی آنکھیں الوؤں کی طرح اندھیرے میں ہر چیز کو دیکھ لیتی تھی سوئی ہوئی راج کماری کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے جھپکنے لگیں ہونٹ پھیل گئے اور لمبے لمبے زرد دانت باہر نکل آئے جب کوئی عورت مل جاتی ہے تو ان کے ہاں بڑی خوشی کی

جاتی ہے۔

اب وہ آہستہ آہستہ سوئی ہوئی راج کمار کی طرف بڑھنے لگے راج کمار ہلکے ہلکے نیند کے خراٹے لے رہی تھی اس سے ذرا ہٹ کر شرم سوراہا مگر شرم ان جنگلیوں کو دکھائی نہ دے رہا تھا وہ چپتے کی طرح اپنی تھوٹھنیاں زمین کے ساتھ لگائے۔ ریتھلے ہوئے راج کمار کے سر کے اوپر آگئے۔

ایک جنگلی نے اپنے ہاتھ میں کسی بوٹی کے رس کو اچھی طرح گڑا اور پھر اپنا ہاتھ راج کمار کے منہ پر رکھ کر زور سے دبا یا راج کمار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی مگر چونکہ اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا اس لئے وہ کوئی آواز نہ نکال سکی جو بھی اس نے ناک کے ذریعے سانس لی اس کے پیچھے دونوں میں ایک بڑی ہی تیز ناگوار بو تھی جس کی وجہ سے اسے زبردست چکر آگیا۔ راج کمار کی آواز نکالنے بغیر بے ہوش ہو گئی۔

جنگلی سے اسے تھکیت کر ایک طرف لے گئے انہیں کسی دوسرے انسان کی بوا بھی تک آ رہی تھی اشاروں اشاروں میں ایک جنگلی نے دوسرے سے پوچھا۔

”یہ کس انسان کی بو ہے اور وہ انسان کہاں ہے“

”دوسرے نے اشاروں ہی اشاروں کہا۔“  
”وہ یہاں تو کسی دوسرے انسان کو نہیں دیکھ رہا۔ مگر ان کے ناک جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے شرم ان سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر گھاس کے چوں پر سوراہا تھا مگر وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے جب انہیں وہاں کوئی دوسرا انسان دکھائی نہ دیا تو وہ بے ہوش راج کمار کو کندھے پر ڈال کر جنگل میں گم ہو گئے۔“

جنگل آگے جا کر اتنا گھمانا ہو گیا تھا کہ آدمی اس کے اندر بڑی مشکل سے چلتا تھا سانپ اس جنگل میں جگہ جگہ تھے اور درختوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے مگر وحشیوں کو سانپ پکڑنے میں بڑی مہارت حاصل تھی یہ سانپ کو لپک کر پکڑتے اور اس کی گردن کاٹ کر پھینک دیتے اور باقی جسم مولی کی طرح بڑے شوق سے کھا جاتے۔

سے کھا جاتے سانپ بھی شاید اپنے دشمنوں کو پہچاننے لگے تھے وہ بھی ان وحشیوں کے جنگلی اور گندے بالوں بھرے جسم سے اٹھنے والی تیز بو کو فوراً محسوس کر لیا کرتے تھے اور جہاں سے یہ گزرتے وہاں سے وہ بھاگ جاتے تھے۔

دونوں وحشی گھمان جنگل کے گہرے اندر جہاں میں یوں آسانی سے جھاڑیوں میں گزرتے چلے گئے جیسے وہ کسی شہر کی گلیوں میں سے گزر رہے ہوں جنگل میں ایک جگہ پہاڑی ٹیلے کی سرنگ آگئی۔

دونوں اس سرنگ میں داخل ہو گئے اس سرنگ میں گہرا اندھیرا تھا اور دونوں سے سانپوں کی سیٹوں اور اڑھوں کی پھٹکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن دونوں وحشی بے فکر ہو کر چلے جا رہے تھے ہاں تو بڑی تھوڑی دیر بعد وہ منہ سے سیٹی کی ایک عجیب سی آواز نکلاتے جس کے بعد سانپوں اور اڑھوں کی آوازیں بند ہو جاتی تھیں سرنگ آگے جا کر ایک اور جنگل میں آگئی یہاں اچانک ایک بہت بڑا رینگھٹا ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا دونوں وحشی رک گئے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ایک وحشی راج کمار کی کوز میں ہالٹا اور پھر دونوں تیر کمان لے کر زمین پر گھٹنا رکھ کر انہیں باندھنے لگے۔ رینگھٹ زور سے غرایا اور ان کی طرف ہاتھ انہوں نے زہریلے تیر اس کی طرف چلا دیئے دونوں رینگھٹ کی گردن میں آ کر لگے تو رینگھٹ کی گردن میں داخل ہو گیا یہ زہر اس قدر خوف ناک اور تیز تھا کہ منہ کے بل گڑا اور تڑپ تڑپ کر اسی وقت ٹھنڈا ہوا۔

دونوں وحشی راج کمار کو اٹھا کر دوبارہ جنگل میں داخل ہو گئے وہ ایک ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے نیچے دو ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں آگے والا ڈروشن تھا اور شعلوں کی روشنی میں وہاں کے درختوں کے تنے چمک رہے تھے یہاں ان خوفناک وحشیوں قبیلہ رہتا تھا انہوں نے الاؤ کے پاس جاتے ہی الاؤ ہو کر منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالی اور آواز نکال چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سے مرد اور عورتیں

## استماع الحسنی۔۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر گوشے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو	جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھر بیلو نا چاقی	کاروبار بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

**سید فرمان شاہ** کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔  
وہ ہمیشہ دیکھ رہے ہیں پلک چمکنے سے پہلے کا علم جو بکڑے کام بنائے

سرال میں بھوسہ کی آنکھ کا تار این سکتی ہے ہر کام 100% راز داری کے ساتھ

کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تو یہ ہے آپ کی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کا پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کا پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزما لیجیے  
ایک بار میں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔  
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

سید فرمان شاہ  
0300-6484398

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جائی کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ مومکات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے وسطی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاندان سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنیوں کی بے رخی سے دیکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزما لیجیے  
ایک بار میں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔  
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

سید فرمان شاہ  
0300-6484398



شور مچاتے باہر نکل آئے انہوں نے راج کماری کو دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگے۔

سردار بھی اپنی جمونپڑی سے سر پر سیٹکوں والا تاج پہنے باہر نکل آیا سب وحشی خاموش ہو کر جبک گئے سردار نے بے ہوش راج کماری کے منہ پر ایک خاص قسم کی دوائی چسکی تو تھوڑی ہی دیر میں راج کماری کو ہوش آ گیا اس نے جواگ کی روشنی میں اپنے ارد گرد دھشیوں کو دیکھا تو خوف سے اس کے حلق سے چیخ نکلی۔

سردار نے راج کماری کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی زبان میں دھشیوں سے بولا۔

”یہ کھوپڑی نرم سپاہیک ہفتے میں سکا جائے گی۔“ راج کماری نے اپنے بال چمڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں راجہ کی بیٹی ہوں مجھے چھوڑ دو۔“ کوئی بھی وحشی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا انہوں نے راج کماری کی چیخ پکار کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

”پہلے میں اس کے ساتھ شادی کروں گا پھر اس کا سر کاٹ کر اپنے گلے میں ڈال لوں گا۔“ سردار نے کہا۔ ”کل رات ہماری شادی ہوگی پرسوں میں خود اس کی گردن کاٹوں گا اور اس نیز پر رکھ کر آگ میں بھونوں گا۔“

یہ سن کر وحشی نعرے لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے وہ روشنی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور ایک برگد کے گھنے درخت کے نیچے بنے ہوئے جمونپڑے میں جا کر قید کر دیا جاو وحشی جمونپڑی کے ارد گرد پہرہ دے رہے تھے راج کماری جمونپڑی میں جاتے ہی سسکیاں بھر کر رونے لگی اسے شریم اور اپنے ماں باپ کی یاد آگئی اور وہ غم سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی لیکن وہاں اس کے آنسوؤں میں ترس کھانے والا کوئی بھی نہیں تھا تھک ہار کر وہ گھاس پر شرم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

دوسری طرف اچانک ہی شریم کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کہ راج کماری وہاں سے غائب ہے پہلے تو وہ سمجھا کہ راج کماری شاید جتنے پر پانی پینے کے لئے گئی ہوگی اٹھ کر اس نے جتنے پر بھی دیکھا وہاں بھی وہ نہیں تھی شریم نے ارد گرد ساری جنگل میں راج کماری کو تلاش کیا اسے آوازیں دیں مگر سوائے اوازوں کی آواز کے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔

الو بھی شریم کو شاید یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وحشی راج کماری کو پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن شریم الو کی زبان نہیں سمجھتا مگر تاکن جانوروں کی بولی سمجھ لیتی تھی لیکن تاکن تو شریم سے ہزاروں میل دور پر تنگلی جہاز پر پڑتال کی طرف سفر کر رہی تھی اور شاہان بے چارہ ابھی تک سمندر کے نیچے میں پہاڑ کی چوٹی والے پراسرار تھاب پوشوں کے محل کے تہہ خانے کے کنویں میں پڑا ہوا ہر نکلنے کی تدبیر سوچ رہا تھا اور عمارہ کا بے ہوش جسم اسی تہہ خانے کے کونے میں رکھے ایک تابوت میں بند تھا۔

ادھر شریم بہت پریشان تھا۔ راج کماری کا اچانک غائب ہو جانا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا ”کہیں اسے کوئی درندہ اٹھا کر نہ لے گیا ہو لیکن اگر درندہ اٹھا کر لے جاتا تو راج کماری ضرور چیخ مارتی اور شریم جاگ پڑتا یہ اتنی خاموشی اور اس پراسرار طریقے سے اسے کون اغوا کر کے لے جاسکتا ہے۔“

جنگل میں اندھیرا ہو گیا تھا اور آسمان پر چاند نکل آیا تھا جس کی روشنی شاخوں کے پتوں سے چمن چمن کر زمین پر پڑ رہی تھی اس روشنی میں شریم نے دیکھا کہ جن پتوں پر راج کماری لیٹی ہوئی تھی وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے روندے گئے تھے شریم بہت ذہین تھا اس کی نظروں سے ایسے واقعات گزر چکے تھے وہ سمجھ گیا کہ یہاں کے جنگلی لوگ رات کو آکھڑی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور انہوں نے ضرور راج کماری کو کسی جنگلی بوٹی کی دوائی سونگھا کر پہلے بے ہوش کیا ہوگا شریم نے گھاس پر وحشی آدمیوں کے پاؤں

کے نشان بھی دیکھ لئے تھے وہ ان نشانوں کے تعاقب میں اس طرف روانہ ہو گیا۔

شریم اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ گھاس پر جنگلیوں کے پیروں کے نشان اب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

شریم اگرچہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے وجود کو جنگلی جانور اور کیرے مکورے بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

شریم جنگل میں آگے ہی آگے چلتا چلا گیا کافی آگے جا کر ایک بہت بڑا اڈھا اس کے راستے کے نیچے میں بیٹھا ہوا تھا شریم اس کے قریب سے ہو کر گزرنے لگا تو خدا جانے اڈھے کو کیسے محسوس ہوا کہ کوئی انسان اس کے پاس سے گزر رہا ہے اڈھے نے زور سے پھنکار ماری اور اس کے منہ سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔

شریم نے اڈھے کو کچھ بھی نہ کہا اور آگے کو روانہ ہو گیا آگے جا کر ایک ٹیلا آگیا جس کے نیچے ایک سرنگ کا منہ کھلا ہوا تھا شریم وہاں کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ وہ سرنگ کے اندر جائے یا ٹیلے کی دوسری طرف سے ہو کر نکل جائے اس کے دماغ نے اہم فیصلہ کیا۔

اور وہ سرنگ کے اندر داخل ہو گیا انسان کی نیت نیک ہو اور دل میں دوسرے انسانوں کی بھلائی کا خیال ہو تو اللہ پاک دل میں نیک اور صحیح خیال ڈال کر رہنمائی کرتا ہے۔

ایسا ہی شریم کے ساتھ ہوا کیونکہ اس کا بھی دل صاف تھا اور نیت نیکی کی تھی وہ بغیر کسی غرض کے راج کماری کی مدد کر رہا تھا اگر کوئی خیال تھا تو صرف انسانی ہمدردی کا۔

سرنگ میں اندھیرا تھا لیکن شریم ایسے کئی اندھیری سرنگوں سے گزر چکا تھا یہ سرنگ اس کے لئے کوئی نئی سرنگ نہ تھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا اندھیرے میں کافی دیر چلنے کے بعد شریم نے سرنگ میں روشنی کا دھندلا سا دھبہ دیکھا جو کہ کافی بڑا ہوتا چلا گیا یہاں

سرنگ ختم ہو جاتی تھی اس سے آگے نیلے کے پار دھشیوں کی بستیائیں تھیں۔

راج کماری بھی وہاں ہی قید تھی یہاں پہنچتے پہنچتے پوچھنے لگی اور آسان پر ٹیلی نیلی روشنی ہوئی تھی شریم کو ابھی تک کوئی جنگلی کبوتری نظر نہیں آئی تھی وہ کچھ ناامید سا ہو گیا تھا کہ شاید وہ غلط طرف نکل آیا ہے اور اسے جنگل میں دوسری طرف جانا چاہئے تھا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں کالے رینگھ نے دھشیوں پر حملہ کیا تھا اور رینگھ ان کے تیر کھا کر مر گیا تھا اس جگہ رینگھ کی لاش پڑی تھی جس پر لاکھوں چوہنیاں رینگھ کی تھیں شریم رینگھ کے پاس سے ہٹ کر آگے گز گیا یہاں اس سے غلطی ہو گئی بجائے اس کے کہ وہ سامنے والے درختوں سے ہو کر ٹیلے کی طرف جاتا تو مرے ہوئے رینگھ کی لاش کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ جدھر سے پانی کے چشمے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ جہاں چشمہ ہوگا وہاں دھشیوں کی آبادی ضرور ہوگی اس طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں ضرور کھڑی تھیں جن کی دیواروں پر گہری سبز اور سیاہ کائی جی ہوئی تھی۔

صبح کی ہلکی روشنی نے جنگل کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا جنگل کی ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔

شریم ایک چشمے پر آ کر رک گیا اور جسے وہ چشمہ سمجھ رہا تھا وہ ایک چٹان کی دراڑ تھی جس کے اندر سے پانی کے قطر نیچے چھوٹے تالاب میں گر رہے تھے۔

شریم نے ایک جمہری سی لی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کہیں وہ غلط سمت کو تو نہیں نکل آیا۔

اسنے میں اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی جھاڑیوں میں سے گزر کر اس چٹان کی طرف آ رہا ہو جس کے پاس وہ بیٹھا ہوا تھا اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا تو ایک جگہ جھاڑیاں ہل رہی تھی کوئی ادھر کوئی آ رہا تھا شریم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ویسے تو شریم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اسی جگہ بیٹھا رہا اسنے میں جھاڑی سے ایک وحشی باہر نکلا شریم

نے اسے دیکھا۔

اب اس کی ہمت بندھی کہ راج کماری کا پتہ چل جائے گا وہ اس جنگلی کا پیچھا کرے گا راج کماری ضرور ان جنگلیوں کی قید میں ہوگی شریم غور سے وحشی کو سکنے لگا وحشی چٹان والے پانی کی طرف آ رہا تھا شاید وہ پانی پیئے آیا تھا۔

اتنے میں اچانک شیر کی دھاڑ گونجی تو وحشی جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا ہو گیا شریم بھی چونکنا ہو گیا شیر تالاب پر پانی پینے آ رہا تھا وحشی نے پیچھے ہٹ کر ایک درخت کی آڑ لی اور تیز سے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اتنے میں ایک دھاری دھار شیر درختوں میں سے نکلا اور تالاب پر آ کر گر گیا۔

فغاء میں شیر نے بھی انسانوں کی بوسوگھ کی تھی۔ شیر نے خطرہ محسوس کر لیا تھا وحشی نے یہاں ایک زبردست حماقت کی کہ تیز لے کر درخت کی آڑ سے باہر نکل آیا اور شیر کو لٹکا رہا یہ اس کی بہادری بھی تھی شیر نے جو اپنے پیچھے ایک نوجوان کی لٹکائی تو پلٹ کر دیکھا۔

اور وہ دھاڑ اور سٹ کر جو اس نے چلائی لگائی تو سیدھا وحشی کے اوپر جا کر اور وحشی کو بوجھ لیا اس کی کھوپڑی کو انٹوں سے چھاؤ لائیکن وحشی کا تیز بھی شیر کا کام کر چکا تھا تیز شیر کے پیٹ میں پیوست ہو کر دوسری طرف سے آ رہا ہو گیا تھا تھوڑی دیر بعد دونوں نے دم توڑ دیا شریم اس خوبی کھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور اس قسم کا بہادرانہ کھیل اسے بہت پسند تھا۔

شریم اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف روانہ ہو گیا جدھر سے وحشی آیا تھا اس کا خیال تھا کہ وحشیوں کی جمہور پڑی اسی طرف ہوگی لیکن یہ بھی اس کی بھول تھی جنگل کے وہ جس راستے پر چلا جا رہا تھا وہ ایک بہت ہی چالاک جادوگر کے غار کی طرف جاتا تھا اس جادوگر کا نام گوتا تھا وہ جادو کے زور سے آدمی کو پتھر کا بنا دیتا جا نور بنا دیتا تھا وہ رجوں کو آتے جاتے دیکھ لیتا تھا اس وقت گوتا اپنے غار کے باہر آگ جلائے ہوئے

اور آنکھیں بند کئے کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

شریم جنگل میں چلتے چلتے جب اس غار کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کالا کلوٹا بن ماس قسم کا آدمی جو کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا سر پر مرغ کے پروں کا تاج پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔

شریم نے سوچا کہ یہ کونسا ہے کہ اس آدمی نے راج کماری کو غار میں چھپا رکھا ہوگا شریم اس آدمی کی طرف بڑھا کہ اس آدمی کے پیچھے سے ہو کر غار کے اندر جائے اور راج کماری آکر وہاں ہو تو ساتھ لے آئے۔

شریم درختوں کے پیچھے سے نکل کر غار کے سامنے آیا تو جادوگر کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ کوئی غیبی روح ہے اور سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے بھی جادو کے ضرور سے اسے دیکھا تھا۔ جادوگر نے اب ایک چال چلی وہ چپکے سے بغیر کوئی حرکت کئے آگ کے پاس بیٹھا رہا۔

جیسے اس نے شریم کو دیکھا ہی نہیں۔ شریم برے مزے اور بے لگاری سے ہانگوں کے پاس سے گزر کر غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے اندر جادوگر کی کا سامان پڑا ہوا تھا لوکا سر انسانی کھوپڑی کو اسے کی چونچ شیر کے پیچھے اور پیچھے کے ناخن اور ہڈیوں کی مالاکیں وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص کوئی جنگلی جادوگر ہے۔ اور اپنے جھوٹ موٹ کے جادو سے جنگلی لوگوں پر اثر ڈال کر ان سے کھانے پینے کی چیز ایشہ لیتا ہوگا۔ راج کماری غار کے اندر نہیں تھی شریم باہر آ گیا۔

ناگوا آگ کے پاس اکڑو بیٹھا خالی آنکھوں سے شریم کو دیکھ رہا تھا۔ شریم کچھ دیر غار کے پاس کھڑا جنگل کی طرف دیکھتا رہا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کس طرف جائے اور راج کماری کو تلاش کرے دن ڈھل رہا تھا اور شام سر پر آ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ رات اگر سر پر آگئی۔ تو پھر اتنے گھنے جنگل میں راج کماری کو تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ ناگو نے تھیلے میں سے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے نکال کر اپنے سامنے زمین پر پھینکے جیسے وہ کوئی فال نکال رہا ہو ہڈیوں کے زمین پر گرنے

کی آواز سن کر شریم ناگو کے قریب آ گیا۔

اس وقت ناگو زمین پر مگر رہی ہوئی ہڈیوں کو تکٹ رہا تھا پھر اس نے وہ ہڈیاں اٹھالیں۔ تھوڑی دیر بعد چار ہڈیاں اور اٹھالیں شریم کو شراست سوچی اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر زمین پر سے باقی ہڈیاں اٹھالیں یہاں اس کے ہاتھ میں جاتے غائب ہو گئیں وہ گمراہ ہاتھ ناگو شریم کو اپنے پاس بیٹھا صاف دیکھ رہا تھا اس طرح سے من تھا جیسے وہ شریم کو نہیں دیکھ رہا شریم کی خوش تھا کہ اس نے ناگو کو پریشان کیا ہے۔ شریم نے اردوں ہڈیاں دوبارہ زمین پر گرادیں، ناگو انہیں اٹھانے کو شریم نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کو غائب کر دیا کی کا خیال تھا کہ ناگو حیرت سے دنگ رہ جائے گا مگر اس جیسے کوئی اثر نہ ہوا۔ شریم کو تعجب ہوا کہ اس شخص ہڈیوں کے اچانک غائب ہونے پر اثر کیوں نہیں ہوا شریم ہاتھ میں یہ ہڈیاں تھا سے یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ شریم کو دیکھ رہا ہو شریم گھبرا گیا ناگو نے کہا۔ ”میری ہڈیاں واپس کر دو۔“ ناگو شریم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

کتنے ہی سالوں کے بعد یہ موقع آیا تھا کہ کسی نے شریم کو دیکھ لیا تھا اس نے جھٹ ہڈیاں ناگو کے جگے پھینک دیں اور حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا..... کہا“

”کیوں نہیں تم ایک سانولے اور خوب صورت کے ہو اور تمہارے کپڑے آج سے کافی برس پہلے کے لے کے ہیں تمہارا نام کیا ہے۔“ اب تو شریم پریشان کیا۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ کہیں اس پر جادو کا تم تو نہیں ہو گیا کہ اب ایسا تو نہیں ہے کہ اب ہر کوئی دیکھے گا اس نے ناگو سے کہا۔ ”تم نے مجھے کیسے لایا میرا نام شریم ہے۔“

ناگو نے کہا۔ ”میں اس علاقے کا سب سے بڑا کرہوں میرے اس جادو کی اتنی طاقت ہے کہ میں بھوت بدروح اور ڈائن کو دیکھ سکتا ہوں۔“ شریم ناگو ذرا دور ہٹ گیا اب وہ وہاں سے بھاگ

جانا چاہتا تھا کیونکہ نظر آنے کے بعد وہ ایک عام اور کمزور لڑکا بن گیا تھا۔

اور اسے ناگو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ناگو نے شریم کو کھٹکے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”شریم تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ میرے جادو نے تمہارے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ تمہارے اندر اب پہلے والی طاقت نہیں رہی۔ تم اب عام کمزور لڑکے بن چکے ہو اس لئے بہتر یہی ہے کہ جس طرح میں کہتا ہوں دیے ہی کرو۔“ شریم نے اپنے اور گردن کا ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے چاروں طرف درختوں کو آگ لگی ہو اور وہ اس آگ میں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا وہ اپنے آپ کو پہلی بار مجبور محسوس کرنے لگا۔ ناگو نے کہا۔

”میرے ساتھ اس غار کے اندر چلو۔“ شریم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

ناگو بڑی مکاری سے بولا۔ اس کے میزھے دانت آگ کی روشنی میں چمکنے لگے۔ ”یہ ایک راز ہے اور یہ راز میں تمہیں غار کے اندر جا کر بتا دوں گا ایک بات یاد رکھنا تم اب یہاں سے بھاگ نہیں سکتے اگر تم نے مجھائے کی کوشش کی تو وہ آگ جو تمہیں جنگل کے درختوں پر نظر آ رہی ہے وہ تمہیں جلا کر رکھ کر دے گی یہ میرے جادو کی آگ ہے اور اس کا وار بھی خالی نہ گیا بولوب تم کیا کہتے ہوں۔“ شریم نے ہتھیار پھینک دیئے وہ ناگو کے شٹے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اسے جنگل کی طرف سے آگ کے شعلے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ اس نے جھٹ کہا۔

”تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا میں تمہارے غار میں جا رہا ہوں اور شریم سر جھکائے ایک بے بس قیدی کی طرح غار کے اندر چلا گیا۔

غار میں جہاں جادوگر کا سامان رکھا تھا۔ وہاں ایک دیباہل رہا تھا اس کی روشنی بھی ایک اور ڈرائی تھی کھوپڑیوں کے سائے سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ناگو بھی غار کے اندر آ گیا۔ اس

نے آتے ہی پتھر کے چوڑے پر سے ایک کھوپڑی اٹھا کر اس کے اندر بیٹھے ہوئے مڑے کو باہر نکالا اور اسے ہوا میں شریں کی طرف اچھال دیا مڑے نے بجلی جیسی تیزی کے ساتھ فرش سے لے کر چھت تک شریں کے آگے ایک جالا بن دیا ناگو نے مڑے کو پکڑ کر واپس کھوپڑی میں ڈالا اور شریں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اسے تم مڑے پر کنزور جالا مت سمجھنا یہ اتنا مضبوط ہے کہ اگر ساری رات سارا دن اس پر تلوار کا وار کرتے رہو تو یہاں سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ یہ جال لوہے کی تاروں سے بھی مضبوط ہے۔“ شریں نے تار کو ہاتھ لگایا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے فولاد کے موٹے تاروں پر ہاتھ لگا رہا ہو۔

جال اپنی جگہ پر فولاد کا جھنگ بن کر اس کے سامنے آن کر اٹھا اور وہ اس کے اندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ شریں پہلے مکا مار کر ہاتھی کی گردن توڑ دیا کرتا تھا لیکن اس کے جسم میں وہ اب طاقت نہ رہی تھی وہ اب اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا اس نے زچ ہو کر ناگو سے کہا۔

”آخر تم نے مجھے یہاں کیوں قید کر لیا ہے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ ناگو نے کہا۔

”انہی بتاتا ہوں پھر وہ انسانی کھوپڑی کو اٹھا کر اس پر آنکھیں بند کر کے کوئی منتر پڑھتا رہا۔ منتر پڑھ کر کھوپڑی میں پرچھونک ماری تو وہ کھوپڑی بڈیوں کا پورا ڈھانچہ بن گئی اس ڈھانچے کے ہاتھ میں ٹکی ٹکراتھی۔ اور وہ فولادی جال کے آگے کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا ناگو نے ڈھانچے کو شکم دیا۔

”اس لڑکے کی پہرہ داری کرنا اگر اس نے کسی طریقے سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی گردن ایک پل کے اندر اندر اتار دیتا۔“ بڈیوں کے ڈھانچے نے ہوا میں زور سے تلوار لہرا کر اپنی سر کی کھوپڑی لہرائی۔ اور اس کے منہ کے سوراخ میں سے آواز آئی۔

”میں اس کی گردن کاٹ دوں گا۔۔۔۔۔ اور ڈھانچہ کھڑا کھڑا لگا۔ شریں ڈر گیا اتنی مدت بعد اسے کسی شے سے ڈر محسوس ہوا تھا وہ سچ سچ بہت کمزور

ہو گیا تھا ناگو نے شریں کے پیر میں لوہے کی ایک زنجیر ڈال دی اور زنجیر کو پتھر میں جکڑ دیا۔ ”آخر تم مجھے کس لئے قید کر رہے ہو۔“ شریں نے تنگ آ کر پوچھا۔

”اس لئے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“ ناگو مکاری سے ہنسا۔ شریں سر پکڑ کر پتھروں پر بیٹھ گیا خدا نے ضرور اس کے کسی بڑے بول کی سزا دی تھی اس نے دل ہی دل میں خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور دعا کی کہ وہ اسے پھر اس کی طاقت دے دے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

ناگو نے کہا۔ ”شریم میں جادو گروں کے بادشاہ افراسیاب کا ایک طلسم کر رہا ہوں اس طلسم کی کامیابی کے بعد میں سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحوں کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ لیکن اس طلسم کی ایک شرط تھی جو مجھ سے پوری نہیں ہو رہی تھی کہ کسی ایسے لڑکے کا سر کاٹ کر میں اس کا خون کالی بلی کو پورے چاند کی رات کو پلاؤں جو لڑکا کسی کو دکھائی نہ دیتا ہوں میں ایک عرس سے ایسے لڑکے کی تلاش میں تھا یہ تو اچھا ہوا کہ تم خود ہی غار میں آ گئے اب میں تمہیں ہرگز ہرگز نہ چھوڑوں گا دور! بعد پورے چاند کی رات ہے۔ اور میں اس رات کو تمہاری گردن کاٹ کر تمہارا خون کالی بلی کو پلاؤں گا۔

اور پھر سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحیں میرے قبضے میں آ جائیں گی۔ اور ناگو کو کردہ انداز میں کہتے۔ لگا کر جس پڑا شریں اس کی باتیں سن کر سمجھ گیا کہ یہ شخص اس کو زندہ نہ چھوڑے گا اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس ظالم انسان سے نہیں بچا سکتی اسے راج کماری کا خیال آ گیا کہ جانے وہ کس حال میں ہوگی اس نے ناگو سے کہا۔

”میں تمہارے قبضے میں آ گیا ہوں اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا کیا تم میری بہن راج کماری نے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“ ناگو نے بڈیاں پھینک کر زمین پر دو ٹکریں بنائیں اور اپنی لال ال آنکھیں اٹھا کر بولا۔

”راج کماری اس وقت اس جنگل کے سب

بے خوف ناک وحشی قبیلے کے قبضے میں ہے اور وہ لوگ آج رات کے آخری حصے میں اس کا سر کاٹ کر اس کی کھوپڑی سیکڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

شریم کانپ گیا۔۔۔۔۔ یا خدا وہ دونوں کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ہندوستان کے اس ساحل پر نہ آتے یہاں آتے ہی دونوں کی جان مڑے میں پڑتی ہے بلکہ اب تو یہ کہنا چاہئے کہ زندگی نے چراغ کی لوشمار ہی ہے زندگی کوئی دم کی محتاج ہے۔“ ناگو سے شریں نے کہا۔

”کیا تم میری بہن کی جان بچا سکتے ہو۔“ ناگو نے ذات نکال کر کہا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا کہ میں اپنے وحشی قبیلے کے سردار کے خلاف کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں بلکہ میں تو تمہاری بہن کی بڈیاں حاصل کر کے لگا رہا ہوں کھلے میں ڈالوں گا کیونکہ جوان لڑکی کی بڈیاں اسے طلسم کو زیادہ طاقتور بناتی ہے۔۔۔۔۔“ شریں خاموش رہا اس شیطان سے انسانی ہمدردی کی امید رکھنا فضول تھا شریں نے شاہان اور ناگو کو بہت یاد کیا خدا جانے کہ وہ کہاں گئے ہیں کاش انہیں خبر ہو جائے کہ ان کا بھائی شریں کس جیت میں پھنس گیا ہے اور صرف دو دن کا مہمان ہے جسے چاند کی رات کو اس کا سر کاٹ دیا جائے گا اور اس کے بہتے لہو کو کالی بلی چاٹ دے گی۔

رات ڈھل رہی تھی مگر رات کی خاموشی اور اندھیرا میں اس طرح چھایا ہوا تھا۔ ابھر راج کماری پڑی میں قید تھی وہ جاگ رہی تھی اس کی جھوپڑی کے باہر وحشی چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے راج کماری کی بات اس کے سامنے کھڑی تھی آخر وہ راج کی بیٹی تھی اس نے اپنی خون کھول اٹھا اور اس نے زندگی بچانے کے آخری داؤ لگانے کا فیصلہ کر لیا مرنا تو تھا ہی اسے کیوں نہ ایک بار فرار ہونے کی بھرپور کوشش کی جائے راج کماری نے جھوپڑی کے بانسوں میں سے باہر دیکھا جنگلی عورت راج کماری کے لئے کوئی شے تھاں میں اس کی جھوپڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جنگلی عورت

راج کماری کی جھوپڑی میں داخل ہوئی اسے کسی نے نہ روکا راج کماری کی آج گردن اتار دی جانے والی تھی اور یہ جنگلی عورت سردار کی جانب سے ایک رسم پوری کرنے آئی تھی جو کہ بہت ضروری تھی اس رسم میں ہلاک ہونے والی کھوپڑی لڑکی کے گلے میں لٹکے ہوئے والی رات کے پھیلے پہر سرخ گلاب کے پھولوں کی ملا پہنائی جاتی تھی آج راج کماری کے گلے کی رات تھی آج صبح اسے ہلاک کر دیا جانا تھا۔ چنانچہ سردار نے رات کے پھیلے پہر کے اندھیرے میں ایک جنگلی عورت کو گلاب کی ملا دے کر راج کماری کے پاس بھیجا تاکہ آخری رسم پوری کر سکے۔ جنگلی عورت کو دیکھتے ہی راج کماری کے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔

اور اس نے اس خیال کو پورا کرنے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا معلوم ہوا کہ جنگلی عورت گولی ہے اور صرف غول غامض ہی بات کرتی ہے جھوپڑی میں اس وقت سوائے راج کماری اور اسی جنگلی عورت کے اور کوئی نہیں تھا۔

جنگلی عورت نے تھاں میں سے گلاب کے پھولوں کا بار اٹھایا۔ اور آگے بڑھ کر راج کماری کے گلے میں ڈال دیا اور پھر غول غامض کے ہنسنے اور خوش ہونے لگی اور پھر اس نے ہاتھ سے اپنی گردن کی طرف ایسا اشارہ کیا جیسے چھری پھیر رہی ہو گویا راج کماری سے کہہ رہی تھی کہ صبح اس کی گردن کاٹ دی جائے گی اور کھوپڑی آگ میں ڈال کر چھوٹی کر دی جائے گی اور پھر خود بھی ہنس پڑی گویا راج کماری کی ہونے والی موت پر خوش ہو رہی ہو۔ راج کماری کے جسم میں خدا جانے کہاں سے یہ پھرتی یہ جرأت یہ طاقت آ گئی تھی شاید اس لئے بھی کہ جب چراغ بجھے والا ہوتا ہے تو بڑی زور سے بھڑکتا ہے راج کماری نے جنگلی عورت کو اشارے سے قریب بلایا جب وہ قریب آئی تو چپتے کی طرح اچھل کر اس کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ جنگلی عورت کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکی یہ راج کماری چاہتی تھی



طرف، دس ایک طرف اور دس دس ایک طرف جنگل میں کھس کر گم ہو گئے راج کمار کی جنگل میں بھاگی جاری تھی سمندر کا ساحل اب قریب تھا وحشی بھی اس کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے دوسری طرف شریم نے کسی کی حالت میں اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

اچانک اسے اپنی میٹھ کے اندر بیٹے کے ساتھ کسی سخت سی چیز کا احساس ہوا اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا کہ یہ کیا ہے اچانک امید کی ایک کرن اس کے چہرے پر روشن ہوئی کیونکہ یہ وہ سانپ کا مہرہ تھا جو اسے چھوٹے والے اڑدھے نے دیا تھا کہ مصیبت کے وقت تمہارے کام آئے گا شریم نے دیکھا کہ ناگوار کے باہر کڑا ہی میں سے ابلا ہوا بدبودار پانی نکال کر ایک ٹکے میں ڈال رہا تھا پھر وہ ٹکے لے کر شاید اسے کسی خفیہ جگہ رکھنے جنگل کی طرف چلا گیا اس کے جاتے ہی شریم نے سانپ کے مہرے کو گلے میں سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اے میری بہن ناگن کے دوست اڑدھا اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کر میں ناگن دنیوی کا بھائی ہوں یا اسے میرے حال کی خبر کر یا تو میری جان بچا۔“

شریم مہرے کو ہتھیلی میں رکھے غور سے دیکھ رہا تھا غار میں گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ اچانک اس کی نظروں کے سامنے ہتھیلی پر سانپ کا مہرہ ہلنے لگا ہلنے ہلنے مہرہ ایک دم سے الٹا ہو کر ہتھیلی پر رک گیا اس کے ساتھ ہی شریم نے دیکھا کہ غار کے کونے میں اس کے سامنے وہی چھوٹے والا اڑدھا کھڑا ہے اڑدھا نے شریم سے کہا۔ ”شریم بھائی میں ناگن کا دوست ہوں تم ناگن کے بھائی ہو تو میرا بھی بھائی ہو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں ناگن سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دوں گا تمہیں یہاں کس نے قید کر رکھا ہے۔“ شریم نے اسے ناگوار کا سارا قصہ سنایا اور یہی بتایا کہ اس نے اسے دیکھا کیا ہے اڑدھے نے کہا۔

”وہ کہاں ہے۔“ شریم نے بتایا کہ جنگل میں گیا اور بہت طاقتور جاوڑو گر ہے۔

نئی لپیٹ رکھی تھی اسے کوئی دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ جنگلی وحشی کی بیوی یا بہن جنگل میں جا رہی ہے اس کا سارا جسم کالا ہو رہا تھا بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں مٹی جی ہوئی تھی اب تو وہ یوں لگ رہی تھی جیسے جنگل میں بدروح چلی جا رہی ہوں راج کمار کی بھانجی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھی جہاں شریم اور وہ سوئی ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ شریم وہاں نہیں تھا جسے کا پانی اسی طرح دراڑ میں سے نکل کر چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا راج کمار نے وہاں سے ایک درخت کی شاخ اُتار کر اسے اپنے جسم کے اوپر والے حصے پر لپیٹ لیا اور سوچا کہ یا اسے شریم کی تلاش میں جانا چاہئے لیکن اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ شریم کہاں اور کدھر گیا ہے وہاں رکنا بڑا ہی خطرناک تھا دن چڑھ آقا تھا اب کسی بھی وقت دشمنوں کو راج کمار کی فراک پید چل سکتا تھا اور وہ اس کی تلاش میں طوفان بن کر جنگل میں نکلے والے تھے۔

راج کمار نے اس طرف چلنا شروع کر دیا جس طرف سے وہ شریم کے ساتھ جنگل میں داخل ہوئی تھی وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر چٹانوں کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے راجہ باپ کی ریاست شمال کی طرف ہی تھی اگرچہ وہاں سے وہ ریاست کافی دور تھی لیکن راج کمار کی کھوپڑیاں پہنچنے والے وحشی کی دنیا سے دور نکل جانا چاہتی تھی وہ بھاگتی چلی گئی جب تھک گئی تو ایک درخت کے نیچے گر کر اپنا سانس درست کیا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

اور دن چڑھا تو جنگلی دشمنوں میں شوری شروع کیا راج کمار کے کپڑے ان کی اپنی کوگی جنگلی عورت کی کئی کے پاس پڑے تھے اور راج کمار کی غائب تھی راج کا غصے کے مارے برا حال ہو رہا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی شکار ان کے جنگل سے نکل بھاگا تھا اس نے اٹھا کر چیخ مار کر کہاں ”وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کی گردن کاٹ کر میرے پاس لے آؤ۔“

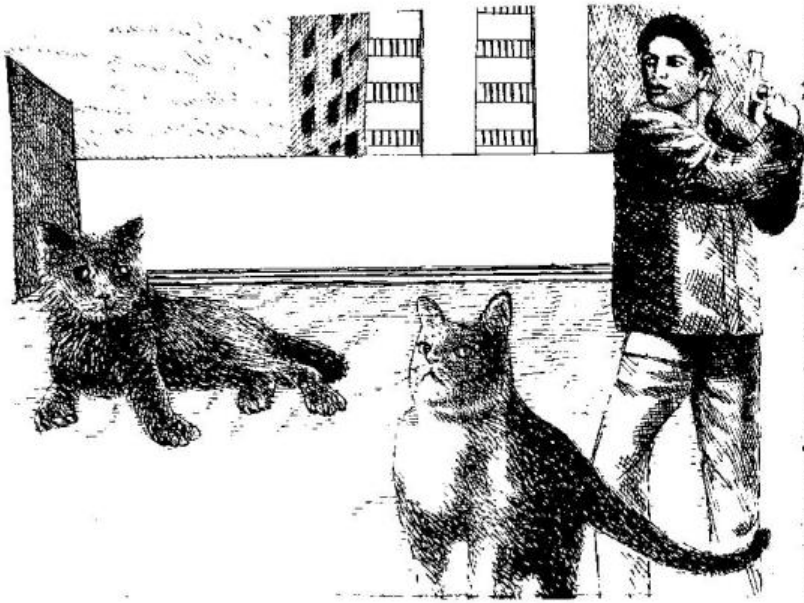
”وحشی نیزے لہراتے شور مچاتے جنگل میں راج کمار کی تلاش تلاش میں بھاگ نکلے دس ایک

دے رہے تھے اور اس کے قریب سے گزرے کسی نے اس پر شک نہ کیا وہ یہی سمجھے کہ جنگلی عورت راج کمار کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر عین موت کا ہار پہنا کر ایک ضروری رسم پوری کر کے واپس جا رہی ہے۔

راج کمار تھا لی اسے سر پر اٹھا رکھی تھی اور جنگلی عورت کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چلتی پھرہ دینے والے وحشیوں کے قریب سے گزری ایک ڈراسی غلطی ایکڈرا سا غلط قدم اسی وقت اس کی موت کی وجہ بن سکتا تھا چاروں طرف سے خنجر اندیزے اس کے جسم میں آ رہا ہو سکتے تھے لیکن راج کمار بہت حوصلے اور ہمت سے کام لے رہی تھی وہ ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتی تھی اور اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتی تھی ماں باپ کی محبت اور ان سے ملاقات کرنے کی شدید خواہش تھی اور اسی خواہش نے راج کمار کے جسم میں فلوادی طاقت بھر دی تھی وہ درختوں کے نیچے سے واپس جا رہی تھی کہ ایک وحشی نے اسے چھیڑا اور ہنسا جنگلی عورت یعنی راج کمار نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہنسنے ہوئے غوں غاں کیا اور بھاگ گئی وحشی ایک پل کے لئے بڑا حیران ہوا کہ اس عورت کو آج کیا ہو گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کبھی اس نے ایسی حرکت نہ کی تھی وہ جب بھی اسے چھیڑتا تھا وہ اس کے منہ پر ایک زبردست پھنر مار دیا کرتی تھی وحشی کا دماغ کچھ نہ سمجھ سکا اور اپنی راہ ہالیا راج کمار اب بڑے سردار کی جھوپڑی کے سامنے سے ہو کر گزرتی تھی جھوپڑی کے باہر دو وحشی تلواریں لئے پھرہ دے رہے تھے اندھیرے کی وجہ سے وہ راج کمار کو نہ پہچان سکے انہوں نے اسے جنگلی عورت ہی خیال کیا اور خاموش آگھوں سے جنگل میں عورتوں کی جھوپڑیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

راج کمار کی جھوپڑی سے نکل گئی آگے دوڑتوں کا گھٹنا جنگل شروع ہوتا تھا یہاں آ کر اس نے ایک طرف بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا بھاگتے بھاگتے ان چڑھ آ رہے درختوں میں سے دن کی روشنی چھن کر نکل میں آنے لگی راج کمار نے صرف کمر کے گرد کیلی

اگر ڈراسی بھی آواز نکل جاتی تو اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا تھا یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا اس جنگلی عورت راج کمار کے ہاتھوں کو اپنے ناخنوں سے نوچ رہی تھی لیکن راج کمار کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہونے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو رہی تھی راج کمار تو جیسے زیادہ خونخوار شیر بن گئی تھی جنگلی عورت کا گلابند ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں اور ایک منٹ کے اندر اندر اس کا دل بھی بند ہو گیا یہ سارا کام ڈیڑھ منٹ میں ہو گیا تھا کوئی آواز نہیں نکلی تھی کسی کوکانوں کان خبر نہیں ہوئی کبھی جھوپڑی کا دیا اسی طرح جل رہا تھا باہر اسی طرح وحشی پھرہ دے رہے تھے رات اسی طرح ڈھل رہی تھی ہر طرف ویسی ہی خاموشی تھی کسی کو معلوم تک نہ ہو سکا تھا کہ ان کے قبیلے کی ایک جنگلی عورت کم ہو گئی ہے اور اس کی لاش جھوپڑی کے اندر پڑی ہے اور راج کمار بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے راج کمار کی اسیم کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا اور بڑی کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا اب اس کی اسیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اس نے جلدی جلدی اپنے سارے کپڑے اتار کر کونے میں پھینک دیئے پھر جنگلی عورت کی لاش کے کمر کے گرد بندھی ہوئی کیلے کے پتے اتار کر اپنی کمر کے گرد باندھے اور اپنے گلے کا گلاب کا ہار اتار کر پھینک دیا جنگلی عورت کے گلے سے منگوں اور ہڈیوں کی مالا میں اتار کر اپنے گلے میں ڈالی۔ مٹی کے دیئے کے نیچے سے کالک نکال کر اپنے جسم اور چہرے پر زور زور سے مسلا جس سے راج کمار کا رنگ سیاہ ہو گیا سر کے بالوں کو بکھیر کر جنگلی عورت کے بالوں کی طرح بتایا۔ زمین پر سے مٹی اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالی کچھ بالوں میں ڈالی گویا بالکل میلی چٹلی کالی گلوٹی وحشی عورت بن گئی راج کمار کی اسیم کا اب سب سے آخری مرحلہ اور سب سے خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ اس نے قتال اٹھا کر سر پر رکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جھوپڑی سے باہر آ گئی چاروں پہرے داررات کے کم ہوتے اندھیرے میں باری باری پھرہ



## خونخوار بلی

ملک فرخ ندیم - لاہور

نوجوان اپنے بستر پر محو خواب تھا کہ اچانک کوئی وزنی چیز اس پر گر گئی اور جب نوجوان کی آنکھیں کھلیں تو مارے دہشت کے اس کی گھگھی بندھ گئی ایک خوفناک انگارہ برساتی بلی اس پر سوار تھی۔

خوف کے شکنجے میں جکڑی ہوئی عجیب و غریب اپنی نوعیت کی دلخراش کہانی

میں نے فرخ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور فرخ نے کہا: ”چلو بھئی باری باری اس کے اوپر پاؤں کر دیوار پر چڑھو۔ اور جلدی کرنا پھر ہم بھی اوپر گئے اور سارے مل کر یہ مہم سرانجام دیں گے۔“ سب سے پہلے احمد نے ایک پاؤں ہمارے پیچھے رکھا اور اور اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ کر اوپر چڑھا اور آسانی دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے بعد فرخ آگے بڑھا

کر سکوں لیکن مجھے آج ہی شام سمندر کے نیچے سانپوں کے ملک میں ضرور پہنچنا ہوگا وہاں ہمارے بادشاہ کا دربار لگ رہا ہے۔“

شریم نے کہا: ”مجھے راج کماری کے پاس پہنچا کر تم بے شک واپس چلے جانا، ناگو آ رہا ہے تم اس فولادی جال سے بڑی آسانی سے نکل جاؤ گے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکے گا بے شک آزالیہا۔ میں غائب ہوتا ہوں اور ہاں تم اس ظالم ناگو کو کچھ نہ کہنا اس کی خبر میں لوں گا۔“ اتنا کہہ کر آٹھوا غائب ہو گیا۔

شریم فولادی جال کی طرف بڑھا تو جال کے سخت تاروں نے اسے نہرو کا وہ بڑی آسانی سے جال میں سے دھوئیں کی لہری طرح نکل گیا اس میں اور دھوئیں میں یہ فرق تھا کہ دھواں نظر آ رہا تھا اور شریم نظر نہیں آتا تھا شریم غار کے باہر آ کر کڑا ہو گیا سامنے سے ناگو چلا آ رہا تھا وہ شریم کے قریب سے گزر گیا اور شریم کو نہ دیکھ سکا حالانکہ شریم اس کے راستے میں غار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ غائب ہو گیا ہے اگر ناگو۔ نہیں دیکھ سکا تو پھر کوئی بھی نہیں دیکھ سکا ناگو سیدھا غار کے اندر چلا گیا اس نے جاتے ہی دیکھا کہ کڑے کے جال کے دوسری جانب سے شریم غائب تھا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے بھاگ کر غار سے باہر آ گیا باہر بھی کوئی نہیں تھا۔ شریم قریب ہی کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا ناگو کے آگے پھینک دیا اور کہا۔

”ناگو یہ میں ہوں شریم اب تم اپنے انجام لئے تیار ہو جاؤ۔“ ناگو جلدی سے اس طرف دھینکے جہاں سے آواز آئی تھی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہاں اسے شریم اٹھ نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ وہاں شریم کھڑا تھا، شریم اس سے ہنس بڑا۔ ”مجھے برتہا راجاداب اڑ نہیں کر۔“ ناگو نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

(جاری ۱۴)

اڑو دھانے کہا۔ ”تمہارے پاس جو مہر ہے اسے اپنے جسم میں ل کر جیب میں رکھ لو تم اس جادوگر کی نظروں سے دوبارہ غائب ہو جاؤ گے اور یہ بھی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔“

شریم نے اسی وقت اس مہر کے اپنے سارے جسم پر گزر کر ملنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی شریم کو اپنے اندر بے پناہ طاقت کا احساس ہوا اسے ایسا لگا جیسے اس کی ساری کھوپڑی ہوئی طاقت واپس مل گئی ہے۔

اڑو دھانے کہا: ”میں تو تمہیں ہر حالت میں ہمیشہ دیکھ سکتا ہوں لیکن اب تمہیں ناگو نہیں دیکھ سکے گا۔“ شریم نے کہا۔

”کیا ناگو کا جادو اب مجھ پر اثر نہیں کرے گا۔“

”ہرگز نہیں شریم بھائی اس کا جادو اب تمہارے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا تم پھر سے وہی پہلے والے شریم بن گئے ہو۔ طاقت اور اس کی کونہ دکھائی دینے والا شریم۔ اگر یقین نہ ہو تو ابھی ناگو واپس آئے تو آزالیہا۔ اب میں تمہاری اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ شریم نے ناگن کے بارے میں پوچھا تو اڑو دھانے کہا۔

”کہا اسے ناگن کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی سمندر میں جہاز میں سفر کر رہی ہے اور یہ جہاز پرنگال کی طرف جا رہا ہے۔“ شریم نے راج کماری کے بارے میں دریافت کیا تو اڑو دھانے بولا۔

”میری آنکھیں تمہاری ہم سفر راج کماری کو اس وقت یہاں سے دور جنگل میں پریشانی کی حالت میں بھاگتے ہوئے دیکھ رہی ہیں خونخوار وحشی نیزہ لہراتے ہوئے اس کے پیچھے لگے رہے تاکہ اس کا سر کاٹ لیں۔“ شریم نے جلدی سے کہا۔

”کیا تم اسے بچانے میں میری مدد نہیں کرو گے۔“

”ضرور مدد کروں گا شریم بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے دوست ناگن کے بھائی کی کوئی مدد نہ

دہشت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہی جلی اس وقت میرے اوپر سوار تھی اور اس کا خونخوار چہرہ لال انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ یکدم جلی نے اپنا منہ کھولا اور اس کے لمبے لمبے دانت میرے چہرے کی طرف بڑھنے لگے۔ خوف کی شدت سے اس وقت میرا جسم حرکت کرنے لگ پڑا اور میں نے پوری قوت سے جلی کو سامنے کی طرف اچھال دیا۔



خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن اور دلوں پر سکتہ طاری کرتی اپنی مثال آپ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو طویل مدت تک اپنے شکنجے میں جکڑی رہے گی۔

ایک ایسی کہانی..... جو کہ پڑھنے والوں کو کسی کرٹ بھی چین سے نہ رہنے دے گی



عابدہ نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تو رانی نے کہا۔ ”آگے چلو کیوں دیکھ رہی ہو کم بخت آوارہ بدعاش ہیں۔“

پھر کچھ دن وہ لڑکے نظر نہ آئے تو رانی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان چھوٹی۔

ایک دن وہ اسکول کے لئے تیار ہوئی عابدہ کا انتظار کر رہی تھی اور عابدہ نہ آئی تو رانی نے بیگ اٹھایا اور عابدہ کے گھر چلی گئی۔

عابدہ کی امی سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں۔ ”عابدہ کو بخار ہے وہ آج اسکول نہیں جائے گی۔“

رانی عابدہ کے پاس گئی تو حقیقت میں عابدہ کو بخار تھا۔ رانی نے عابدہ سے کہا۔

”اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے اسکول سے واپس آتے ہی تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“

عابدہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ پھر رانی تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسکول کے لئے چل پڑی ابھی وہ اسکول سے تھوڑی دور تھی کہ وہ لڑکے پھر اسے سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مگر رانی سر جھکائے تیز تیز چلتی رہی۔ جب وہ قریب آئے تو ایک بولا۔

”واہ کیا مست جوانی ہے کبھی ہمیں بھی تو موقع دے دو۔“

رانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اسکول پہنچی۔ پورا دن وہ سوچتی رہی کاش وہ آج نہ آتی پھر چھٹی ہوئی تو وہ بیگ اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔

اور ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ اچانک دونوں لڑکے ایک درخت کے پاس کھڑے نظر آئے تو وہ جلدی جلدی آگے بڑھنے لگی کوشش کرنے لگی وہ کسی کو مدد کے لئے پکار بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ بہتی سے کافی دور تھی۔

اچانک لڑکوں نے اس کا راستہ روک لیا تو رانی نے کہا۔

”چھوڑ دو میرا راستہ مجھے جانے دو اگر مجھے ہاتھ لگایا تو میں گھر جا کر تباؤں کی بہت جاؤں میرے راستے سے۔“

رانی کی بات سن کر ایک لڑکا خف سے دوہرا ہوا گیا۔

”بے شرم زبان لڑا رہی ہے مجھ سے آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ رانی کو گھیرتا ہوا درختوں میں لے گیا دوسرا بھی اس کے ساتھ تھا رانی روتی رہی ہاتھ جوڑتی رہی خدا کا واسطہ دیتی رہی۔

رانی اور عابدہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں اکثر عابدہ رانی کے ساتھ مل کر اس کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، رانی کا باپ بھی بہت خوش تھا کیونکہ رانی عابدہ کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔

وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے مڈل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف مڈل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

”ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

”میری بیٹی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟“

تو رانی نے جواب دیا۔ ”ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔“ اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔

رانی اور عابدہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں اکثر عابدہ رانی کے ساتھ مل کر اس کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، رانی کا باپ بھی بہت خوش تھا کیونکہ رانی عابدہ کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔

وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے مڈل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف مڈل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

”ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

”میری بیٹی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟“

تو رانی نے جواب دیا۔ ”ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔“ اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔

## یہ وقت.....!

کبھی لوگ غلام ہو جاتے ہیں اور کبھی زمانہ کبھی حالات اور کبھی اپنا آپ ہی مگر میرے خیال میں سب سے غلام چیز وہ ہے جو گزرتے سے اپنا احساس تک نہ ہونے اُسے اور وہ ہے ”وقت“ یہ کبھی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ برے رنگ، برے لوگ، برا موسم سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے اور ہم وقت کی خوش گمانی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔

اور یہ وقت ہی ہے کہ جب برا ہو جاتا ہے تو اچھے رنگ، اچھے لوگ، اچھے موسم سب کچھ برا لگتا ہے۔ یہ وقت ایسا کرتا ہے کہ جن لوگوں کو مسکراہٹ کی عادت پڑی ہو انہی کی آنکھوں میں طنز دکھاتا ہے۔ جن سہاروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی لگن دلاتا ہے، ان ہی لوگوں کو ہم سے جھین لیتا ہے، اس وقت کی چالاک تو دیکھئے کہ دھیرے دھیرے دبے پاؤں گزر رہی جاتی ہے، پھر بھی ہم سب اس کی قدر کرتے ہیں اور اسے کتنا احساس سے اپنے قیمتی ہونے کا۔

کاش ہم وقت کو روک سکتے لیکن یہ میرے ہاتھوں میں دہی ریت کی طرح پھسلتا جا رہا ہے۔ یہ خالی جاتا تو ٹھیک تھا مگر اپنے ساتھ میرے سنہری خواب، میری آنکھوں کے روشن چراغ، میری دعاؤں کے سارے سیپ، میرے ستارے، میرے استعارے، میرے دوست، میرے مسکراتے رہنے کی ساری وجوہات اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ میں لمحہ لمحہ ان سب چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہوں، کبھی کبھی کسی کو روکتا ہوں تو کبھی کسی کو، لیکن میری بے بسی تو دیکھئے کہ میں ان سے کسی بھی چیز کو روک نہیں پارہا ہوں اور نہ ہی اس وقت کو۔

(ایس اقبال احمد - کراچی)

رانی نے کہا۔ ”عابدہ آج نہیں بلکہ کل میں ان لوگوں سے انتقام لے لوں گی میں ان کو چھینے نہیں دوں گی۔“ عابدہ کا سارا ڈر ختم ہو چکا تھا عابدہ اس کے پاس لپکتی ہوئی پھر کچھ دیر کے بعد عابدہ نے کہا۔

”رانی تم مجھے روزانہ بل سکتی ہو؟“  
تو رانی یوں۔ ”عابدہ کل کے بعد میں تمہیں کبھی نہیں آؤں گی کیونکہ کل میں ان دونوں کو انجام تک لے دوں گی۔“ پھر رانی نے کہا۔

”عابدہ اب تم گھر جاؤ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرنا جب تک میں ان سے بدلہ نہیں لے لیتی۔“  
کہہ کر رانی قبرستان کی طرف چل پڑی۔

قبرستان میں داخل ہونے کے بعد وہ ہوا میں چل ہو کر عابدہ ہو گئی تو عابدہ گھر کی طرف چل دی۔  
کی لی داستان سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا وہ گھر جا کر بیٹھ گئی۔

”کل رانی سے ضرور ملوں گی۔ اس سے ہر بات بتاؤں گی۔“

دوسرے دن دونوں لڑکے عارف اور حمید ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، حمید عارف کو گھر آیا تھا عارف وہی لڑکا تھا جو روزانہ رانی کو تنگ کیا کرتا تھا، اس کی اس حرکت میں حمید بھی برابر کا شریک رہتا تھا۔ عارف کی امی اندر آئیں اور چائے پینل کی تو عارف اور حمید نے اپنے اپنے کپ اٹھالے پھر حمید نے کہا۔

”آئی نئی مبارک ہو کل حمید کی شادی ہو رہی ہے بہت خوش ہوں عارف کی شادی پر خوب دھوم کا کروں گا۔“

وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے جب حمید نے لگا تو عارف نے کہا۔

”یار میں تجھے نہیں جانے دوں گا تو یہیں رک جاؤں گا۔“

تو حمید نے کہا۔ ”گھر والے پریشان ہوں گے اس وقت سے پہلے آ جاؤں گا۔“ مگر عارف نے اس

دینے رو رہی ہے عابدہ کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

آ کر خراسان نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون ہوں تم اور کیوں رو رہی ہو؟“

عابدہ کی آواز سن کر اس لڑکی نے اپنا سراو پر کواٹھا یا تو اسے دیکھ کر عابدہ وہل گئی کیونکہ وہ لڑکی کوئی اور نہ ہی عابدہ کی سہیلی رانی تھی اور جب رانی پر نظر پڑی تو مارے خوف کے عابدہ کی چیخ نکلی گئی۔

اس کا پورا جسم پیسے سے تر ہو چکا تھا۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا اور وہ بھاگنے لگی تو جھٹ سے رانی اس کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔

عابدہ نے کہا۔ ”پلیز رانی میرے قریب مت آؤ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔“

عابدہ اتنی ڈر گئی تھی کہ گزر کر اسے واسطے دینے لگی۔ تو رانی یوں۔

”عابدہ تم ڈرومت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ تم میری اچھی بہن اور ایک اچھی دوست تھی۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بس میری ایک بات سنو۔“

عابدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”رانی تم تو مر گئی ہو پھر یہاں کیسے۔“

عابدہ اب بھی ڈر رہی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا رانی نے کہا۔

”ہاں عابدہ تم ٹھیک کہتی ہو کہ میں مر گئی ہوں مگر مجھے چین نہیں مل رہا اس لئے کہ میری روح بھٹک رہی ہے۔“

عابدہ نے کہا۔ ”کیوں؟“

پھر رانی یوں۔ ”تم میری سب سے اچھی دوست ہو اس لئے تمہیں بتا رہی ہوں۔“ اور پھر رانی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب عابدہ کو بتا دیا۔

عابدہ اس کی بات سن کر کپکپاتے پھوٹ کر رونے لگی اور پھر یوں۔

”بتاؤ رانی میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔“ مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا انہوں نے زبردستی رانی کی عزت تار تار کر دی اور بعد میں اس کا گلا دبا کر اسے مار ڈالا۔

☆.....☆.....☆

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا، رانی کا باپ رحمت رانی کو ڈھونڈ کر کھٹک چکا تھا مگر رانی نہ ملی۔

دوسرے دن جنگل میں ایک آدمی لکڑیاں کاٹنے گیا تو اس نے دیکھا کہ رانی درختوں کے پاس مردہ پڑی ہے رانی کو دیکھ کر وہ آدمی خوف زدہ ہو گیا کیونکہ وہ بہت بری حالت میں تھی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔

وہ آدمی بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا اور گاؤں والوں کو بتایا تو رانی کا باپ پاگلوں کی طرح اس جگہ کی طرف دوڑ پڑا جہاں رانی مردہ پڑی تھی رانی کا باپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

”میری بیٹی تیرے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا۔۔۔۔۔۔“ گاؤں والے رانی کے باپ کو دلہا دے رہے تھے اور گاؤں والوں کو پتہ نہیں تھا کہ رانی کے ساتھ ایسا سلوک کون لوگوں نے کیا ہے اور پھر عابدہ نے اس خوبی واقعہ کے بعد اسکول جانا چھوڑ دیا وہ رانی کو یاد کر کے ہر وقت روتی رہتی تھی۔

پھر اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا تو ایک دن عابدہ کو رانی کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ عابدہ نے جلدی سے گھر کا کام ختم کیا اور اپنی امی سے اجازت لے کر قبرستان جانے لگی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی قبرستان تھا جہاں رانی کی قبر بھی اسی قبرستان میں تھی ابھی رانی قبر پر پہنچی نہیں تھی کہ قبرستان کے ساتھ ہی گھنے درختوں سے اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ آواز کسی لڑکی کی تھی جو دردمیری آواز سے آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔ عابدہ نے سوچا۔ ”کون ہو سکتا ہے چلو دیکھوں تو کسی کون ہے وہاں؟“

وہ آواز کی سمت بڑھنے لگی۔ اور پھر وہ اس جگہ جا پہنچی اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی گھٹنوں میں اپنا سر



## طوفانی رات

مریم قاطعہ - کراچی

اچانک بدروح نمودار ہوئی اور چشم زدن میں خوبرو حسینہ کو دبوج لیا کہ اتنے میں حسینہ کی زور دار آواز حلق سے نکلی کہ اتنے میں ایک انہونی ہوئی اور پھر.....

بدلے اور انتقام کی..... لرزہ بر اندام کرتی..... لہو بھوف کے لہا دے میں لپٹی کہانی

**وانگ** کہاں رہ گیا.....؟ جگمگانے لگے ہوئے اپنے دوستوں سے سوال کیا۔  
”ہاں پتا نہیں کہاں رہ گیا نکلہ.....“ ریشو بے زار لہجے میں کہا۔  
”اب رہے بھی دووانگ تمہاری طرح نہیں لگے وہ ایک اچھا اور ڈیفنس انسان ہے۔“ چٹاؤ ریشو کی طرف بڑی رنجی ہو۔  
”اب تم لوگ پھر سے نہ شروع ہو جانا“

بہمیشہ ریشو سے چٹتی تھی کیونکہ وہ ہر وقت اس سے فری ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اور ریشو پورے گروپ میں وہ واحد لڑکا تھا جس سے چٹاؤ بری طرح خار کھاتی تھی۔  
”چٹاؤ آخر میں نے کیا کیا ہے کیوں تم میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ ریشو ضدی لہجے میں بولا۔  
”اب تم لوگ پھر سے نہ شروع ہو جانا“

کی ایک نہ سنی اور جلدی سے کال کر کے اس کے گھر بتا دیا۔  
”حمید آج میرے پاس رہے گا۔“

اندھیرا کافی پھیل چکا تھا عارف کی امی نے آواز لگائی۔ ”آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔“  
تو دونوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ باتیں کرتے کرتے انہیں ٹانگ کا پتہ ہی نہ چلا۔  
رات کے بارہ بج چکے تھے اتنے میں اچانک تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی حمید نے کہا۔  
”ابھی تو موسم اچھا تھا اچانک یہ ہوائیں پھر بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ دونوں کانپ کر رہ گئے۔ ساتھ ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔  
کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔“

عارف بیٹا دروازہ کھولا۔ ”یہ اس کی امی کی آواز تھی وہ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھولا تو سامنے کوئی بھی نہ تھا۔  
اس نے دروازہ بند کیا اور حمید کی طرف دیکھا۔ ”حمید امی کی آواز نہیں سنا دی تھی کیا؟“ اس نے کہا۔  
”ہاں آواز تو میں نے بھی سنی ہے۔“  
ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تو اس بار دروازہ حمید نے کھولا مگر سامنے کوئی نہ تھا تو وہ دونوں گھبرا گئے جلدی سے کمرے سے نکلے اور امی کے کمرے میں پہنچے تو وہ سوچ گئی تھیں۔  
اچانک بجلی پھر کڑکی تو لائٹ بھی چلی گئی۔ وہ دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر عارف نے موبائل کی لائٹ سے دروازہ بند کیا۔  
جب دونوں بیڈ کے قریب آئے تو کوئی لڑکی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔  
عارف کی خوف کے مارے جان نکلی جاری تھی حمید بھی ڈر رہا تھا عارف نے آخر پوچھا۔  
”کون ہو تم.....؟“

”مج ان دونوں کی موت کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی عابدہ کو یاد آیا تو وہ قبرستان مٹی تو رال نے کہا۔  
”عابدہ میں نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ اب میں جاری ہوں۔“  
عابدہ نے کہا۔ ”پلیز ارانی مجھ سے ملتی رہنا“ مگر رانی نے کہا۔  
”اب یہ نہیں ہو سکتا۔“ اور رانی نے قبرستان کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے اور وہ قبرستان جا کر غائب ہو چکی تھی۔ عابدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے۔  
پھر عابدہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دی۔

دار Digest 188 April 2018



پلیز۔“ چنانے انہیں روکا۔  
 جنگو اپنے لاکر کے اندر دیکھ کر ایک دم خشکی۔  
 ”ارے یہ کیا ہے.....“ اندر سفید رنگ کا ایک  
 لٹافہ موجود تھا۔ اور لٹافے پر جنگو کا نام تھا۔  
 ”لٹافہ تو واٹنگ کی لگ رہی ہے۔“ اس نے  
 کہا اور لٹافہ کھول ڈالا۔ اندر سے ایک کارڈ برآمد ہوا  
 اس پر لکھا تھا۔  
 ”فاریسٹ پارٹی..... واٹنگ کی طرف  
 سے۔“ جنگو نے سب کو وہ کارڈ دکھایا۔  
 چٹاؤ نے بھی جلدی سے اپنا لاکر کھولا کہ شاید  
 اسے بھی ویسا ہی دعوت نامہ دیا گیا ہو۔ اس کے لاکر میں  
 بھی ایک ویسا ہی لٹافہ تھا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگی۔  
 ”واہ! بہت خوب بزدل دودو لڑکیوں کو ایک  
 سات ڈیٹ پر لے جا رہا ہے۔“ ریشو افسوس سے  
 ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔  
 ”بکواس بند کرو یہ کوئی ڈیٹ نہیں ہے۔“  
 چٹاؤ غصے سے بھاگتی چپاٹنے لگی اور اس نے بھی اپنا  
 لاکر کھولا تو توقع کے عین مطابق اس کے لاکر میں بھی  
 دعوت نامہ تھا۔  
 پھر ریشو نے غصے میں آ کر اپنا لاکر کھولا  
 اور خوشی سے چلا اٹھا.....  
 ”ہاں یہ ہوئی ناں بات یہ واقعی ڈیٹ نہیں  
 ہے..... اسے بھی دعوت نامہ ملا ہے۔“  
 اچانک واٹنگ ایک طرف سے نکل آیا۔  
 ”دوستو! کیسا گراسر پرائز۔“ اس نے پوچھا۔  
 ”تیرا تو جواب نہیں واٹنگ۔“ ریشو اسے گلے  
 لگاتے ہوئے بولا۔  
 یہ پانچوں دوست چٹین کے باشندے تھے  
 اور اس وقت اسکول سے چھٹی کا وقت تھا واٹنگ نے  
 جنگلات کی سیر کا پروگرام ترتیب دے دیا کل صبح انہیں  
 جنگل کی طرف روانہ ہونا تھا اور شام سے پہلے واپس  
 لوٹ آنا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح کے وقت وہ پانچوں اکٹھے ہوئے۔  
 اور وہ سب گاڑی سے سفر کر کے ایک مقام پر پہنچے  
 پھر اس کے بعد آگے کا سفر بیدل طے کرنا تھا۔  
 سردیوں کے دن تھے ہر طرف دھند چھائی  
 ہوئی تھی آسمان پر بھی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی موسم نے  
 تیز بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ انہوں نے سردی  
 سے بچاؤ کے لئے گرم کپڑے وغیرہ پہن رکھے تھے۔  
 ان لوگوں کو راستے کی بھی کچھ خبر نہ تھی بس ان کے پاس  
 ایک نقشہ تھا جس میں سے وہ راستہ تلاش کرتے آگے  
 بڑھ رہے تھے۔  
 ”میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔“ چٹاؤ نے  
 شکایت کی۔  
 ”اگر میرے بس میں ہوتا تو تمہیں گود میں  
 اٹھا کر یہ سفر طے کر دیتا۔“ ریشو نے ہمدردی سے  
 کہا۔  
 ”بکواس بند کرو سبھی..... میں تمہارا من  
 توڑ دوں گی۔“ چٹاؤ کو شدید غصہ آیا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ دیر آرام  
 کر لینا چاہئے۔“ چنانے رکتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔“ جنگو  
 نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے..... اگر تم لوگ بھی چاہتے ہو  
 ایسا ہی سہی۔“ واٹنگ نے کہا اور پھر وہ سب ایک جگہ  
 اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔  
 ”اف کتنی سردی ہے۔“ جنگو نے ہاتھ ملاتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”ایسا کرتے ہیں کہ کٹڑیاں اکٹھی کر لے  
 یہاں تھوڑی سی آگ جلا لیتے ہیں۔“ واٹنگ نے  
 مشورہ دیا۔  
 ”ہاں یہ صحیح رہے گا مجھے بھی بہت سردی کا  
 احساس ہو رہا ہے۔“ ریشو نے کہا اور پھر وہ اور واٹنگ  
 کٹڑیاں اکٹھی کرنے لگے۔  
 کٹڑیاں اکٹھی کر کے انہوں نے آگ جلا

اور سارے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ تیز سرد ہوا چل  
 پڑی تھی ان کے بال بری طرح ہوا سے اڑ رہے تھے۔  
 ”اب کس طرف جانا ہے۔“ چنانے آگ  
 تاپتے ہوئے پوچھا۔  
 ”زیادہ دور نہیں بس تھوڑی دور اس طرف۔“  
 واٹنگ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ شاید واید کا چکر چھوڑو اور پکی بات  
 بناؤ۔“ چنانے پھر کہا تو واٹنگ نے اثبات میں  
 سر ہلادیا۔  
 اور اپنے پاس سے نقشہ نکالا اور دیکھنے لگا۔  
 ”اس نقشے کے مطابق ہمیں مشرق کی طرف  
 جانا ہے۔“ واٹنگ نے اپنے سیدھی طرف اشارہ کیا۔  
 ”لیکن وہاں سے تو ہم آئے ہیں۔“ ریشو  
 نے حیرت و بے یقینی سے کہا اور نقشہ جھپٹ کر واٹنگ  
 کے ہاتھ سے لے لیا اور غور سے پڑھنے لگا۔  
 اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور نقشہ اس کے  
 ہاتھ سے چھوٹ کر سامنے طے آگ میں جا گرا اور پھر  
 نقشے کو چلتے میں دیر نہیں لگی اور یہ دیکھ کر ان پانچوں نے  
 شور مچادیا۔  
 ”کچھ کرو آگ بجھاؤ۔“ چٹاؤ گھبرا کر بولی۔  
 وہ سارے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ہاتھ  
 مار مار کر آگ کو بجھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہزار  
 کوشش کر ڈالیں مگر سب بے سود نقشہ لہجوں میں جل  
 کر رکھ کا ڈھیر بن گیا۔  
 ”اب کیا کریں نقشے کے بغیر ہم تو آگے نہیں  
 بڑھ سکتے.....“ واٹنگ نے ایک گہری سانس خارج  
 کرتے ہوئے کہا۔  
 ”سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے احمق  
 انسان۔“ جنگو نے ریشو کو گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”احق میں نہیں بلکہ احمق ہوا ہے..... بھلا اس  
 میں میرا کیا قصور ہے اگر نقشہ ہوا سے اڑ گیا تو۔“ ریشو  
 نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔  
 ”سارا پروگرام چوہٹ کر کے رکھ دیا تم نے

سیر کا۔ اب چلو واپس۔“ چٹاؤ منہ بسور کر بولی۔  
 پھر پانچوں دوست واپسی کے لئے مڑ گئے۔  
 ”ہم اس طرف سے آئے تھے..... ہے  
 نا.....؟“ ریشو نے پوچھا۔  
 ”نہیں ہم اس طرف سے آئے تھے۔“ واٹنگ  
 نے دوسری جانب اشارہ کیا اور پھر وہ پانچوں آپس  
 میں بحث کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔  
 اب ہوا پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھی۔ انہیں چلتے  
 چلتے خاصی دیر ہو گئی تھی مگر اب تک وہ جنگل سے  
 باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ آخر ایک جگہ  
 تھک کر وہ سارے رک گئے۔  
 ”دوستو! ہم کہاں آگے اس جگہ تو ہم پہلے  
 بھی آچکے ہیں۔“ جنگو نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، وہ چل  
 چل کر تھک چکی تھی۔  
 ”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم راستہ بھگ  
 چکے ہیں۔“ ریشو نے ڈرتے ہوئے کہا۔  
 ”ایسا مت کہو پلیز.....! میرا دل گھبراتا  
 ہے۔“ چٹاؤ نے کہا۔  
 ”اتنی جلدی ہارمت مانو دوستو! ایک  
 بار پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کر کے دیکھتے  
 ہیں۔“ واٹنگ نے ان کی ہمت بندھائی اور وہ سارے  
 ایک بار پھر چل پڑے۔  
 لیکن کافی دور چلتے کے بعد بھی وہ وہیں پہنچ  
 گئے جہاں سے چلنا شروع کیا تھا۔  
 ”کوئی فائدہ نہیں ہم بھگ چکے ہیں۔“ چنانے  
 نے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔  
 ”لیکن اب کیا کریں گے ہمارے پاس  
 تو کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔“ جنگو نے  
 گھبراہٹ سے لہجے میں کہا۔  
 ”تھوڑی دیر یہاں آرام کرتے ہیں اس کے  
 بعد پھر سے واپسی کا سفر شروع کریں گے۔“ واٹنگ  
 نے کہا۔ وہ سب تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گئے۔  
 جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا سردی بڑھتی

جاری تھی۔

”میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے ورنہ رات ہو جائے گی۔“ جیانے کہا تو وہ سب ایک بار پھر چل پڑے۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام سے رات ہو گئی سردی زیادہ بڑھ چکی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی اور موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی اور وہ بارش طوفان میں بدل گئی تیز ہوا سے پیڑ پری طرح مل رہے تھے۔ وہ لوگ پوری طرح پھنس چکے تھے اب وہ پانچوں بچھتا رہے تھے کہ وہ جنگل کی سیر کو کیوں آ گئے۔ وہ سب تیز بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے جمع ہو گئے مگر بارش کا بے تحاشہ پانی وہاں بھی ان کا بچھا نہیں چھوڑ رہا تھا وہ لوگ پوری طرح بھیک چکے تھے۔

اچانک دانگ کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”دوستو! دیکھو ہم لوگ بچ گئے۔“ اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب کیسے بچ گئے.....؟“ ریشو نے حیرت سے پوچھا اسے دانگ کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

”اس طرف دیکھو۔“ اس کے کہنے پر سب نے اس سمت دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا تو ان لوگوں کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اندھیرے میں دور سے ایک گھر نما عمارت نظر آ رہی تھی۔

”چلو وہاں چل کر بارش سے پناہ لیتے ہیں۔“ دانگ نے کہا اور وہ چاروں اس کے پیچھے چل دیے۔

نزدیک پہنچے ہی تھے کہ زور سے بجلی کڑکی۔ اس کی روشنی میں انہوں نے اس گھر کے پاس ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا جس پر ”ہوٹل“ تحریر تھا۔

”ارے اس دیرانے میں بھلا کون ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔“ جیانے حیرت سے پوچھا۔

”اس کو چھوڑو اور اندر چلو۔“ ریشو نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

ہوٹل بہت خستہ حالت میں تھا دانگ نے دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا مجبوراً اس نے دروازہ زور سے پیٹا تو ذرا سی دیر میں دروازہ چرکی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ تو سب نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو گہرے سبز رنگ کے کپڑوں میں ملیں تھی۔

”کیا ہم اندر آ سکتے ہیں.....؟“ دانگ نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بالکل، بچو! اندر آ جاؤ۔“ اس بوڑھی عورت نے ہمدردی سے کہا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ پانچوں آگے پیچھے ہو کر اندر داخل ہوئے اندر آ کے انہیں سردی کا احساس کچھ کم ہوا لیکن پھر بھی وہ بارش میں بھیکے ہوئے تھے اس لئے جسم پر کچی طاری تھی۔

”تم لوگ اتنے طوفان میں باہر کیا کر رہے تھے ایسے موسم میں تو کوئی بھی اس جنگل کا رخ نہیں کرتا۔“ بوڑھی عورت نے پوچھا۔

”آئی ہم دراصل راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ جیانے سردی سے کانپتے ہوئے بتایا۔

”چلو کوئی بات نہیں اب تم لوگ یہاں آ گئے ہو جب تک طوفان ختم نہیں جاتا تم لوگ یہاں رہ سکتے ہو۔“ بوڑھی نے کہا۔

”آئی کیا لائٹ گئی ہوئی ہے۔“ چتاؤ نے ہوٹل میں موم بتیاں جلتے دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں بیٹا یہ تو جنگلات ہیں یہاں بجلی جیسی کوئی چیز نہیں..... یہ ہوٹل یہاں سیاحت کے لئے آئے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے تم سے پہلے بھی کئی بار یہاں کوئی بھولے بھٹکے مسافر آ چکے ہیں مجھے اچھی

طرح یاد ہے وہ دونوں میاں بیوی تھے۔“ بوڑھی عورت نے بتایا۔

”تم لوگ اپنے کپڑے تبدیل کر لو پوری طرح بھیک چکے ہو۔ میں تمہیں اپنے پاس سے دوسرے کپڑے لاکر دیتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے نرمی سے کہا۔

ان پانچوں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ کیلے کپڑوں میں واقعی انہیں بہت غنڈ لگ رہی تھی۔ عورت کی اور ان سب کے پہننے کے لئے خشک کپڑے لے آئی ان سب نے غسل خانے میں کپڑے تبدیل کئے اور ایک کمرے میں جمع ہو گئے یہ غالباً دانگ روم تھا وہاں بیچ میں کڑی کی ایک میز اور اس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں وہ پانچوں آرام سے بیٹھ گئے باہر سے منسل تیز بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔

اچانک تیز ہوا سے کڑی کھل گئی بوڑھی عورت نے جلدی سے کڑی بند کی۔

”یہ طوفان تو کسی کی جان لے کر رہے گا۔“ بوڑھی عورت بڑبڑائی۔

”آئی آپ کا نام کیا ہے.....“ جیانے پوچھا۔

”میرا نام منکھیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تم لوگوں کو بھوک لگی ہوگی..... میں تم لوگوں کے کھانے کے لئے کچھ لے کر آتی ہوں۔“ منکھیا نے کہا۔

”بالکل آئی جلدی سے کچھ کھانے کو دیجیے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے۔“

”ویسے اس وقت کیا وقت ہو رہا ہے۔“ ریشو نے کہا تو منکھیا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔

”اس وقت رات کے دس بجے ہیں پھر وہ کچن کی طرف چل دی۔

پچھلے یہ لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔“

میرے گھر والے میرے لئے بے حد پریشان ہوں

کے میں نے ان سے کہا تھا کہ میں شام سے پہلے لوٹ آؤں گی۔“ جنگو انکر مندنی سے بولی۔

”ویسے آئی منکھیا ہم پر بے حد مہربان ہیں۔“ دانگ نے کہا۔

ابھی یہ لوگ مزید کوئی بات کرتے کہ منکھیا ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے چلی آئی کھانے میں گرم چکن کارن سوپ تھوڑی سی سبزی اور نوڈلز تھے اتنا شاندار کھانا دیکھ کر سب کی بھوک جاگ اٹھی منکھیا نے کھانا ان کے سامنے میز پر رکھ دیا وہ سب مزے لے کر کھانے لگے۔

”آئی یہ طوفان ویسے کب تک ختم جائے گا۔“ چتاؤ نے پوچھا۔

”بیٹا یہ جنگل کا طوفان اور بارش اتنی آسانی سے نہیں سمجھتا۔ بعض اوقات کچھ دن بھی لگ جاتے ہیں۔“ منکھیا نے بتایا۔

”ارے نہیں جب تک کیا ہم یہاں پھنسے رہیں گے۔“ ریشو سوچتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔“ دانگ نے تسلی دی۔

”کھانا واقعی بہت لذیذ ہے۔“ جیانے کھانے کی تعریف کی۔

”شکریہ.....“ منکھیا نے کہا۔

جب وہ لوگ کھانا کھا چکے تو منکھیا نے برتن سمیٹ لئے ریشو نے اپنا چھوٹا سا بیگ جو کہ وہ کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا نکالا اور اس میں سے شراب کی بوتلیں نکالیں۔

”سر پرانز یہ میں نے تم لوگوں کے لئے چھپا کر رکھی تھیں۔“

”بڑے کینے ہو میں خبر تک ہونے دی۔“ چتاؤ بولی۔

”آئی آپ بھی پیئیں گی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں شکر یہ میں نہیں پییتی.....“ اور پھر پارٹی شروع ہو گئی..... وہ لوگ ایک گلاس کے بعد ایک پے

جار ہے تھے جب ہی جیائے انہیں روک دیا۔  
 ”بس کرو دوستو..... ہم اس وقت کسی نائٹ  
 کلب میں نہیں بلکہ ایک ہوٹل میں ہیں۔“ وہ بولی  
 اور اس نے شراب کی بوتلیں ان کے سامنے سے  
 ہٹائیں۔  
 ”تم لوگ ضرور تھک گئے ہو گے میں تمہیں  
 تمہارے کمرے دکھا دیتی ہوں تاکہ تم لوگ آرام  
 کر سکو۔“ منکھیا نے کہا اور انہیں ساتھ لے کر باری  
 باری ان کے کمروں تک چھوڑ دیا۔  
 رات کے بارہ بج چکے تھے مگر ان میں سے کوئی  
 بھی ابھی تک نہیں سو سکا تھا جیسا بھی اپنے کمرے میں  
 اکیلی بے چین ہو رہی تھی اس نے کبل ایک طرف ہٹایا  
 اور بستر سے باہر نکل آئی کمرے میں ہلکی ہلکی موسیقی کی  
 روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو باہر  
 ابھی تک موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اس نے جلدی  
 سے کھڑکی دوبارہ بند کی اور چھتاؤ کے کمرے کی طرف  
 چل دی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔  
 ”کھلا ہے آ جاؤ۔“ اندر سے چھتاؤ کی آواز  
 زسائی دی جیائے دروازہ آہستہ سے کھولا اور اندر چلی  
 آئی۔  
 ”مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو سوچا کہ تمہارے  
 پاس چلی آؤں۔“  
 ”ہاں مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔“ چھتاؤ نے  
 تھکے تھکے انداز میں کہا۔  
 ”سوچتی ہوں یہ طوفان آخر کب ختم ہو گا۔“ جیا  
 نے بجلی کے کڑکنے کی آواز پر کہا۔  
 ”جیسا تم نے ہوا کا یہ شور سنا.....“ چھتاؤ نے  
 پوچھا۔  
 ”ہاں ظاہر ہے۔“ جیائے جواب دیا۔  
 ”یہ شور آنے والے طوفان اور ہونے والی  
 کسی انہولی کا پتا دے رہا ہے۔“ چھتاؤ نے سہمے  
 ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”کیوں گھبرا رہی ہو کچھ نہیں ہو گا۔“ جیائے

تسلی دی۔  
 ”جیائے تمہیں اس بھیا تک رات اور گئے جنگل  
 سے خوف محسوس نہیں ہو رہا.....؟“ چھتاؤ نے  
 پھر پوچھا۔  
 ”ہاں..... ایسی جگہ اور موسم سے ڈرنا تو فطری  
 چیز ہے۔“ جیائے ایک گہری سانس خارج کرتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”اچھا اب میں چلتی ہوں تم بھی سونے کی  
 کوشش کرو۔“ جیائے کہا اور اٹھ کر باہر آ گئی۔  
 رات کا نامعلوم کون سا پہر تھا جب جیائی  
 آنکھ کسی کے چہنچہ کی آواز سے کھل گئی وہ گھبرا کر اٹھی  
 اور بیروں میں چہل اڑتی کمرے سے باہر نکلی۔ باہر  
 آئی تو دیکھا کہ ریٹھ، واٹنگ اور جگسوا بھی اپنے  
 کمروں سے نکل رہے ہیں۔  
 ”کیا ہوا یہ آواز کیسی تھی.....؟“ جگسوا نے  
 نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔  
 ”آواز چھتاؤ کے کمرے سے آئی تھی  
 کہیں وہ مشکل میں نہ ہو۔“ ریٹھ نے گھبرا کر کہا،  
 جلدی سے آگے بڑھ کر چھتاؤ کے کمرے کا دروازہ  
 کھول دیا باقی سب بھی وہیں اکٹھے ہو چکے تھے اندر کا  
 منظر بالکل نارمل لگ رہا تھا چھتاؤ بستر پر سونے لے  
 انداز میں لیٹی تھی۔  
 ”چھتاؤ کیا تم ٹھیک ہو.....؟“ واٹنگ نے  
 پوچھا۔  
 لیکن چھتاؤ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سب  
 اندر چلے آئے جگسوا نے اس کے نزدیک جا کر دیکھا  
 تو چیخ پڑی۔ چھتاؤ کے گلے میں بستر کی چادر بندھی  
 ہوئی تھی جیسے کسی نے اس کا دم گھونٹنے کی کوشش کی  
 ہو۔ واٹنگ نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کے گلے  
 سے چادر کھولی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔  
 ”یہ سب کس نے کیا.....؟“ ریٹھ نے  
 گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”جیائے اور جگسوا ایک دوسرے کے ساتھ کئی

لکڑی تھیں۔  
 ”ہونہ ہو ضرور کوئی ہوٹل میں گھس آیا ہے ہمیں  
 پہل کر منکھیا کو خبردار کرنا ہوگا.....“ واٹنگ نے کہا  
 پھر وہ سارے منکھیا کے پاس پہنچے وہ اس وقت کچن  
 میں ہی ایک طرف زمین پر بستر لگائے سو رہی تھی جیا  
 نے اسے اٹھایا اور ہوٹل میں پیش آنے والے حادثے  
 کے بارے میں بتایا۔  
 منکھیا یہ سن کر بہت پریشان ہوئی اس نے ان  
 سب کو ساتھ لیا اور موسم بٹی کی روشنی میں پوار ہوٹل  
 مکان مارا لیکن وہاں ان پانچوں اور چھتاؤ کی ڈیڈ  
 آؤ کی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ سب بے حد پریشان  
 اور اداس تھے سب کی نیند اڑ چکی تھی۔  
 باہر بارش میں بھی کوئی کی نہیں آئی تھی اور جیسے  
 جیسے رات گہری ہو رہی تھی سردی بھی بڑھتی جا رہی  
 تھی۔ منکھیا نے مشورہ دیا کہ وہ سب واپس اپنے  
 کمروں میں جا کر آرام کریں صبح دیکھی جائے گی کہ کیا  
 گمراہ ہے۔ ان چاروں نے اس کی بات مان لی  
 اور واپس اپنے کمروں میں آرام کرنے کی نیت سے  
 چلے گئے۔  
 رات کے ڈھائی بجے جیائے پینے کمرے سے  
 نکل کر اس کا رخ کچن کی طرف تھا تب ہی اس کی نظر  
 ریٹھ پر پڑی وہ جگسوا کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔  
 اس نے کوئی توجہ نہ دی اور پانی پی کر دوبارہ اپنے  
 کمرے میں آ گئی۔ توڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ جگسوا  
 کے کمرے سے اس کے چہنچہ کی آواز سنائی دی۔ وہ  
 مارے اس کے کمرے کے باہر صبح ہو گئے۔ منکھیا بھی  
 گ رہی تھی وہ بھی موقع پر پہنچ گئی۔  
 واٹنگ نے ہمت کر کے دروازہ کھول ڈالا  
 اسے فرش پر جگسوا آڑی ترجمی لیٹی ہوئی تھی اس کے  
 پٹے میں خنجر پیوست تھا۔  
 جیائے حلق سے ایک لہجہ لاش چیخ برآمد ہوئی۔ ریٹھ  
 ہر تمام کے فرش پر بیٹھ گیا جیائے روٹا شروع کر دیا۔  
 ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے ریٹھ.....“

میں نے آج اس واقعہ سے پہلے تمہیں جگسوا کے کمرے  
 سے نکلنے دیکھا تھا اور آج نقشہ بھی تمہاری وجہ سے آگ  
 میں جلا تھا ضرور تم نے جان بوجھ کر وہ نقشہ آگ میں  
 پھینکا ہوگا تاکہ ہم یہاں بھٹک جائیں تو تم ہمیں ایک  
 ایک کمرے مار سکو۔“ جیائے روتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا بکواس کر رہی ہو۔ بھلا میں ایسا کیوں  
 کروں گا۔“  
 ”یہ مجھے نہیں پتا۔“ جیا چیخی..... جیا کی بات  
 سن کر واٹنگ بھی چکر میں پڑ گیا تھا۔  
 ”ٹھیک ہے اگر تم نے یہ سب نہیں کیا اور تم  
 واقعی ہمارے دوست ہو تو ہماری بھی ایک شرط ہے  
 ہم آج رات تمہیں تمہارے کمرے میں بند کر دیں  
 گے اگر تم بے قصور ہو تو اس کام میں ہمارا ساتھ دو ورنہ  
 دوسری صورت میں ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ سب تمہارا کیا  
 دھرا ہے۔“ واٹنگ نے بات سنہاتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو میری دوستی کا  
 ثبوت چاہئے تو ایسے ہی سہی۔“ اور پھر واٹنگ نے  
 اسے اس کے کمرے میں بند کر دیا۔  
 پھر واٹنگ اور جیا ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھ  
 گئے تب ہی منکھیا ان کے پاس آئی اور بولی۔ ”میں  
 چاہتی ہوں کہ صبح سویرے ہی تم لوگ میرے ہوٹل  
 سے چلے جاؤ..... جب سے تم لوگ یہاں آئے ہو کچھ  
 نہ کچھ برا ہو رہا ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے ہم صبح سورج کی پہلی کرن نکلنے  
 ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ واٹنگ نے  
 جواب دیا۔  
 منکھیا وہاں سے چلی گئی توڑی دیر میں جیا  
 اور واٹنگ کو ریٹھ کے کمرے سے ہاتھ پائی اور محنت  
 کرنے کی سی آوازیں سنائی دیئے لیکن ان دونوں نے  
 ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھ  
 کر ریٹھ کے کمرے کی طرف آئے واٹنگ نے ایک  
 جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا سامنے ریٹھ کی لاش  
 فرش پر پڑی تھی اس کی گردن پر کسی نے چھری پھیر دی



تھی جیا اور واگ ایک دوسرے کی شکلیں دکھ رہے تھے دروازہ باہر سے بند تھا پھر اسے کس نے مارا اور میں نے اسے بند کرنے سے پہلے کمرے کو اچھی طرح چیک بھی کیا تھا۔ یہاں کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا پھر یہ کیسے ہو گیا؟ کس نے کیا۔“ واگ نے کہا۔

”میں بتاتی ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا۔“

”چچے سے منکھیا کی آواز سنائی دی تو ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اچانک منکھیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھری واگ کے پیٹ میں گھونپ دی واگ زمین بوس ہوتا چلا گیا جیانے ایک ڈری ڈری چیخ ماری اور اپنی جگہ سے گر پڑی۔

”جانتی ہو میں نے ایسا کیوں کیا آج سے تیس سال پہلے تمہاری ماں اور میں کچی سہیلیاں تھیں ہم دونوں ان ہی جنگلات کی سیر کرنے آئے تھے۔ راستے میں طوفان آ گیا تمہاری ماں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور خود یہاں سے چلتی بنی میں طوفان اور اس کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے آخر اپنی جان گنوا بیٹھی اور تب سے میری آتما اسی جنگل میں بھٹک رہی ہے آج جب میں نے تمہیں یہاں بھٹکتے دیکھا تو مجھے لگا کہ بدلہ لینے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے یہ ہوکل جو تم دیکھ رہی ہو اب بالکل ویران ہو چکا ہے اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ میں نے ہی تمہارے دوستوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا ہے ایسے تمہیں بھی جان سے مار ڈالوں گی۔“ منکھیا نے کہا۔

جیا اپنی ساری ہمت جمع کر کے اٹھی اور اوپر میڑھیوں کی طرف بھاگی اور پہنچ کر سیدھے ہاتھ پر ایک کمرہ تھا کچھ سمجھ نہیں آیا تو وہ اندر چلی گئی اور اپنے بچاؤ کے لئے کچھ ڈھونڈنے لگی لیکن کچھ نہ ملا وہ پریشان ہو گئی تب ہی اسے میڑھیوں پر منکھیا کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مجبوراً اسے ایک ہی حل سمجھ آیا کہ کھڑکی سے باہر کود کر اپنی جان بچالے ورنہ وہ بوڑھی آتما اس کے بانی ساتھیوں کی طرح اسے بھی مار دے گی وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کھڑکی

کی چوٹ پڑ کے لٹک گئی اس نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو اسے چکر سا آ گیا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیچے کودے یا نہیں کہ منکھیا سر پر پہنچ گئی اسے دیکھ کر جیانے ایک چیخ ماری منکھیا نے چھری اس کے سیدھے ہاتھ پر ماری تو اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بائیں ہاتھ سے چوٹ پڑ کے لٹکی رہی۔ منکھیا نے اس کے بائیں ہاتھ پر چھری پھیرنی چاہی تو مجبوراً اس نے بائیں ہاتھ بھی ہٹا دیا اور نیچے جا کر گرنے کی وجہ سے اسے تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔

وہ بارش کے پانی میں پوری طرح بھیگ چکی تھی وہ ہمت کر کے اٹھنے لگی جب ہی نامعلوم کہاں سے منکھیا آن پہنچی اور اس کے پیٹ میں ایک زبردست لات ماری جیا بری طرح کراہ کر رہ گئی پھر منکھیا نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو تین اپنی طرف کیا اور ہاتھ میں پکڑا خنجر پوری قوت سے منکھیا کے سینے میں اتار دیا۔ منکھیا زمین بوس ہو گئی۔ اس کی روح کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ واگ تھکے تھکے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا۔

”واگ تم زندہ ہو۔“ جیا خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”واگ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ جیانے اس گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

صبح تک امدادی نہیں وہاں پہنچ سکیں جیا اور واگ زندہ بچ کر نکل آئے تھے وہ ہوکل آج بھی اس جنگل میں موجود ہے لیکن اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔

جیا اور واگ نے تین سال بعد آپس میں شادی کر لی، آج بھی جنگل میں گزارا کرتی ہیں وہ طوفانی رات یاد کر کے ان دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔



## قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

جو ہو سکے تو میری روح میں سا جاؤ  
دل و نگاہ کے رشتے تو ٹوٹ جاتے ہیں  
(امیس حبیب خان.....کراچی)

اس جہاں میں کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ  
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ  
(انتخاب: سمیرہ عباس.....حیدرآباد)

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لیوں تک آئی ہے  
یونہی چمن سے بول اٹھتا تو شیشے کا دستور نہیں  
(انتخاب: حافظ عابد علی.....کراچی)

تہائیوں کا درد لئے میرے دل کے ساتھ  
شب بھر تیرے خیال میں جلتی ہے زندگی  
(انتخاب: ارشد خان.....کراچی)

روز نہ سہی کسی دن یاد کر لینا  
کبھی نیند نہ آئے تو ہمیں بھی چکا لینا  
کبھی بھی کچھ بھی کہنا ہو بلا جھجھک کہنا  
اگر کچھ دینا چاہو تو ہمیں اپنے غم دینا  
(شرف الدین جیلانی.....نٹوال دیار)

عشق سے کہہ دو ابھی بات نہ کرے  
اس نگاہ کو ابھی جاننے کی عادت نہیں ہے  
عشق سے کہہ دو ابھی خواب نہ دے  
ابھی ستاروں پہ چلنے کی ہمت نہیں ہے  
(محمد بلال نصیر.....کراچی)

چری یاد نے ستایا دل ملنے پر آیا  
ہاں برسے یوں جیسے سادون جھڑی لایا  
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد.....ننگا نہ صاحب)

اگا سب تن کھائیوں اور جن چن کھائیوں ماس  
نیٹیاں مت کھائیوں جنہیں پیا ملن کی آس  
(انتخاب: شمس الحسن شمس.....ننگا نہ صاحب)

کبھی نہ ہاتھوں سے ہاتھ چھوئے خیال رکھنا  
کبھی نہ چاہت کا مان ٹوٹے خیال رکھنا  
جو ہو محبت تو رنجشوں سے گریز کرنا  
کسی کا نازک سا دل نہ ٹوٹے خیال رکھنا  
(شہر یار رفیق.....کچھرو مندرہ سے)

ہم برسے کیا تھے کہ اک صدق کو سمجھتے تھے  
وہ بھی اچھے تھے کہ بس یار کہا وار کیا  
(مہر پرویز احمد دولو.....میاں چنوں)

رات گئے تک کھائل نئے کرتے ہیں اعلان یہاں  
یہ دنیا ہے سنگ دلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں  
پیار بھیک میں بھی مانگو تو کوئی پیار نہ ڈالے جموں میں  
بن مانگے مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں  
(محمد حنیف شاہ.....بھاگدوالی، ننگا نہ صاحب)

کیا لکھوں دل کی حقیقت آرزو بے ہوش ہے  
خط پر آنسو گر رہے ہیں مگر قلم خاموش ہے  
(انتخاب: عبدالحمید عرف پو.....دیپالپور)

میرے زخموں کا علاج کچھ اس طرح کیا اس نے اے موت  
مرہم بھی لگائی تو خنجر کی نوک سے  
(خضر حیات.....روڈہ نعل، خوشاب)

میں دیکھاں میرا رند دیکھے میں نہ دیکھاں تے اوہ دیکھے  
پوسے یار دے مرے، اوہ دیکھے نہ یا نہ دیکھے  
(محمد انیسال.....روڈہ نعل، خوشاب)

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں  
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو  
(محمد سلیم.....بھیر سوڈیاں)

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے  
ہمیں پھر بھی گمان ہے وہ ہمیں پیار کرتا ہے  
(ساجدہ بیٹا خانے ڈی.....کھڑیاں خاص)

چھروں سے دوستی کا یہ صلہ کم تو نہیں  
اک شکستہ آئینہ جوڑتا رہتا ہوں میں  
(اسحاق انجم.....نگن پور)

وہ فحش چھڑتا ہے تو برسوں نہیں ملتا  
ملا ہے پھر ٹوٹ کے ملا بھی بہت ہے  
(محمد کمال.....روڈہ نعل، خوشاب)

☆☆



تجھ سے سب کچھ کہہ کے بھی کچھ ان کی رہ جائے گی  
مفتگو اتنی بڑے کی کچھ کی رہ جائے گی  
اپنے لفظوں کے سبھی تجھے دینے کے بعد  
آخری سوغات میری خامشی رہ جائے گی  
کشتیاں مضبوط سب بہہ جائیں گی سیلاب میں  
کاغذی اک ناؤ میری ذات کی رہ جائے گی  
حرص کے طوفان میں ڈھے جائیں گے سارے محل  
شہر میں درویش کی اک جھوپڑی رہ جائے گی  
رات بھر جلتا رہا ہوں میں سہیل اس آس میں  
میں تو مجھ جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی  
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

آکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے  
تیری بے وفائی سے ہم پریشان نہیں ہوتے  
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح  
گزرے ہوئے لمحے پھر مہریاں نہیں ہوتے  
تیری دید میں کتنی دُغم پائے ہیں  
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے  
بدلی ہے آسمان نے نگاہ ہم سے آج  
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے  
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر  
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیان نہیں ہوتے  
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید  
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

رضائے خالق برحق بدل نہیں سکتے  
جو حادثات مقدر ہیں نل نہیں سکتے  
بہت سے لوگ ہیں کوشاں مگر یہ کون کہے

چراغ تیز ہواؤں میں جل نہیں سکتے  
گزار زندگی اب قبر میں اسیر ہوں  
یہ وہ بھنور ہے کہ جس سے نکل نہیں سکتے  
جہاں تعریف شر ہو وہاں زمینوں سے  
بجی بھی خیر کے چشمے ابل نہیں سکتے  
ڈھلے بغیر نہیں ہے کوئی سہیل مگر  
زمانے ہم تیرے سانچے میں ڈھل نہیں سکتے  
رواں دواں ہے زمانہ انہیں کھینچنے کو  
گریں جو راہ سفر میں سنبھل نہیں سکتے  
کچھ میں آیا نہ واجد نظم بارغ جہاں  
شجر کچھ ایسے یہاں ہیں جو کھل نہیں سکتے  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد بگتنوی.....کراچی)

بارش کی تیز بوندوں نے جب دستک دی دروازے پر  
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا  
ہوا کے ہلکے جھونکے کی جب آہٹ ہوئی کھڑکی پر  
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا  
میں تھا چلا جب بارش میں اک جھونکے نے میرا ساتھ دیا  
میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے احساس تمہارے جیسا تھا  
پھر رک گئی وہ بارش بھی رہی باقی نہ آہٹ بھی  
میں سمجھا مجھے تم چھوڑ گئے انداز تمہارے جیسا تھا  
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہار)

رم	جسم	کرتی	بادل	آنکھیں
ترے	پیار	میں	پاگل	آنکھیں
کہے	کے	پہننے	دیکھیں	
روٹی	روٹی	کاہل	آنکھیں	
کس	نے	آخر	روگ	اکا
کیوں	ہیں	تیری	جل	آنکھیں
تیری	یاد	میں	جاگ	ہیں
میری	بوجھل	بوجھل	آنکھیں	
مجھ	کو	فلک	یاد	اب
اس	کی	قائل	قائل	آنکھیں

(فلک زاہد.....لاہور)

پورا ہو جائے وہ کام کیا  
آدھا رہ جائے وہ انتقام کیا  
کام نہ آئے وہ پڑھنا کیا  
اس میں منزل نہ ہو وہ آگے بڑھنا کیا  
راہ سے ہٹک جائے وہ راہی کیا  
اس میں ہمت نہ ہو وہ سپاہی کیا  
چھوڑ جائے وہ سہارا کیا  
بچھپ جائے وہ بنانا کیا  
پورا ہو جائے وہ خواب سہانا کیا  
دے اس فانی دنیا کو اے الماس  
ہمت نہ دے وہ حوصلہ کیا  
(الماس خویہ.....لاہور)

کرتے رہے ہم پہ ستم کرنے کی تمنا  
کرتے رہے ان پہ سدا مرنے کی تمنا  
دل نے خود کشی کو ڈبونے کی ہے تمنا  
تی کو ہے موجوں پہ ابھرنے کی تمنا  
ازہ تیرے شانوں پہ زلفوں کی گھٹائیں  
میرے ہاتھ سے ان کو بھی سنورے کی تمنا  
میں کی تمنا ہے کہ میں نوج لوں اس کو  
کی ہے کچھ روز نکھرنے کی تمنا!!  
سر کبھی اونچوں کو دکھاتا رہا نیچا  
سر کو ہے اب جاں سے گزرنے کی تمنا  
دل کی محبت کی قسم کھائے نہ بدلے  
کام ہے دل کو مرنے کی تمنا  
یہ الگ بات کہ خود گل ہی اڑا دے  
کب کرتی ہے نکھرنے کی تمنا!  
(محمد حنیف شاکر.....بھاگوالی ننگا نہ صاحب)

کی سمت نظر جائے تو کیا ہوتا ہے  
کسی کی یاد میں گزر جائے تو کیا ہوتا ہے  
معلوم ادا سے وہ مجھ سے پوچھتا ہے یارو  
کوئی دل میں اتر جائے تو کیا ہوتا ہے

اے میرے مولا ذرا سا تو بتا دے اس کو  
آدمی جیتے جی مرجائے تو کیا ہوتا ہے  
کوئی انجان سے محض کا پھر کسی پچھلے پھر  
عکس آنکھوں میں ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے  
درد دے کر وہ مجھے ہنستا رہا اور بولا  
درد جب حد سے بڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے  
عشق میں جان چلی جاتی ہے چلی جائے گی  
اس راہ گزر کا تو آصف شہزاد یہی انجام ہوتا ہے  
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی.....قصور)

ہر وقت تیری ہی باتیں، تیرا ہی ذکر کرتا  
اب کام ہمارا ہے تیری ہی فکر کرتا  
کبھی تو تم ہم غریبوں کی صدا سنا کرو  
کس جرم کی سزا ہے اتنا تو بتا دو  
مانا کہ ہوئی خطا، جو چاہا تجھے خود سے زیادہ  
اقرار جرم کر لیا ہے، درگزر ہماری خطا کرو  
یہی سوچ رہے ہیں ہم آفرین  
کریں مفتگو کی کہاں سے ابتدا  
کوئی گستاخی نہ ہو جائے کرنے میں الفاظ ادا  
وہ ہمرا اور ہم کوئلہ ہیں وہ کہاں اور ہم کہاں!  
کریں ہم مفتگو ساتھ ان کے آفرین  
ہماری اتنی اوقات ہے کہاں!  
جی چاہتا ہے آنکھوں میں چھپا لوں تم کو  
بسا کے دل میں پلکوں پہ سجا لوں تم کو  
(راہبہ آفرین.....لاہور)

محبت چیز کیا ہے سوچتی ہوں میں  
کبھی مدہوش ہو جاتی ہوں اس کو کھوجتی ہوں میں  
کبھی شک کی نظر سے دیکھتی ہوں میں  
محبت جان بھی ہے اور دشمن جان کی بھی  
کبھی یہ چمن دیتی ہے کبھی یہ درد کا ٹھنڈا دیتی ہے  
کلیجہ پھاڑ دیتی ہے یہ کبھی ہمدرد ہوتی ہے  
ہمارے ساتھ ہستی ہے ہمارے ساتھ روتی ہے

کبھی یہ سایہ بن کر ساتھ چلتی ہے  
کبھی یہ آگ بن جاتی ہے  
اور جسم و جاں میں جلتی ہے  
ہمارے ہی لہو کو لپی کر جلتی ہے  
محبت چڑ کیا ہے سو جتی ہوں میں  
(ریح نور..... فیصل آباد)

کلی دل لگی ہو تو کیا کیجیے  
اگر غم خوشی ہو تو کیا کیجیے  
ہنوں کھل کھلا کے یہ سوچا تو نے  
ہی چیخ سی ہو تو کیا کیجیے  
یہ دل رو رہا ہے مگر درد سے  
لیوں پر ہنسی ہو تو کیا کیجیے  
ترے پاس سب کچھ ہے فضل خدا  
دفا کی کسی ہو تو کیا کیجیے  
پتنگ کی طرح کٹ کے اڑتے رہے  
ہوا سر پھری ہو تو کیا کیجیے  
اتیاز یاں حسرت تڑپ اور غم  
بھی شاعری ہو تو کیا کیجیے  
(ایس اتیاز احمد..... کراچی)

جتنے لے ہم سفر سب مہرباں لے  
جتنے بھی دشمن لے سب بے نشان لے  
پیا سے تھے جب تو ایک قطرہ بھی نہ ملا  
اب کے تو دریا بھی سب بے کراں لے  
یوں تو رہے ساتھ وہ سائے کی طرح  
مگر جب آواز دی رستے دیوایں لے  
بھولنا بھی چاہیں نہ بھول پائیں گے  
ہم کو انہوں سے ایسے کچھ احساں لے  
رو رو کے سنائیں گے یہ میری کہانی  
میرے لفظوں کو کبھی جو زباں لے  
جاں اس لیے دی ہم نے وفا کے نام پر  
میدان عشق میں ہماری داستاں لے  
(انتخاب: ڈاکٹر انعام شہزاد..... ننگن صاحب)

دل کی بات لیوں پر لا کر لب تک ہم دکھ سہتے ہیں  
ہم نے سنا ہے اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں  
بیت گیا سادوں کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں  
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں  
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں ا  
دفا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں  
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کیلئے بدنام ہو نہ  
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں  
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزر اٹھا  
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں  
(انتخاب: نجم اسحاق انجم..... کٹن ہار)

میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم نے ہی نہیں  
بہت کوششیں کیں مگر یہ فاصلے مٹے ہی نہیں  
جھولی پھیلا کر تمہیں مانگا خدا سے میں نے  
مگر خدا نے میری کسی دعا کو سنا ہی نہیں  
ہر ایک سے پوچھا تیرا نہ ملنے کا سہرا  
ہر ایک نے بتایا وہ تیرے لئے بنا ہی نہیں  
میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم کسی اور کے ہو گے  
شاید کے اس جہاں میں وفا کس سلسلہ ہی میں  
(محمد شیر یونس..... مہر آباد)

میری نظر سے اس وطن کو  
رنگین پھولوں کی بہاروں کو  
پیاس صحرائوں کی سیراب میں  
پانچ دریاؤں کو آبشاروں میں  
صبا پنجاب کے کشور میں  
صورت جنت کی اس کی ضیا میں  
مذہب کا جمال ظہور  
دردازہ آمد اسلام کا وہ  
موسموں کی تو بہار  
باد صبا اور رُت بہار  
طلخہ چاروں صوبوں کے  
آدرش کوکب کوکب کوکب  
شام سہانی لاہور شہر میں

من من دھن دھن  
کبھی 65 کبھی 71 کی جنگوں کے جذبات دیکھو  
اب تو اور بھی دشمن کو منہ توڑ جواب دیکھو  
ایسی دھماکہ یا پھر غوری میزائل کا شاب دیکھو  
(غلام مصطفیٰ بادل۔ قصور)

ہمے زندگی کا شعور تھا تیرا کیا بنا  
خاموش کیوں ہے کچھ تو بتا تیرا کیا بنا  
انصیب سے جو تیری جنگ تھی میری بھی تو تھی  
تو کامیاب نہ ہو سکا تیرا کیا بنا  
منزلوں کی تلاش تھی سو چھڑ گئے  
چھڑ کے تجھ سے بھگ گیا تیرا کیا بنا  
تو مقابلے میں شریک ہوا تھا اس لئے  
لی مجھ سے آکر پوچھتا تیرا کیا بنا  
معلوم تھا شکایت میرا نصیب ہے  
تو امیدوار تھا حبیب کا تیرا کیا بنا  
(محمد دانیال۔ روڈہ محل، خوشاب)

میرے بارے میں سوچتی ہے یہی بہت ہے  
کو میں دیکھوں تو وہ دیکھتی ہے یہی بہت ہے  
خود کو میرا نہیں سمجھتی تو کوئی غم نہیں  
مجھ کو اپنا تو مانتی ہے یہی بہت ہے  
اں میں اس کا مجھ سے ملنا ضروری نہیں  
تجھ سے خوابوں میں ملتی ہے یہی بہت ہے  
وہ میری نہیں ہوئی تو یہ میرا مقدر  
میں تو اس کا ہوں یہی بہت ہے  
اداسی کو نہیں چاہتی تو کوئی بات نہیں  
چاہت کو تو مانتی ہے بس یہی بہت ہے  
(عجب گل اداسی۔ ٹنڈوالہ یار)

لاؤ مجھ کو  
ج کبھی یاد بھی نہ کیا  
دیکھا وہ مجھ کو  
ج کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا  
ایوں کا پہرہ کچھ اس طرح تھا مجھ پر  
ایسی میں، صبح و شام اس میں رہ کر

درد بڑھتا ہی گیا اور  
کبھی کم نہ ہوا  
میری سانسیں ختم کیں پر اس کا  
انتظار کبھی ختم نہ ہوا  
لکڑیاں مجھ پر رکھ کر سب نے  
مردہ مجھ کر مجھے جلادیا  
اور اس کے اعتبار کی قبریں  
مجھ کو فنا دیا!  
مجھ کو فنا دیا!

(کائنات رشح نور۔ لاہور)

تجھے عشق ہو خدا کرے  
کوئی تجھ کو اس سے جدا کرے  
تیرے ہونٹ مسکرانا بھول جائیں  
تیری آنکھیں پر غم رہا کریں  
تیرے خواب نظریں ٹوٹ کر  
تو کرجی کر پئی چٹا کرے  
تجھے عشق ہو پھر یقین کرے  
اسے تسلیوں پر بڑھا کرے  
میں کوں عشق ڈھونگ ہے  
تو نہیں نہیں کہا کرے  
تجھے عشق ہو خدا کرے

(خضر حیات۔ روڈہ محل)

تیری جانب اگر چلے ہوتے  
ہم نہ یوں در بدر ہوئے ہوتے  
ساری دنیا ہے میری مٹھی میں  
کون آئے گا اب تیرے ہوتے  
اور اب کیوں نہیں بھاتے تم  
اتنے وعدے نہیں کیے ہوتے  
پالیا میں نے ساری دنیا کو  
گوئی خواہش نہیں تیرے ہوتے  
اس کی آنکھوں میں بار پانے کو  
کاش ہم خواب بن گئے ہوتے  
(انتخاب: ناصر محمد خالد عباس۔ ننگن صاحب)  
☆☆



# ویران مندر

شہزاد خان - صادق آباد

سادھو کے مرتے ہی عجیب و غریب آوازیں تھہ خانے میں گونجنے لگیں، کان پہاڑ آوازیں جسم و جان پر سکتہ طاری کر رہی تھیں اور پھر سادھو کا سیدھایا ہوا جادوئی انسانی بھیڑیا چیخنے لگا اور پھر.....

دل دہلائی ہوش اڑاتی رگوں میں لہو بخند کرتی تھیرا نگیز اور حیرت ناک کہانی

چاند گھوڑوں کی ہنسی پر سیاہ لمبا دھوڑے اور لمبا گھونٹ نکالے ایک پراسرار شخص تیزی سے چابک لہراتے گھوڑوں کو بھاگنے چلا جا رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ زمین پر گھوڑوں کے قدموں کے نشان نہیں بن رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑتے جا رہے ہوں۔ آسمان پر کہیں کہیں سیاہ بادل لہراتے پھر رہے تھے اور جب کبھی چاند کے سامنے آ جاتے تو پہلے بھر کے لئے اندھیرا چھا جاتا ایسا بار بار ہو رہا تھا لیکن گھوڑوں کے بھاگنے کے انداز میں ذرا برابر فرق نہیں آتا تھا۔ راستہ کی کھاد اور ان کا رخ سامنے نظر آنے والے کھنے جنگل کی طرف تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے لیکن وہ اپنے پیچھے گرد و خراب کا ایک گہرا طوفان چھوڑتے جا رہے تھے۔ بڑی عجیب و غریب قسم کی سواری تھی۔ کوچان وقفے وقفے سے چابک لہرا کر ان کی پیٹھ پر ہارتا تو بل بھر کے لئے وہ چابک کی آواز سن کر اچھلتے پھر اور زور لگا کر دوڑنے لگتے۔ کچھ ہی دیر میں وہ جنگل کے نزدیک پہنچ گئے۔ رات کی تاریکی میں جنگل کا منظر اچھوں اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم میں قدرے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ جنگل

کے نزدیک پہنچتے ہی کوچان نے انہیں دائیں طرف انظر آنے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑے اس کا اشارہ پاتے ہی اس طرف مڑ گئے۔ تقریباً تین فٹ چوڑا راستہ تھا۔ جنگل کے اندر جا رہا تھا جس پر وہ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ قاصد ملے کرتے جا رہے تھے وہیں دور بہت دور ایک پرانی عمارت کے آثار واضح ہو جا رہے تھے۔ چونکہ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اس لئے جنگل کے اندر تک بھی پھیلی ہوئی تھی۔ درختار کے حساب سے چند منٹوں میں وہ اس عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ کہانی نے لگا میں کھینچ کر انہیں روک دیا۔ گھوڑے یوں رک گئے جیسے چابی ختم ہونے پر کھلوئے۔

شکل سے عمارت کوئی بہت ہی پرانا مندر و سال دے رہی تھی۔ کسی دور میں شاید یہ کوئی شاندار مندر رہا ہوگا لیکن موجودہ گردش حالات میں اسے دیکھ کر خوف طاری تھا۔ عمارت کی کنگ بھگ بچیس کے قریب بیڑھیاں لگی ہوئی اور اس کے دونوں طرف دو کول ستون بنے ہوئے تھے۔ ان پر نامانوس زبان میں الفاظ کتنے تھے۔ مندر کے مین گم کے عین درمیان ایک پرانی وضع کا گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ اس رنگ سیاہ ہو گیا تھا یا شاید اندھیرے کی وجہ سے۔ اس کا دے رہا تھا۔ کوچان نے نیچے اتر کر کبھی کے پیچھے



اٹھایا اندر ایک سیاہ رنگ کا تابوت دکھاتا جس کے اوپر لگے ہوئے شخصے میں سے ایک نوجوان عورت کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی ظالم شخص نے سرخ سے اس کے جسم کا سارا خون چھڑا لیا ہو۔ تابوت کو اپنے کندھے پر اٹھا کر وہ مندر کی سڑکیاں چڑھنے لگا۔ اس تمام کارروائی میں اس کے چہرے کا گھونٹ بدستور اسی طرح قائم تھا۔ تابوت کے اترنے ہی گھوڑے نہ ہناتے ہوئے تیزی سے ایک جانب بڑھ گئے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب ان کے دوزخ کا معمول ہو۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچنے ہی سامنے ایک بڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف بہت سے کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ چمت سے لگتے ہوئے سڑکیوں کے چالنے زمین تک پہنچے ہوئے تھے اور فرش جگہ جگہ سے اکڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کافی سارے گڑھے بنے ہوئے تھے لیکن کوچان تابوت اٹھائے تیز تیز قدموں سے بڑھا رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا قائل پر چل رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کی دیواروں کا رنگ گہرا پیلے رنگ کا تھا جس پر چاندی ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تصاویر نقش ہوئی تھیں۔ ہال کے وسط میں ایک بہت بڑا بہت نصب تھا جس کے بہت سے ہاتھوں میں مختلف چیزیں پکڑیں ہوئی تھیں۔ بت کے قدموں میں خشک پھولوں کا ڈھیر تھا اور بہت سے خشک ناریل کے چٹکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی دور میں یہ ایک پرکشش عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن اب اس پر ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے کن حالات کے تحت لوگ اسے خیر باد کہہ گئے ہوں گے۔ ہال کی بناؤت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا ہوگا۔ چاروں طرف ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوچان نے تابوت بت کے قدموں کے پاس رکھ دیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے باوجود اس نے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کی تھی اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی کھلو ناروٹ ہو اور چالی ختم ہو جانے کے بعد یکدم مر گیا ہو۔ گھونٹ بدستور اس کے چہرے پر لٹک

رہا تھا اور اس نے بھی اسے اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ پھر اچانک ایک آہٹ سی سنائی دی اور یکدم ہال میں کوئی داخل ہوا۔ کسی کے آنے کی آہٹ محسوس کرتے ہی کوچان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر ڈاگھوٹ لٹ دیا۔

ایک تنگ دتار یک کمرے کے وسط میں ایک چٹائی پر کمرے رنگ کا لنگوٹ باندھے ایک بوڑھا شخص جس کے لمبے بال اس کے شانوں تک پھیلے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں ایک مٹی کا بت تھا کونکوں سے ڈھکی ایک لمبی سانس رکنے بیٹھا تھا۔ مٹی کا بت مٹی کی دال کے آٹے سے گوندھا گیا تھا۔ اور بناؤت سے کسی عورت کا ہی لگ رہا تھا۔ وہ وقفہ وقفہ سے کچھ پڑھ کر دائیں طرف رکھی ایک ٹرے سے سوئی لیتا اور اسے آٹے سے بے ہمت کے جسم میں پیوست کر دیتا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں جہاں سوئی چبھتی وہاں وہاں خون کے قطرے نمودار ہونے لگتے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی آٹے کے بت میں نہیں بلکہ کسی زندہ انسان کے جسم میں سوئی چھو رہا ہو۔ تقریباً سات سوئیاں اس میں پیوست کرنے کے بعد اس نے اسے اپنے بائیں جانب رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی دھاتی بیٹی میں احتیاط سے رکھ دیا جس کی سطح پر ایک کھوپڑی اور دو بڈیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اور ان پر سرخ رنگ سے کراس کا نشان بنایا ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بچپنی سے کسی کا انتظار کرنے لگا۔

کوچان کے گھونٹ اٹھتے ہی اس کا کہیہ چہرہ سامنے آ گیا ایسا خدا یا! اس کا غلیظ چہرہ دیکھ کر ایکائیاں آ رہی تھیں اس جیسا وحشت ناک چہرہ شاید ہی کسی اور کا ہو اس کی آنکھوں کے ڈھیلے گڑھوں سے باہر لٹک رہے تھے اور اس کی ٹھوڑی لٹک کر ادھر ادھر جھول رہی تھی طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک نے اس کی بد صورتی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہال میں داخل ہونے والے شخص کو دیکھ کر کوچان کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس کا چہرہ تو سامنے کے رخ تھا لیکن اس کا دھڑ پیچھے کی جانب مڑا ہوا تھا۔ ہاتھوں کے لیے ناخن نیچے لٹک رہے تھے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں پاؤں کی بجائے اٹھ اٹھ تھیں

جن پر گھنے بال کسی رچھ کی طرح ہونے کا گمان دیتے تھے۔ اس نے ایک کالے رنگ کا چھوڑا زیب تن کیا ہوا تھا جس پر فافورس سے کسی ڈھانچے کی شکل بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ "سارنگ" تھا۔ جسے دیکھتے ہی کوچان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

بات جی تھی کیونکہ وہ ایک بار اس کی ایک غلطی پر اسے ایک ایسے علاقے میں قید کر چکا تھا جہاں پر سٹگی دنیا کے موکل بھی جانے سے گھبراتے تھے۔ سزا معاف ہو جانے کے بعد وہ دوبارہ اسے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگا۔ وہ اس کے لئے قبرستانوں سے تازہ لاشوں کو چرا کر لاتا تھا۔ وہ پراسراری شخص ان لاشوں کو کیا کرتا تھا اس سے اسے کوئی غرض نہ تھی اور نہ ہی اس نے کونھ لگانے کی کوشش کی تھی۔ جنہیں یہاں کسی نے آتے ہوئے دیکھا تو نہیں "؟..... ایک انتہائی باریک آواز سنائی دی۔ "نہیں..... جواب میں ایک اور آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ "..... دفع ہو جاؤ"..... دوبارہ وہی باریک آواز غرائی۔ کوچان یہ سنتے ہی یوں اٹھ کر بھاگا جیسے گرا سے ایک لمحے کی بھی دیر ہوگئی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ بھاگتے ہوئے اسے دوبار ٹھوکر بھی لگی لیکن وہ اٹھ کر تیزی سے بھاگتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔ راہداری کراس کرتے ہوئے وہ تیزی سے مندر کی سیڑھیاں اتر کر ایک جانب کھڑی کھسی کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے ایک تیل گاڑی جس پر ایک عورت ایک بڑی سے گھڑی سامنے چہرے بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ایک دھاتی گڑی ایک ڈلی تھی۔ تیل گاڑی کو ایک اوجیر عمر کا شخص ہانک رہا تھا جس کا حلیہ اس کی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ تیزی سے بیلوں کو ایک باریک چھڑی سے ہانکتے ہوئے بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہ اپنے گاؤں شام گھر پہنچ جائیں۔ اس پاس کے علاقے میں پھیلنے والی پراسراری باتوں کی وجہ سے اسے بہت فکر لگی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کی نوجوان بیٹی صفران

بھی تھی جسے وہ اس کے سرال سے اپنے بڑے بیٹے کی شادی میں شرکت اور کام کاج کے سلسلہ میں لے کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس کی بیٹی کی شادی قریب کے ایک گاؤں سارک پور کے ایک گھرانے کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ جو برتن بھارت گزر بسر کر رہے تھے۔ اپنے جیسوں میں بیٹی بیاہ کر وہ قدرے بے فکر ہو گیا تھا۔ اور ایک ہفتہ بعد اس کے بیٹے کا نکاح تھا چونکہ اس کے کوئی اور اولاد نہ تھی سوائے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا اس لئے کام کاج کے لئے اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ پڑوس کے گاؤں میں بیاہی ہوئی بیٹی کو کچھ دلوں کے لئے گھر لے آئے تاکہ وہ شادی کے انتظامات میں اس کی بیوی کا ہاتھ بٹا سکے۔

اور اسی سلسلہ میں آج وہ صبح سویرے ہی اسے لینے چلا گیا تھا لیکن اس کی بیٹی کے سرال والوں نے اسے کھانے کے لئے روک لیا تھا اور پھر کھانے کے بعد وہ ایسے باتوں میں مشغول ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور پھر جلدی جلدی تیاری کر کے وہ گھر کے لئے نکل پڑے۔ اس کی بیٹی کے سرالوں نے اسے رات رکنے کے لئے بہت زور لگایا لیکن وہ اس لئے نہیں رکا کیونکہ گھر میں اور بہت سے کام اچھوڑے چھوڑ کر آیا تھا۔ آدھے راتے میں ہی شام سر پر آگئی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ وہ پھر کا کھانا کھایا ہوا تھا اور انہیں بھوک بھی بہت زوروں کی لگی ہوئی تھی اس کی بیٹی نے چلتے وقت کچھ روٹیاں اور کچھ گڑی ڈالیاں ساتھ رکھ لیں تھی جو اس وقت اس کے کام آ رہی تھیں اور وہ انہیں کھانے میں مصروف تھی۔ ابھی وہ مزید ایک میل ہی چلے ہوئے کہ آسمان پر گہری سرخ آندھری کے آثار نمودار ہونے لگے اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ آسمان پر چھانے والی گٹا کا رنگ گہرا سرخ تھا جو تیزی سے مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔

اور پھر اچانک ایک زوردار جھکڑ چلا اور چاروں طرف مٹی ہی مٹی اڑنے لگی۔ تیز ہوا میں تیل گاڑی بھی ڈگدگانے لگی تیل بدستور ہو کر بھرنے لگے جسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا۔ دھوپ سے بچنے کے لئے تیل گاڑی کے چاروں طرف اور اوپر کی جانب جو کپڑے لگائے گئے تھے وہ

منہوں میں تیز ہوا کی نظر ہو گئے تھے۔ گردوغبار کے طوفان میں آنکھیں تنک کھولنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اندر ناک میں تیزی سے مٹی چھتی جا رہی تھی۔ لہجہ عرض شخص نے اودھ کھلی آنکھوں سے اس باس نظر دوڑانے کی کوشش کی مگر اڑتی ہوئی مٹی میں ایسا کرنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی وہ اسی شش وچ میں تھا کہ اس کے کان میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے دائیں طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھنے کا کہہ رہا ہو، پہلے تو اس نے اسے اپنا وہ خیال کیا لیکن بار بار اسے ایک ہی آواز سنائی دی جا رہی تھی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیلوں کا رخ اپنے دائیں طرف موڑ دیا۔ تیل بڑی مشکل سے سیدھے راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ طوفان کی رفتار میں کمی آنے لگی اور پھر اچانک طوفان یوں رک گیا جیسے کسی آبیائی نہ ہو۔

جھک جتنی تیزی سے آتی تھی تیزی سے غائب ہو گیا اور سامنے ایک بہت ہی پرانا مندر دکھائی دیا۔ دات کی تاریکی پھیلنے سے اس کی عمارت انتہائی خوفناک لگ رہی تھی۔ ابھی وہ اسی شش وچ میں ڈوبا اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے بہت زور سے کسی نے دھکا دیا وہ اچھل کر تیل گاڑی سے نیچے زمین کی طرف گرا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مندر کی سامنے کی دیوار پھٹی اور ایک خوفناک عورت کا آدھا دھڑ باہر نکلا جس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ نے پلک چمکتے ہی اس نے بوڑھے کی گردن و بوجھ لی۔ اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس ہاتھ نے اس کی گردن کو یوں دبوچ لیا تھا جیسے وہ اس کے انتہائی قریب موجود ہو۔

یہ دیکھ کر تیل گاڑی میں موجود اس کی بیٹی دہشت زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس عفریت سے اپنے بوڑھے باپ کو بچائے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے اس کے باپ کو گردن سے دبوچ کر عمارت کے اندر گھسٹ لیا اور دیوار برابر ہو گئی۔

دات کا اندر ہر چاروں طرف پھیل گیا تھا اور اس

دہشت ناک تنہائی میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں کی بازگشت دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کی مدد کے بجائے بہت سی چنگا ڈریں اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئیں مندر سے نکلیں اور فضا میں تھیل ہو گئیں۔ ابھی اس کی آواز کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے کپڑوں میں شعلے بھڑک اٹھے وہ گھبرا کر تیل گاڑی سے نیچے کودی اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیدی سامنے نظر آنے والے مندر کے دروازے کی جانب بھاگنے لگی اس کے کپڑوں سے اٹھنے والے شعلے اس کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے مندر کے اندر لیجانے کے لئے ہی ایسا کر رہے تھے۔ وہ جتنی چلائی مندر کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سیدی صحن میں پہنچ گئی۔ سامنے کے رخ ایک تنگ ساراستہ دکھائی دے رہا تھا جس کے آگے خشک چٹوں کا ڈھیر بڑا تھا جس پر ایک کالا بلا بیٹھا اپنے بچوں پر لگا خون چاٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ شعلے اب بچھ چکے تھے وہ خوف زدہ نظروں سے اس کا لے بلے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے جسم کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔

بلا یوں خون چاٹنے میں مصروف تھا جیسے اسے صرف اسی کام کے لئے رکھا گیا ہو۔ وہ ہولے ہولے ایک جانب کھٹکتے لگی۔ "بھاگ کر کہاں جا رہی ہو یہاں آنے کا راستہ ہے لیکن واپسی کے لئے جان کی قربانی دینی ہوگی۔" بلے کے منہ سے انسانی آوازیں کراس کے منہ سے چیخ نکلیں لگی اور وہاں مندر کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کے تقریباً دو بجے کا وقت ہوگا جب ایک تاریک تہہ خانے میں ایک کھوٹی سے ایک انسانی بھیڑیا لوہے کی زنجیروں سے بندھا غرابا تھا اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت زنجیروں کو توڑ کر فرار ہو جائے گا۔ اس کے جسم پر ریچھ کی طرح مجھوڑے بال تھے جو گردوغبار سے اٹے پڑے تھے۔ تہہ خانے میں صرف ایک روشندان بنا ہوا تھا جس میں سے چاند کی چاندنی ایک فٹ چوڑے چکور ہالے کی صورت میں فرش پر پڑی تھی اس کے

علاوہ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ چاند ہولے ہولے اپنی منزل طے کر رہا تھا اور پھر جیسے ہی اس کے آگے آنے والے بادل سر کے اس نے زنجیروں کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور زنجیروں کے ٹوٹنے ہی وہ تیزی سے اچھلتا کودتا تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بھاگ گیا۔ جن زنجیروں سے وہ بندھا کچھ دیر پہلے انتہائی بے بس دکھائی دے رہا تھا وہی لوہے کی مضبوط زنجیریں چاند کے پوری طرح نمودار ہوتے ہی کچے دھاگوں کی مانند ثابت ہوئیں۔

یہ اسی مندر کے تہہ خانوں میں سے ایک اور تہہ خانے کا منظر تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک کالا بلا موجود تھا اور وہاں کو جان ایک تابوت لے کر داخل ہوا تھا۔ اس عجیب و غریب مندر میں نہ جانے کتنے تہہ خانے تھے اور وہاں کیسے کیسے اسرار جنم لے رہے تھے۔ یہ تو خدائی بہتر جانتا تھا۔ لیکن جس طرح بے درپے واقعات پیش آ رہے تھے اس سے یہ یقین ضرور ہو گیا تھا اس پر اسرار اور دیران مندر میں بہت خوفناک اور گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس مقام پر بنے ہوئے اس بڑے مندر میں نہ جانے کیسے حالات پیش آئے ہوں گے کہ لوگوں نے اسے یوں دیران چھوڑ دیا تھا۔ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ انتہائی مقدس اور قابل احترام ہوتی ہے۔ جس کا احترام ہر مذہب کا پرچار کرنے والوں پر لازم ہوتا ہے۔ نہ جانے ایسے کیا نامساعد حالات پیش آتے ہیں کہ لوگ اپنی عبادت گاہوں کو یوں دیران چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعد میں آسیب اور بری آتمائیں ایسی دیران پڑی ہوئی عمارتوں یا عبادت گاہوں میں بسیرا کر لیتی ہیں اور بعد میں خدائی مخلوق کو خشک کرتی رہتی ہیں۔

اس دیران پڑے مندر میں بھی کچھ ایسی بری آتمائیں بسیرا ڈالے ہوئے تھیں جن کے کالے کروت آہستہ آہستہ سامنے آتے جا رہے تھے۔ سیڑھیوں کے نزدیک پہنچتے ہی اس انسانی بھیڑیے نے ایک زوردار نکر سے لکڑی کے دروازے کو نگر مار کر گرا دیا اور اچھل کر باہر نکل گیا۔ چاروں طرف چاندنی کا سحر پھیلا ہوا تھا جس کی دودھیا روشنی میں ہر چیز ٹھہری ٹھہری لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے ہر چیز پر سفید پاؤڈر چھڑک دیا ہو۔ تہہ خانے

سے باہر نکلتے ہی اس انسانی بھیڑیے کا حلیہ ایک دم تبدیل ہو گیا اس کی ہاتھوں سے دو لمبے لہجے دانت باہر نکل کر اس کی ٹھوڑی تک ٹپکتے لگے اور اس کی آنکھیں لہجوری اور تڑپتی ہو گئیں جن میں سفیدی بڑھ گئی اور ہاتھوں کے ناخن کسی خونخوار بھیڑیے کے پنجوں کی مانند ہو گئے ایک نظر میں وہ کوئی خون آشام بھیڑیا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور دائیں طرف بھاگنے لگا اس کی رفتار درختوں کی بھول بھلیوں میں بھی اسی طرح تھی جیسے وہ کسی درختوں کے جھنڈ میں بھاگنے کی بجائے کسی سرک پر بھاگ رہا ہو۔ ٹھوڑی دیر میں درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سامنے ایک انسانی آبادی نظر آنے لگی۔

تقریباً تیس چالیس گھروں پر مشتمل آبادی میں سے چند ایک مکانات میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ باقی گھروں میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ درندہ بھاگتے بھاگتے ایک گھر کے قریب جا کر رک گیا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یوں لگتا جیسے کہیں قریب ہی دو کتے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر غرار رہے ہوں۔ کچھ دیر تک کھڑے رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ ایک گھر کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے اور اس کے نزدیک پہنچتے ہی ایک زوردار نکر سے لکڑی کا زور دروازہ توڑ دیا۔ زوردار نکر کے سامنے دروازہ ریت کی دیوار ثابت ہوا اور مکان کے اندر کی جانب گر گیا۔

دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی صحن میں لیٹے ہوئے افراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر تک تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

لیکن جیسے ہی ان میں سے ایک بچے کی نظر اپنے سامنے نظر آنے والے ایک انسانی درندے پر پڑی تو اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اس کی دیکھا دیکھی گھر کے دیگر افراد نے اس درندے کو دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس انسانی درندے نے ان کے چیخنے چلانے کی پرواہ کئے بغیر لپک کر اپنے سامنے چار پائی پر بیٹھے ایک دس بارہ سالہ بچے کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور لمبی لمبی چھلانگیں بھرتا دروازے کے ٹوٹے ہوئے راستے سے باہر نکل گیا۔



تھوڑی دیر تک تو گھر کے افراد کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں دم توڑ چکی تھیں لیکن جیسے ہی ان کے لاشعور نے انہیں اصل حقیقت دکھائی وہ دہشت سے چیخنے ہوئے اس درندے کے پیچھے گھر سے نکل گئے۔ لیکن اتنی دیر میں وہ انسانی بھیڑیا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور سامنے دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ چاند کی روشنی میں ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی اور بہت دور جنگل کے درخت کسی دیو یوں کی مانند سر اٹھائے نظر آرہے تھے لیکن وہ انسانی بھیڑیا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں ہو کر وہ واپس گھر لوٹ آئے ان کے چیخنے چلانے کی وجہ سے آس پاس کے دیگر گھروں کے افراد بھی اٹھ کر ان کے گھر کے محن میں آکھٹے ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا سن کر دہشت زدہ نظروں سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے اتنی دیر میں کسی نے وہاں کے نمبردار کو بھی اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دو محافظوں کے ساتھ اس وقت اس متاثرہ گھر کے محن میں بیٹھا ان سے پیش آنے والے حالات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

واقعہ سننے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سر کو بھی ہلاتا تھا اسے اس سارے واقعہ میں یہ بات سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جس قسم کے انسانی بھیڑیے کے بارے میں وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اس قسم کے درندے کے متعلق اس نے آج تک نہ سنا تھا اور نہ ہی کسی اور شخص نے اس کی وہاں کے علاقے میں موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اور اسے بھی پریشانی تھی کہ اب وہ اپنے گھروں کی حفاظت کیسے کر سکیں گے کیونکہ جس قسم کا حلیہ اسے بتایا جا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی خوفناک اور طاقتور ہے اس کے باوجود اس نے تمام حالات جاننے کے بعد اپنے کچھ بندوں کو اسلحہ وغیرہ دے کر جنگل کی طرف جانے والے راستے پر روانہ کر دیا اس امید پر کہ شاید ابھی تک اس درندے نے اس موصوم بچے کو اپنی درندگی کا نشانہ نہ بنایا ہو اس کے آدمی اسلحہ لے کر جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ اور نمبردار ہاتھی قح جانے افراد کے

ساتھ باتیں کرنے لگا۔

گھر سے باہر نکلتے ہی وہ انسانی بھیڑیا اپنے بچوں میں بچے کو بوچھڑا سیدھی سمت جانے کی بجائے اپنی باتیں جانب جانے والی ایک چلی سی پکڑی پر بھاگنے لگا۔ جی زمین ہونے کی وجہ سے اسے بھاگنے میں کوئی وقت نہیں ہو رہی تھی۔ خوف کی وجہ سے بچہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا اور کسی بے جان کچھوے کی طرح اس درندے کی ہاتھوں میں جمول رہا تھا۔ کھوتوں میں چاروں طرف گندم کی فصل کے خوشے لہرا رہے تھے اور سونڈی سونڈی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

چاند اپنے سر میں لگن تھا چاندنی کا سحر اسی طرح ہر چیز کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھا۔ ستارے خوف سے اپنی آنکھوں سے زمین پر بھاگنے والی حلقوں کو تنک رہے تھے تقریباً آدھا میل تک بھاگنے کے بعد اس درندے نے اپنا رخ موڑا اور سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے برگد کے پتھر کے نیچے جا کر رک گیا۔ برگد کا پتھر دیکھنے میں انتہائی پرانا اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا جس کی جڑیں جنہیں عموماً پھیل ڈاڑھی کہا جاتا ہے زمین تک لٹک رہی تھیں۔ بچے کو ایک جانب لٹا کر وہ درندہ زور زور سے اپنی گردن کو ایک دائرے میں یوں گھمانے لگا جیسے اس کی گردن میں بلی پڑ گیا ہو۔ اس کے منہ سے نکلنے والی بیانیہ آوازیں بہت ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی چڑھیلیں مل کر بین کر رہی ہوں۔

رات کا آخری پہر، بیابان جنگل اور صدیوں پرانا برگد کا بوڑھا پیڑ یہ سوچے ہی جسم پر کچلی طاری ہوئی تھی۔ منظر اچھو اچھو کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ اگر یہ منظر وہ بد نصیب بچہ اپنی جاتی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو شاید دہشت سے وقت سے پہلے ہی مر جاتا۔ اپنی گردن کو مسلسل دائرے میں گھماتے ہوئے اسے ابھی چند منٹ ہی ہو ہوں گے کہ یکدم جنگل میں بہت سے افراد کی آوازیں۔ ناالی دینے لگیں یوں لگتا تھا جیسے بہت سے افراد بھاگتے ہو۔ اسی طرف آرہے ہوں کبھی کبھی ٹارچوں سے نکلنے والی روشنیاں لہرائی ہوئی دکھائی دیتیں۔ آوازوں سے پتا چلا

تھا کہ وہ افراد زیادہ دور نہیں اور جیسے کچھ ہی لمحوں میں وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ آوازیں سننے ہی اس درندے کے کپوترے کان آسمان کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اپنا منہ اٹھائے فضا میں مسلسل کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا پھیلا ہوا ناک تیزی سے سکڑا اور پچک رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اچھل کر چند افراد اس کے سامنے نمودار ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک بڑا سا کرہ تھا جس میں ایک چٹائی پر وہ آڑھے ترچھے انداز میں پڑی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی بے دردی سے اسے زمین پر لا کر پٹک دیا ہو۔ اس کا انگ انگ دوسرے تڑپ رہا تھا اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس کے سامنے ایک بھیا تک کالا بلا انسانی آوازیں باتیں کر رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کر وحشت سے بے ہوش ہو کر مندر میں تہہ خانے کے فرش پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے خود کو اس کمرے میں موجود پایا۔ داغ میں پھیلا خیال آتے ہی وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی اور چاروں طرف نظریں گھمانے لگی۔ کمرے میں صرف اس چٹائی کے کوئی اور شے موجود نہ تھی حتیٰ کہ پینے کے لئے پانی تک موجود نہ تھا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اسے اپنے حلق میں کانٹے جیسے محسوس ہو رہے تھے۔ اور پھر یہ دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ کمرے کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا چاروں طرف سپاٹ دیواریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی چاروں دیواریں ایک دوسرے کی جانب چلی گئی ہوں یہ محسوس کرتے ہی اس کا سانس بند ہونے لگا وہ سمجھ گئی کہ اگر یہی صورتحال رہی تو وہ ان دیواروں کے درمیان دب جائے گی اور اس کی ہڈیوں کا روم بن جائے گا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے اور اصرار دیکھنے لگی لیکن اسے کوئی راستہ نہ نکلیں دے رہا تھا۔

دیواریں باقاعدہ یوں چل رہی تھیں جیسے کوئی دور شا آئینس ریموٹ کے ذریعے چلا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ تسلیم ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس کچھ ہی منٹوں میں اس قدر کم لگیا کہ اسے ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں یوں لگتا تھا

جیسے کوئی دور بیٹھا چرخ کات رہا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں موت کو یاد کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ دیر تک یونہی بیٹھی رہی لیکن جب کافی دیر تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے ہلکے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دیواروں کا وہاں دور دور تک کوئی وجود نہ تھا اور کمرہ اسی طرح تھا جیسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے اپنی جان قح جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر آئندہ آنے والے حالات کا انتظار کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

اس عفریت کا پچھا کرتے کرتے میں افراتو کی ٹولی میں سے سات افراد ایسے تھے جو اس جانب نکل آئے تھے۔ کھیتوں میں چلتے چلتے وہ مسلسل باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ لائینوں کی روشنی میں پکڑ پکڑیوں پر چلنے کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر انہیں ایک بہت بڑا برگد کا درخت نظر آیا۔ پھر ایک خیال کے تحت انہوں نے اپنا رخ اس جانب موڑ دیا اور پھر جیسے ہی محسوس کر وہ اس پیڑ کے سامنے پہنچے تو دہشت سے ان کی جھپٹیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے ایک بھیا تک شکل حلقوں اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ اب سے کچھ دیر پہلے وہ خود اسے ڈھونڈ رہے تھے اور اب جبکہ وہ ان کے سامنے موجود تھی تا خوف سے ان کے قدم من من کے ہو گئے تھے اور انہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

انہوں نے سوچا کہ فوراً بھاگ کر اس عفریت سے اپنی جانیں بچائیں لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ ان کے قدموں نے زمین کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے متناطیس کی لوہے کو پکڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس حلقوں نے ان کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

☆.....☆.....☆

اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا ایک زوردار دھماکے سے جیتل کا گلاس اس کی پیشانی سے ٹکرایا وہ اس اچانک افتاد پر یوکل گیا اور فوراً اپنی پیشانی پر دایاں ہاتھ رکھ لیا۔ دوی کی اک تیز لہر اس کے سر میں اٹھ رہی تھی اور جہاں گلاس لگا تھا وہاں ایک سرخ گوشت خیزی سے ابھر گیا تھا۔ اس

نے درو سے کراہتے ہوئے محن میں کن انھیوں سے دیکھا تو روز کے معمول کی طرح اس کی زبان دراز بیوی اس کی ماں سے ابھی دکھائی دی۔ رشید بیٹے کے لحاظ سے ایک دوکاندار تھا جس کی شہر میں ایک چھوٹی سے دوکان تھی جس پر جزل اسٹور کے ساتھ ساتھ کریانہ کی چیزیں بھی تھیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون کا سانس نہیں ملا تھا۔ ایک جانے والے دور کے رشتہ دار کے توسط سے ایک غریب گھرانے میں اس کی شادی ہو گئی تھی۔ سرسرا میں ساس اور بیوی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ ساس اپنے مرحوم خاوند کی بیٹھن پر گزر کر اہمیتی قہمی اور دھوکروں کے مکان میں سکونت پذیر تھی۔ شادی کے شروع کی دنوں میں اس کی بیوی نے انتہائی فرماں برداری سے کام لیا اور اس کا ہر کام فہم فہم کر کرتی رہی۔ لیکن جیسے ہی اس نے محلے میں کچھ تاپندہ عورتوں کے ساتھ میل جول شروع کیا ویسے ویسے اس کی عادات اور رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اب وہ بات بے بات رشید سے جھگڑتی لگتی اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ کوئی بھوکھ شیر ہو جو کسی بھی لمحے موقع ملنے ہی اسے چر چھا کر ہڑپ کر جائے گی۔ اور سچ بات تو یہ تھی کہ رشید بھی کبھی کبھی اس کے سلوک سے خوف زدہ ہو جاتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لیتا۔

لیکن آج تو حد ہو گئی اور اس کا گھر ماتم کردہ بنا ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ اپنا سر پکڑے گھر کی دلیز پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوں رہا تھا اسے یوں زبیں پر بیٹھے دیکھ کر وہ دھنوں جھگڑتا بند کر کے لپک کر اس کی طرف بھاگیں اور اس کی ماں نے دایا چاہتے ہوئے اسے پکڑ کر زبیں سے اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اس کی پیشانی مسلتے لگی۔ کوڑ پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی بھوکھ کوٹنے دینے لگی۔ بعد میں رشید کو سہارا دیتے ہوئے اندر کمرے میں بڑے ایک روٹنی پٹنگ پر لٹا دیا۔ اس کے لیٹنے ہی اسنے دوپٹے کو ایک گولے کی شکل دے کر منہ سے پھونک مار کر گرم کیا اور جلدی سے اسے اس کی پیشانی سے لگا دیا۔

رشید درو سے تریبہ ہاتھ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بندوق اٹھائے اور دو گولیاں اپنی بیوی کے سینے میں داغ دے

تا کہ ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن ایسا وہ صرف سوچ سکتا تھا اور عملاً ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ ماں کے ہاتھ سے گرم پکڑے کی گھر سے اسے کچھ سکون ملا اور اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ اسے سوتا دیکھ کر اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ محن میں بیٹھی سبزی بیاری تھی کہ اس کے گاؤں سے ایک عورت ملنے اس کے گھر آئی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی اور فکر مند دیکھ کر اس نے اس کی خبریت جانتا چاہی تو جیسے وہ کب سے بھری بیٹھی تھی کہ ہمدردی کے دو بول سنتے ہی اس نے روتے روتے تمام حالات تفصیل سے اسے بتا دیے۔ وہ عورت جیسے جیسے اس کے منہ سے باتیں سنتی جا رہی تھی ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی رام کہانی سن کر اس نے اسے شاہ بابا سے ملوانے کہا۔

"شاہ بابا!..... کیون ہے؟ رشید کی ماں نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔" شاہ بابا..... ایک بہت بچھے ہوئے بزرگ ہیں جو بھی اپنا دکھان کے پاس لے کر جاتا ہے وہ اس سے بہت فائدہ حاصل کر کے لوٹتا ہے اس کے قبضے میں موکل ہیں جن کی مدد سے وہ بگڑے کام سنوارتے ہیں اور دھمی لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو ان سے مل کر اپنا مسئلہ بیان کر دو اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے۔" اس عورت نے تفصیل بتائی۔

"لیکن میں ان سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہوں؟"..... رشید کی ماں نے جواب پوچھا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو ان سے ملنے کی ذمہ داری تم پر چھوڑ دو میں ایک دوبارہ ان سے مل چکی ہوں اور میرے ساتھ تم با آسانی ان سے مل سکتی ہو۔ تم جب چاہو میں تمہیں ان سے ملوانے لے جا سکتی ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر یونہی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے آپس میں شاہ بابا سے ملاقات کا وقت طے کیا اور بعد میں وہ عورت اس سے رخصت ہو گئی۔

☆.....☆

اس کی نظر جیسے ہی نمودار ہونے والے افراد پر پڑی اس نے فوراً جنگل کی جانب دوڑ لگا دی۔ غالباً وہ اسنے سارے افراد اور شور سن کر گھبرا گیا تھا اس لئے بھاگنے میں ہی عافیت بھی لاورد دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان میں سے دو تین افراد شور مچاتے اس کے پیچھے دوڑے لیکن پھر اپنے پیچھے سے واپس بلائے جانے کی آواز سن کر واپس پلٹ گئے۔ برگد کے درخت کے نیچے آڑے ترے تھے انداز میں پڑے بچے کو دیکھ کر وہ جلدی سے اس کی جانب بڑھے پہلے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہو لیکن پھر ایک آدمی نے جب اس کی بغض پر ہاتھ رکھا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہندی وہ زندہ تھا اور صرف بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ دو افراد نے اسے اٹھایا اور تیزی سے گاؤں کی جانب جانے والے راستے پر چل دیے۔

گاؤں میں ابھی تک ستارہ گھر میں کھرام مچا ہوا تھا بچے کے والدین پر خوش طاری تھی اور سارا محن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کا نمبر دار بھی کچھ محاذ فظوں کے ساتھ وہیں موجود تھا اور اس کے والدین کوسلیاں دے دے تھا۔ لیکن اسے اپنے بچے کا کھوکھلا پن واضح محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس خوشی عفریت کے سامنے بے بس تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ باہر سے شوراٹھا اور ایک آدمی تیزی سے بھاگتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے سے نکل کر محن میں آن پہنچا۔ اس کے منہ سے خوشی کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی کچھ برسائیں بحال کرنے کے بعد جب اس نے یہ بتایا کہ جنگل کی طرف سے کچھ افراد ہاتھوں میں بچے کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں تو یہ سن کر بہت سے لوگ بھاگ کر گھر کے باہر جمع ہو گئے اور بچے جیسی تن کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر انہیں چاند کی دودھیا روشنی میں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر وہ سب نظر آ گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان کے نزدیک پہنچ گئے انہوں نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ ایک بچے کی مانند ان کی ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ محن میں داخل ہوتے ہی ان کے لئے ایک چار پائی بچھادی گئی تھی جس پر انہوں نے بچے کو لٹا دیا۔

کچھ افراد بچے کے والدین کو ہوش میں لانے کی

کوشش میں ان کے منہ پر پٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہے تھے اور پھر چند ہی لمحوں کی محنت سے انہیں ہوش آ گیا اور جیسے ہی انہیں اپنے بچے کی واپسی کا پتہ چلا وہ خوشی سے لہراتے اپنے بچے کے پاس پہنچ گئے لیکن بچے کو بے حس و حرکت دیکھ کر خوف زدہ نظروں سے نمبردار کو دیکھنے لگے۔ نمبردار کو جنگل سے آنے والے افراد نے پہلے سے ہی سب کچھ بتا دیا تھا کہ خوف کی وجہ سے بچے بے ہوش ہے۔ نمبردار نے انہیں تسلی دلی اور ایک شخص کو گاؤں کے حکیم کی طرف دوڑا لیا۔ تمیزی ہی دیر میں حکیم اپنا تھیلا سنبھالے نمودار ہوا۔ آتے ہی حکیم نے اس بچے کی بغض ٹٹولی اور سر ہلاتے ہوئے تھیلے میں سے ایک پڑیا نکالی جس میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ اس نے پانی منگوایا اور پڑیا میں موجود تمام سفوف بچے کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دیا اور ساتھ ہی تموزا سا پانی بھی منہ میں ڈال دیا۔ پھر دو منٹ تک اسے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔

ابھی اسے منہ بند رکھے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے بچے نے ایک زوردار جھرجھری لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اپنے آس پاس ہجوم دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تھکتا ہے سے دوبارہ چار پائی پر گر گیا۔ اس کی والدین نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ چار پائی پر لٹا دیا۔ اسے ہوش میں دیکھ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ لوگ بعد تھے کہ ابھی اسلحہ لے کر دوبارہ جنگل کی طرف چلایا جائے اور اس درندے کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ وہ دوبارہ گاؤں میں داخل نہ ہو سکے۔

لیکن نمبردار نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا کیونکہ اتنی رات گزر چکی تھی اور ان حالات میں جنگل میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس درندے کے چکر میں وہ لوگ اپنا کوئی نقصان کروائیں۔ پھر یہ فیصلہ طے پایا کہ صبح دن کے اجالے میں جنگل کی طرف نکلا جائے اور اس موذی درندے کو تلاش کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی نمبردار کے کہنے کے بعد تمام افراد اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

ہفتہ کے روز رشید کی ماں اپنے بیٹے کو گاؤں میں ایک ضروری کام کا کہہ کر گھر سے نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گاؤں جانے والے راستے کے موڑ پر پہنچی تو اسے ایک تانگہ مل گیا۔ گاؤں شہر سے لگ بھگ ڈیڑھ کلومیٹر کے مسافت پر تھا آبادی زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی شرک ہونے کی وجہ سے اس طرف صرف تانگے ہی چلتے تھے اور کوئی موٹر کار یا رکشہ وغیرہ نہیں چلتے تھے۔ کبھی سرک ہونے کی وجہ سے تانگہ بڑے آرام آرام سے چل رہا تھا۔ تانگہ میں اس کے علاوہ مزید تین سوار ہیں اور ان میں ایک بوڑھا شخص اور خالبا اس کی بیوی ہوگی جس کی عمر تقریباً پچیس سال کے قریب ضرور ہوگی ان کے ساتھ ایک چھوٹی بچی بھی بیٹھی تھی جس کی عمر دیکھنے میں سات سال کے قریب ہوگی وہ اپنے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی گڑیا پکڑے کھیلنے اور باتیں کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

ہفتہ کے روز رشید کی ماں اپنے بیٹے کو گاؤں میں ایک ضروری کام کا کہہ کر گھر سے نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گاؤں جانے والے راستے کے موڑ پر پہنچی تو اسے ایک تانگہ مل گیا۔ گاؤں شہر سے لگ بھگ ڈیڑھ کلومیٹر کے مسافت پر تھا آبادی زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اور کبھی شرک ہونے کی وجہ سے اس طرف صرف تانگے ہی چلتے تھے اور کوئی موٹر کار یا رکشہ وغیرہ نہیں چلتے تھے۔ کبھی سرک ہونے کی وجہ سے تانگہ بڑے آرام آرام سے چل رہا تھا۔ تانگہ میں اس کے علاوہ مزید تین سوار ہیں اور ان میں ایک بوڑھا شخص اور خالبا اس کی بیوی ہوگی جس کی عمر تقریباً پچیس سال کے قریب ضرور ہوگی ان کے ساتھ ایک چھوٹی بچی بھی بیٹھی تھی جس کی عمر دیکھنے میں سات سال کے قریب ہوگی وہ اپنے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی گڑیا پکڑے کھیلنے اور باتیں کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

کوچان چاک لہراتے ہوئے گھوڑے کو کبھی سرک پر دوڑانے کی ناکام کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن گھوڑا بھی شاید اس کی فطرت سے واقف تھا اس لئے چاک کھانے کے باوجود پرواہ کئے بغیر اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تانگہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف کبھی کبھی اس چھوٹی بچی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دیتی تو لمحہ بھر کے لئے خاموشی کا پردہ چاک ہوتا اور پھر یک لخت خاموشی چھا جاتی۔ تانگے کو چلنے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا اور وہ بس اب گاؤں کے نزدیک پہنچنے ہی والے تھے۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کے کچے مکان نظر آنے لگے اور دور کھیتوں میں کہیں کہیں عورتیں اور مرد کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ تانگہ گاؤں کی مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے آن کرک گیا۔ دروازے پر ٹاٹ سے بنا پردہ لٹک رہا تھا جس میں جا بجا چھید نمایاں تھیں۔ رشید کی ماں نے تانگہ دیکھتے ہی اپنے دوپٹے میں بندھے پیسے کھولے اور ان میں سے تیس روپے نکال کر کوچان کے ہاتھ میں دے کر تانگے سے اتر گئی۔ اس کے اترنے ہی تانگہ آگے بڑھ گیا۔ اور کچھ ہی لمحوں میں اس کی نظروں سے بوجھل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے پہنچنے ہی اس نے پردہ ہٹا کر

جس پر بندے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ وہ دونوں چلتی ہوئیں اس بغیر دروازے کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ایک کپڑے رنگ کا لنگوٹ باندھے بیٹھا تھا اس کے مٹی سے اٹے ہال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی کے بال بھی اٹکھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کے خاتون میں بھرا میل دیکھ کر کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ رشید کی ماں تو شاید تصور میں کسی نورانی بزرگ کا حلیہ بنا کر آئی تھی لیکن اب اس شاہ بابا کو دیکھ کر اسے بڑی حیرانی ہوئی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے لیکن پھر اس نے یہ سوچا کہ اس کے ساتھ آئی ہوئی عورت برا محسوس نہ کرے اس لئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ وہ بوڑھا شخص مراقبہ کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا پھر یکدم جھرجھری لپٹے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ہمیں کی طرح موٹی موٹی آنکھیں جن کا رنگ گہرا سرخ ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے ان میں خون اتر ا ہوا ہو بڑا ہیسا ایک منظر پیش کر رہی تھیں جن کی طرف دیکھ کر خوف خاوری ہوتا تھا۔

وہ سب سے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ "ہوں!..... تو یہ وہ بد نصیب ہے جو اپنی بہو کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہے؟"۔ بوڑھے نے اس کے ساتھ کھڑی عورت سے سوال کیا۔

"ہاں! شاہ بابا..... ہمیں وہ بد نصیب عورت ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا اور جس کی زندگی اس کی بہو نے اجیرن کر رکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا بیٹا بھی اس کے ہاتھوں بہت تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس لئے میں اسے یہاں لائی ہوں تاکہ اس کو کوئی توبہ وغیرہ دیں جس کے استعمال سے اس کا اپنی بہو سے پچھا چھوٹ جائے"۔ اس عورت نے تفصیل بتائی۔

"ٹھیک ہے صرف تمہارے کہنے پر میں اس کا کام کروں گا لیکن اسے یہ تو بتادیا ہے کہ میں اس کام کے پیسے نہیں لیتا لیکن میری صرف یہ شرط ہے کہ یہ اس مندر میں موجود چوڑے پر رکھے گل دان میں دروازے تک مسلسل نیلوفر

یعنی کنول کے پھول رکھے گی۔ اور اگر اس نے ذرا بھی لاپرواہی یا سستی کی تو اس سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اگر اسے یہ شرط منظور ہو تو میں آج بلکا بھی اس کا کام شروع کر دیتا ہوں۔ اور ٹھیک تین روز بعد اس کی بہو خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔"۔..... بوڑھے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر یوں خواہش چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے سامنے کسی بھیڑ کے بچے کو دیکھ کر دوپٹے کے لئے بے چین ہو۔

رشید کی ماں سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی اس لئے وہ اس کا محسوس چہرہ نہ دیکھ سکی۔ اس کی کچھ بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اس پر تو بس سبکی دامن سوار تھی کہ کسی طرح اس کا پچھا اپنی بہو سے چھوٹ جائے اور وہ سکون سے اپنی زندگی گزارے۔ اسے یوں لگا تھا جیسے دیکھ کر اس کے ساتھ والی عورت نے شاہ بابا سے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہا اور اس کی بات کا جواب ہاں میں دیتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ایک توبہ جھٹ لیا۔ گھر سے نکلتے ہی اس نے اپنی لچھے دار لنگوٹ سے رشید کی ماں کو ششے میں اتارا اور پھر وہ توبہ اس کے مٹی میں پکڑاتے ہوئے اس کو استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں بند ہوئے اسے تقریباً دو گھنٹوں سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تھا اور بھوک سے اس کے پیٹ میں چوہہ دوڑ رہے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اسے تہ خانے میں بند کر کے بھول گیا ہو۔ کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ سامنے اسے بیٹھے چند مٹی ہوئے تھے کہ اس کا ایک ایک دیوار میں پتلی کی لکیر بننے لگی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت آہستہ سے اس میں کسی تیز دھار آلے کی مدد سے درز بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ دیر سے دیر سے لکیر موٹی ہوئی تھی گئی اور پھر اس قدر چوڑی ہو گئی کہ اسے دوسری طرف کا متغیر نظر آنے لگا۔ وہ بڑے غور سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔

تقریباً تین انچ تک دیوار سر کے بعد دو بیسایک ہاتھوں نے مخالف انداز میں دیوار کو پکڑا اور



آپا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا جب اٹھارہ افراد کا ایک دستہ ہاتھوں میں رائفلیں اور ٹارچوں کے لئے جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چل رہے تھے۔ یہ سب اسی مشاعرہ گاؤں کے افراد تھے جہاں گزشتہ شب ایک انسانی درندے نے ایک بچے کو اٹھالیا تھا لیکن گاؤں والوں کی ہمت اور بہادری کی وجہ سے وہ بچہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس وقت زندہ سلامت اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر میں موجود تھا۔

رات بچائیت میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ صبح ہوتے ہی اس انسانی درندے کو جنگل میں جا کر تلاش کیا جائے اور اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ پھر بھی وہ دوبارہ گاؤں میں آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور اسی نتیجے میں آج صبح وہ سب گاؤں کے نبرداری سربراہی میں اسلحہ سے لیس ہو کر جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کاتھسوں کی پیشیاں انہوں نے اپنی اپنی کمرے سے باندھ رکھی تھیں۔ اور کسی خطرے کے پیش نظر کہ کہیں انہیں جنگل میں رات نہ ہو جائے انہوں نے ٹارچوں بھی پکڑیں ہوئی تھیں۔ یہ تقریباً چار یا پندرہ قریب پھیلا ہوا جنگل تھا جس میں جا بجا سفیدے اور سنبل کے درخت تھے۔

گنجان ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں درختوں میں سے سورج کی روشنی زمیں پر پڑ رہی تھی۔ درندہ ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ درختوں پر چھپاتے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ چونکہ قریب کا جنگل تھا اس لئے کبھی کبھی انہوں نے یہاں کوئی خونخوار جانور یا درندہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن گزشتہ رات اس انسانی درندے کی آمد نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ درندہ کہاں سے آیا ہے اور اب بھی جنگل میں موجود ہے یا راتوں رات کہیں اور چلا گیا ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب تو انہیں اسی وقت ہی مل سکا تھا جب وہ جنگل کے اندر جا کر اسے تلاش کرتے۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے وہ جنگل کے کنارے کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ زمیں بھی ہونے کی

مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ ہاتھوں کے ناخن لمبائی کی وجہ سے مڑ گئے تھے یہ منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے خوف کے بارے میں چیخ نکلی۔ اس کے اچانک چپختے سے کمرے کی خاموشی میں بھونچال آگیا۔ اور اس کی چیخ کی بازگشت کالوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ اس کا اس طرح چپختا اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اور ایک سخت وہ دونوں ہاتھ دو بارہ دو بارہ کے دوسری طرف غائب ہو گئے اور دو بارہ پھر سے برابر ہو گئی۔ وہ جو خوف سے اپنی آنکھیں بند کئے چیخ جا رہی تھی۔

جب اس نے کافی دیر تک یہ محسوس کیا کہ اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے تو اس نے یکدم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرے کی چاروں دیواریں پہلے والی حالت میں تھیں اور وہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی روح موجود نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ چٹائی پر بیٹھ گئی۔ بھوکے پیٹ ہونے کی وجہ سے اس پر فضا بہت طاری ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ لہرائی ہوئی فرش پر ہی ڈیر ہو گئی۔ اس کے ذہن پر گرتے ہی سانس کی دیوار میں ایک اچانک ایک دروازہ نمودار ہوا اور مرغن پر پائے جانے والی مخلوق سے ملتی جلتی شکل کے دو بونے آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور جلدی سے آڑھی ترچھی پڑی صغرائ کو خاموشی سے اٹھایا اور دیوار میں نمودار ہونے والے دروازے میں سے لے کر نکل گئے۔

دیران مندر میں نہ جانے کیسے کیسے اسرار چھپے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور خالی مکان بھی شیطانی رگوں کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مندر کافی عرصہ سے دیران پڑا ہوا تھا اس لئے اس میں بھی بہت سی خبیثت رگوں نے ڈیرے جھالائے تھے۔ جن کے اثرات آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ لیکن سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کسی کو کسی کے کرتوتوں کے بارے میں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایسا کیسے ممکن تھا یا اس مندر میں پائے جانے والی کوئی بھول بھلیوں کا کوئی کمال تھا۔ کہ وہ سب ایک دوسرے کے سامنے نہیں

جہ سے انہوں نے سوچا کہ شاید اس درندے کے قدموں کے نشان انہیں مل جائیں تاکہ ان پر چلتے ہوئے انہیں اس کا کوئی سراغ مل جائے لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ کبھی زمیں ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف جانوروں اور انسانوں کے قدموں کے نشان گزرتے ہوئے رہتے تھے اس لئے ان میں یہ پہچان کرنا تقریباً ناممکن لگ رہا تھا کہ اس درندے کے نشانوں کو پہچانا جائے۔ اس پر وقت ضائع کرنے کے بجائے انہوں نے دائیں طرف دکھائی دیئے جانے والے ایک کھدائے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

وہ راستہ سیدھا جنگل کے اندر کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کافی عرصہ تک کسی نے اس پر سفر نہیں کیا ہو کیونکہ اس پر بھی ہوئی مٹی اور دھول کی چیخ بچ کر بتا رہی تھی کہ اسے ابھی تک کسی انسان یا جانور کے قدموں نے نہیں چھوا۔ وہ بڑی حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے انسانی عقل سے بالاتر بات تھی جو اپنی پوری سچائی کے ساتھ ان کے سامنے تھی۔ کیونکہ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قافلہ یہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہرا ہو لیکن اس کے ساتھ جڑے ہوئے راستے کو دیکھ کر وہ سب حیرت سے آنکھیں پھاڑے۔ وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک بت بنے رہنے کے بعد نبرداری آواز سنتے ہی وہ سب سکتے کی کیفیت سے باہر آ گئے۔ نبرداری انہیں آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا اس کی بات سنتے ہی وہ سب اس راستے کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

رشید کی ماں اس عورت سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ تاکہ پڑ کر گھر واپس لوٹ آئی تو عویذ اس نے دوپٹے کے ساتھ باندھ لیا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ عید میں اپنے کمرے میں گئی اس کی بہو شاید باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی اس لئے اس نے اسے اندر آتے تو دیکھ لیا تھا لیکن وہ آتی ہی اندر کمرے میں کیوں گھس گئی تھی اس پر فوراً نہیں کیا۔ کمرے میں داخل ہوئے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے عویذ کو کھول کر صندوق میں رکھ دیا۔ اور خاموشی سے وہاں آ کر گھس گئی۔ کچھ تھکتے ہوئے تھی۔ کسی کو کالوں کا کان

خبر نہ ہوئی کہ وہ گاؤں میں کیا لینے گئی تھی۔ پہلے تو رشید کی ماں نے سوچا کہ اکیلے ہی اس کا کام کو سر انجام دے لے لیکن وہ چونکہ ایک عورت کی اور شاہ بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے یہ تعویذ ایک پرانے قبرستان میں موجود بہت پرانی قبر پر رکھے ہوئے چلتے چرائے کے تیل میں ڈبوئے تھا۔ اور پھر دس منٹ تک وہیں بیٹھ کر چرائے میں ڈوبے ہوئے تعویذ کی طرف دیکھتے رہتا تھا۔ تاکہ چرائے بجھ نہ جائے ورنہ اس کا اثر بے کار ہو جائے گا خطرہ تھا۔ یہ بات بھی اسے اس عورت کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ وہ سخت پریشانی میں سوچ رہی تھی کہ اس کام کے لئے اسے کس کو اعتماد میں لے ایک بار تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بیٹے رشید سے مشورہ کرے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہ اس کام کے لئے ہرگز راضی نہ ہوگا اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔

خیالوں کی خیالوں میں وہ اپنے محلے میں کسی ایسے شخص یا بچے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو کچھ رقم کے عوض اس کے ساتھ قبرستان میں جا کر اسے یہ کام سر انجام دینے میں مدد دے سکے۔ ابھی وہ اسی مشل وچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ یکدم جمبا کے کی طرح ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا اور اسے ٹیکے موٹی کا چہرہ سامنے نظر آنے لگا۔ اس کی جوان بیٹی کی شادی نزدیک تھی اور ابھی پچھلے ہی دنوں جب وہ اپنی چہل چڑوانے اس کے پاس گئی تھی تو باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا تھا کہ اسے بیویوں کی سخت ضرورت ہے اور اس نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے ایک بڑی پتی خریدنی ہے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے تھے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے ٹیکے موٹی کو اس کام کے لئے راضی کرنے کا سوچا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ اس کے بہو نے اس کے سامنے روٹی یوں لاکر رکھی جیسے جیل میں قیدیوں کو کھانا دیا جاتا ہے۔ اس نے خون کے گھونٹ بھرے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور روٹی کی پیگھر میں رکھی روٹی کھانے لگی۔ وہ دل میں اس سے بچھا چھڑانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

و دلچسپ سنگھ بہت خوش تھا کیونکہ ٹھیک دو دن بعد اس کی شادی اپنی پسند کی لڑکی پریت کو رہے ہوئے والی تھی۔ پریت کو وہاں کہ ایک کھیا دار سنگھ کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی دو اور بہنیں اور تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہوجی تھیں۔ اور بہت آسودہ زندگی گزار رہی تھیں اور اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں۔ کوئی بھائی تھا نہیں اس لئے چھوٹی ہونے کے ناٹے پریت کو ان سب میں لاڈلی تھی۔ خاندان بھر کے سب افراد اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے نہ جھکتے تھے۔ بھگوان نے اس کے نین نقش اور رنگ روپ بھی ایسا دیا تھا کہ جو بھی اسے ایک بار دیکھتا مس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اتنے حسن کی بدولت بھی پریت کو بہت بااخلاق اور حیا دار لڑکی تھی۔ خاندان بھر کے وہ افراد بھی جنہیں کبھی اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس کی پاکدامنی کی تسنیں کھاتے تھے۔ اس میں شک والی کوئی بات نہ تھی کیونکہ پریت کو حقیقت میں ایک بہت معصوم اور پاکدامن لڑکی تھی۔ اس کی انہی اچھائیوں کی بدولت خاندان بھر میں ہر کوئی اسے اپنی بہو بنانے کا خواہشمند تھا۔

بہت سے لوگ تو اس سلسلہ میں کئی بار رشتے بھی بھجوا چکے تھے۔ جن میں بہت سے ڈاکٹر، انجینئر اور بزنس مین بھی تھے لیکن کہتے ہیں تاکہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اس لئے ہر بار کوئی نہ کوئی روکاوٹ کھڑی ہو جاتی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ہی یا تو سوچنے کا وقت مانگ لیا جاتا یا پھر فوراً انکار کر دیا جاتا۔ دن یومی ہی کر رہے تھے کہ ایک دن گاؤں کے کھیا دار سنگھ کے گھر سے ان کے بیٹے دلچسپ سنگھ کا رشتہ آیا۔ دلچسپ سنگھ کہنے کو تو ایک مرد تھا لیکن اس کی ادائیں لڑکیوں سے بھی کہیں زیادہ تھیں وہ اس طرح شرماتا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن کھونٹھٹ میں شرماتی ہے۔ انتہائی پاکر اور باحیا لڑکا تھا۔

گاؤں میں ہر کوئی اس سے دوستی کا خواہشمند رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس سے شادی کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن اس نے کبھی بھی ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گاؤں کی تمام لڑکیوں کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا سوائے پریت کو کہ۔ پریت کو وہ اسی لڑکی تھی جسے وہ چاہتا تھا

اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پریت کو کبھی یہ احساس تک نہ ہوا تھا کہ کوئی اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے۔ ایک بار گاؤں میں بیساکھی کا میلہ تھا جس میں آس پاس کے گاؤں سے بہت سے افراد جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی تھے میلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہ میلہ ہر سال ان کے گاؤں رام گڑھ میں لگتا تھا یہ پورے تین دن ہوتا تھا اور خوب خوب رونقیں لگی رہتی تھیں۔ مختلف قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں کے اشال لگتے تھے جن پر کچی رنگ برنگی مٹھائیاں اور چیزیں لوگوں کا دل بھاتی اور وہ انہیں خرید کر اور کھا کر مزے کرتے۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے جاتے جن پر مناسب ٹکٹ ہوتے تھے تاکہ ہر فرد اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس کے ساتھ وہاں کھوار بازی اور کشتی کے مقابلے بھی ہوتے جن میں کامیاب ہونے والے بہادروں کو گاؤں کا کھیا دار سنگھ خصوصی انعامات سے نوازتا۔ اور مقابلوں میں ہارنے والوں کی جگہ ہسانی ہونی اور وہ دوبارہ اس گاؤں میں آنے کا تصور بھی نہ کرتے۔

گاؤں کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن کی روزی کا ذریعہ زمین باڑی تھا۔ بہت سے گھرانے کھیا کی زمینوں پر کام کاج کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ کھیا چونکہ ایک نیک دل انسان تھا اس لئے گاؤں کے ہر دکھ درد میں بھرپور ساتھ دیتا اور کبھی بھی کسی ضرورت مند کو اپنے گھر کی دالین سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس سے بہت خوش تھے اور ہمیشہ اس کی لمبی زندگی اور صحت کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ گاؤں کے کھیا نے اس بار بھی بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا بندوبست کیا تھا جس میں شرکت کے لئے اس نے آس پاس کے گاؤں کے تمام ہر بچوں کو دعوت نامے بھجوا دیے تھے تاکہ وہ انہیں پڑھ کر اپنے اپنے گاؤں کے افراد کو اس میلہ میں شرکت کے لئے کہہ سکیں۔ جھولے والوں اور مختلف اشال لگانے والوں کو حسب دستور ہمیشہ کی طرح پیغامات بھجوا دیے گئے تھے تاکہ وہ اپنی اپنی تیاریوں میں لگ جائیں اور کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو پائے۔ اس میلے میں ہر آدمی کی دلچسپی کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا اور اپنے طور پر کھیا نے کچھ

افراد کو چکیداری کی ذمہ داری بھی سونپی ہوئی تھی تاکہ وہ اس میلے میں کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کو جنم لینے سے پہلے ہی چل دیں۔ اس بار میلے میں دلچسپ سنگھ نے بھی کھوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینا کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو تارا سنگھ کو کہہ دیا تھا اور اسے اس کی اجازت آسانی سے مل گئی تھی کیونکہ تارا سنگھ کو اس کی مہارت کا بخوبی اندازہ تھا ایسا پہلی بار ہونے جا رہا تھا کہ دلچسپ سنگھ کھوار بازی کے مقابلے میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ نہ پہلے وہ صرف دیکھنے کی حد تک ہی ان مقابلوں میں شرکت کرتا تھا اور جیتنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

دوسری جانب پریت کو رانی بہنوں اور چند سہیلیوں کے ساتھ اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنائے۔ چھٹی تھی اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو سے اجازت بھی مانگ لی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے بیساکھی کے میلے کا انتظار کر رہی تھی۔ تین دنوں کی مناسبت سے اس نے مختلف لباس بنائے تھے جسے دیکھ دیکھ کر اس کی دیگر بہنیں رشک کر رہی تھیں وہ سب حقیقت میں اس کی دیوانی تھیں۔ انہیں اپنی بہن پریت کو سے بننا انتہائی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ باقاعدگی سے اس سے ملنے اپنے میکے آتی رہتی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان سب نے مل کر اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر ایک دن صبح کا سورج نکلنے لگا تو گاؤں میں شور مچا ہوا کہ میلے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ ہر لوگ تیل گاڑیوں، اور مختلف سواروں پر سواریاں گڑھ کی جانب رواں دواں تھے۔ بہت سے افراد پیدل ہی سفر کے لئے نکل پڑے۔ رام گڑھ چونکہ تین کلومیٹر تھا اس لئے اتنا فاصلہ پیدل طے کرنا گاؤں کے لئے معمول کی بات تھی اس لئے وہ خوش چہرے ہیں میں معروف میلے کی جانب جا رہے تھے۔ پریت کو کہنے کے لئے اس کے باپو نے ایک بہترین سواری کا بندوبست کر دیا تھا جس میں ایک شاندار کبھی شامل تھی۔ وہ سب اس وقت خوش چہرے ہیں میں معروف کبھی میں سواریاں گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کبھی دھیمے دھیمے قدموں سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تقریباً آدھا

مختص مسلسل سفر کرنے کے بعد وہ رام گڑھ پہنچ گئے۔ گاؤں میں بہت رش تھا۔ مختلف قسم کے کھانے پینے کے اشال لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب بہت بڑا کھانا بنایا گیا تھا جو کہ وہاں کے سر بچوں اور کھیاؤں کے لئے تھا۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے گئے تھے۔ کبھی کو ایک جانب کھڑا کر کے وہ سب اس سے اتر کر ایک جانب بے ہوئے ایک حویلی نما گھر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس حویلی میں اس کے باپو کے پرانے جانے والے رہتے تھے جب بھی گاؤں میں بیساکھی کا میلہ لگتا تھا تو وہ یہیں آن کر ٹھہرتے تھے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے اور تیار ہونے کے بعد وہ سب مل کر میلے میں نکلے تھے۔ حویلی کے کینوں کو ان کے آنے کی خبر پہلے ہی کر دی گئی تھی اس لئے ان کے وہاں پہنچنے ہی اس کے کین ان کے استقبال کے لئے آگئے۔ انہیں بھجائے کھڑے تھے۔ پریت کو کے باپو ہر سال اس حویلی کے کینوں کو سال بھر کا راشن ڈلوایا دیتے تھے جس میں چاول، گندم، مختلف قسم کی دالیں اور دس کئی شامل ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ سب پریت کو کے باپو کے احسان مند تھے۔ اور بدلے میں جب بھی میلے میں پریت کو اور اس کے دیگر عزیز واقارب کی شرکت ہوتی تو وہ بھی ان کی خاطر مددات میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دیتے اور دل کھول کر ان کی خدمت کرتے اور اس طرح وہ ان کے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتے۔ پریت کو نے انہیں کبھی بھی ان کی حیثیت کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھی کیونکہ اس کی ذمہ داری طبیعت اور معصومانہ پن اس بات کا تین ثبوت تھا۔

شام ہو گئی تھی اور کچھ دیر تک حویلی میں سستانے کے بعد وہ سب میلے میں سیر و تفریح کے لئے نکل پڑے۔ میلہ لوگوں سے کھینچا بھر پڑا تھا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ سب گھومتے گھماتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے جا رہے تھے اور پھر ایک ایسے پنڈال کے سامنے جا کر رک گئے جہاں بہت سے لوگ ٹھہرا بنائے کھڑے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اگلی کچھ ہی دیر میں وہاں کھوار بازی کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے جس میں آس پاس کے بہت سے گاؤں

کے سورما حصہ لے رہے تھے جن میں کچھ لوگ دلچیت سنگھ کا نام بڑے ادب اور فخر سے لے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دلچیت سنگھ پاس کے گاؤں کے کھانا تیار سنگھ کا بیٹا تھا اور تلوار بازی میں اپنا جانی نہ رکھتا تھا۔ ان کی باتوں نے انہیں تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اور انہوں نے وہیں ایک جگہ بیٹھ کر مقابلہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ابھی انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک جانب سے شور اٹھا اور لوگوں کے جھرمٹ میں دس بارہ لمبے ترنگے افراد ہاتھوں میں تلواریں اٹھائے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ تلواروں کی دھار دھوب نہ ہونے کے باوجود خوب چمک رہی تھی جیسے کسی قسم کی تلواریں تھیں۔ وہ سب تلواروں کو اپنے ہاتھوں میں لہراتے بہت پر جوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے پنڈال میں پہنچتے ہی ڈھول والوں نے زور شور سے اپنے ڈھول پٹنے شروع کر دیے اور پھر ایک جانب سے بگ کی بھاری آواز گونجی جسے سنتے ہی پنڈال میں نظر آنے والے تمام افراد وہاں سے ہٹ گئے۔

باقی رہ جانے والوں میں صرف دس بارہ افراد ہی رہ گئے جنہوں نے مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ پھر سر پنچوں کے رومال لہراتے ہی دو افراد اچھل کر پنڈال میں بنے ایک دائرے میں داخل ہو گئے اور ایک دوسرے کو خوشنظر دلوں سے دیکھتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے اور چونکہ دونوں ماہر تھے اس لئے دونوں کو کافی زخم آئے تھے۔

مسلسل ایک گھنٹہ تک لڑنے کے بعد دونوں تھک ہار کر زمین پر گر گئے اور اس طرح ہارجیت کا فیصلہ کن بغیر یہ مقابلہ برابر رہا۔ یکے بعد دیگرے سورما بھی پنڈال میں آتے رہے اور اپنے اپنے داؤد آزما رہے۔ ان میں سے دو سورما کامیاب رہے اور سر پنچوں نے انہیں فاتح قرار دیتے ہوئے نقد انعامات کا اعلان کر دیا۔ اعلان سنتے ہی کامیاب سورما کامیابی کے نشے میں دھست چلے گئے اور ہاں لوگوں کو بزدلی کا طعنہ دینے لگے اور لڑاکار نے لگے کہ بھری پنڈال میں اگر کوئی مرد کاچہ ہے تو ان کے سامنے آئے اور انہیں شکست

دے کر دکھائے۔

لیکن تمام افراد تو یوں کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ابھی انہیں لڑاکار تے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک خور بدو جوان جس نے بڑا نہیں لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی ہاتھ میں تلوار پکڑے پنڈال میں داخل ہوا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر لڑاکار مارتے دونوں سورما چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جوان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آن کر رک گیا اور مخاطب ہوا۔ "..... تم میں دونوں کو پہنچ کرنا ہوں کہ اگر تم دونوں مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو میں دو بیگھہ زمین تم دونوں کے نام لکھ دوں گا اور اگر تم دونوں ناکام رہے تو تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سر کے پال موٹر دھو گے اور دوبارہ بھی اس گاؤں میں نہیں آؤ گے۔"

دلچیت سنگھ نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "..... اس کی یہ بات سن کر وہ دونوں ہنس پڑے انہیں اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ وہ جوان چند منٹ ہی ان کے سامنے نہیں ڈٹ سکے گا۔ یہ وہ جوان دلچیت سنگھ تھا جو پہلے ہی تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ان دونوں سورماؤں کی باتیں سن کر جوش میں سیدھا پنڈال میں داخل ہو گیا تھا۔ سر پہ جو مقابلہ ستم سمجھ کر پہنچا ہے اسے اپنے والے تھے کہ ایک وہ جوان کو پنڈال میں جاتے دیکھ کر دوبارہ اپنی اپنی نشست پر براجمان ہو گئے تھے لیکن اتنی دور سے انہیں ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن ان کے انداز سے یہ ضرور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بات پر بحث کر رہے ہیں اور پھر کچھ ہی دیر میں ان دونوں نے آگے بڑھ کر اپنی اپنی تلواریں فضا میں لہرائیں اور یکدم اس وہ جوان پر حملہ آور ہو گئے ان کے تیور دیکھتے ہی اس وہ جوان نے بھی جلدی سے اپنی تلوار سنبھالی اور دارو کارو کا نعرہ فضا میں بلند ہوا اور ہلکی کی کوندہ کی مانند اس کی تلوار چمکی اور ایک ہی وار میں ایک سورما کی تلوار لکڑی کی طرح آدھی کٹ کر ایک جانب گر گئی اور آدھی تلوار دسے سمیت اس کے ہاتھ میں موجود تھی جسے وہ حیرت سے کبھی اسے دیکھتا اور کبھی زمین پر پڑی تلوار کے ٹکڑے کو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے منوں زونی تھوڑا اس کی کلائی پر مار دیا ہو۔ کچھ لمحوں تک تو کسی کی سمجھ میں بھی یہ نہیں آیا کہ کیا ہوا لیکن معاملہ بھاپتے ہی فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ سورما کے پاس چونکہ اب لڑنے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھتے ہی دوسرے سورما نے زوردار نعرہ مارتے ہوئے اس وہ جوان پر حملہ کر دیا، حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ جوان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور تلوار کی نوک اس کے کندھے کو گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ چوٹ اتنی گہری نہیں تھی صرف کندھے کی تھوڑی سی کھال ہی چمک گئی تھی لیکن وہ جوان اب سنبھل گیا تھا اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے پیٹر بدلنا اور پلٹ کر جوابی وار کر دیا۔ اس نے تلوار کا ہاتھ گھماتے ہوئے اس سورما کی کلائی پر وار کرنا چاہا۔

لیکن دوسری طرف بھی تلوار بازی کا ماہر تھا اس نے خود کو اس کے حملے سے بچاتے ہوئے جھکا کر دی اور ہاتھ اوپر اٹھا کر تیزی سے دوبارہ وار کیا اس بار اس کا نشانہ چوک گیا اور وہ گرے کرتے بچا اور اس بات کا فائدہ لیتے ہوئے وہ جوان نے تیزی سے اس کے سینے پر وار کر دیا۔ تلوار کسی کو نکاد کر سریے کی طرح اس کے سینے پر پڑی اور سیدھی اس کو چیرتی ہوئے اندر گئی۔ سورما کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور خون کا فوارہ بہہ نکلا خون تیزی سے بہنے کی وجہ سے اس پر نقامت طاری ہونے لگی۔ پنڈال لوگوں کے زوردار نعروں سے گونجنے لگا اور کچھ لوگ بھاگ بھاگ کر پنڈال میں آنے لگے اور اس وہ جوان کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔

پریت کو بھی سانس روک کے تلوار بازی کا مقابلہ دیکھ رہی تھی اسے اس وہ جوان کی بہادری بہت اچھی لگی، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں سورماؤں کو چوٹ کر دیا تھا جو اپنے غرور کے نشے میں نہ جانے کیا کیا کر رہے تھے۔ بعد میں لوگوں کی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ اس وہ جوان کا نام دلچیت سنگھ ہے اور وہ ساتھ کے گاؤں کے کھیا کا سپوت ہے۔ پریت کو دل ہی دل میں اس وہ جوان کی گرویدہ

ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی۔ پھر کچھ وقت بیتا کہ وہ سب واپس اپنے گاؤں واپس پہنچ گئے۔ پریت کو اس بات کا اندازہ تک نہ ہوا کہ کھیا کا لوگوں کے اس ہجوم میں کوئی اسے بھی نظر نہ کرے کیونکہ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر چکا تھا۔

دلچیت سنگھ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ نہ بھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا لیکن نہ جانے اسے اس لڑکی میں کیا کشش تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں کو اس کے معصوم چہرے سے ہٹا نہ سکا۔ پریت کو اس کے پڑوس کے گاؤں میں ہی رہتی تھی اور فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے وہ جب چاہتا اس کے گاؤں جاسکتا تھا۔ ان دنوں لگے اور اس دوران وہ کی بار پریت کو کے گاؤں ہوا یا تھا لیکن اسنے پھر لگانے کے باوجود اسے صرف دو بار ہی اس کا چہرہ نظر آیا تھا اور اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ پایا تھا۔ تھک ہار کر اس نے اپنا ریشہ اس کے گھر بھجوانے کا ارادہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں بزرگوں کے میل جول سے یہ رشتہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اور گھر کے سب افراد بارات لے کر پریت کو کے گاؤں جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ گھیسوں میں جتے ہوئے سفید موٹے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے زرد رنگ کے تاج پہنے وہ بہت حسین دکھائی دے رہے تھے۔ گھر کے تمام افراد سمیت تقریباً چالیس کے قریب افراد تھے جو کہ بارات میں شامل تھے۔ جن میں بچے بوڑھے اور خواتین بھی تھیں سب کے چہرے خوشی سے تیز رہے تھے۔ وہ سب رات کے گاؤں جلد از جلد پہنچ کر اس حسین چہرے کو دیکھنا چاہ رہے تھے جس نے ان کے شہزادے جیسے دلچیت سنگھ کا دل جیت لیا تھا۔ وہ دلچیت سنگھ جس نے بھی سینے میں بھی کسی لڑکی کو نہ دیکھا تھا نہ جانے کیسے اس لڑکی کا دیوانہ بن گیا تھا کہ چٹ مٹکٹی پٹ بیابہ والا معاملہ ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شادی جیسے بندھن



میں بندھنے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

سب افراد سکتے کی ہی کیفیت میں اس جگہ کھڑے حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے جس پر بھی دھول سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اب تک کسی جانور یا انسانی پاؤں نے بھی چھوا تک نہ ہو۔ ابھی وہ سب اسی سوچ میں غرق تھے کہ انہیں یکدم خبردار کی آواز نے جیسے چونکا دیا ہو۔ خبردار انہیں اس جڑے ہوئے راستے کی طرف بڑھنے کی تلقین کر رہا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھنے لگے انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیہ قوت انہیں اس راستے پر سرفر کرنے کے لئے اکسار ہی ہو۔ خبردار ان سب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ لیکن اندرونی طور پر وہ سب سہمے ہوئے تھے کہ نجانے کب اور کہاں سے وہ خونی معریت نمودار ہو جائے اور انہیں آکر دیوبچ لے۔ راستے پر چلتے ہوئے ان کے قدموں کے نشانات بننے جا رہے تھے وہ سب محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

لیکن ان سب کو اس بات کا قطعی احساس تک نہ تھا کہ ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشانات تیزی سے مٹنے جا رہے تھے ان نشانات پر پھر سے دھول جتنی جا رہی تھی۔ یہ سب اتنی خاموشی اور پراسرار طریقے سے ہو رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ تقریباً آدھا میل تک مسلسل چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ مختلف قسم کے پرندے درختوں پر اپنی اپنی آواز میں چہارے تھے۔ جنگلی گھاس میں دوڑتے چہرے ادھر ادھر پھرتے پھرتے پھر رہے تھے۔ سبیل کے درختوں کی بہتات بھی جن پر لگے بڑے بڑے سرخ پھول بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان پر پھدکی گھیریاں اچھلتی کودتی پھر رہی تھیں۔ درختوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ٹھوڑی دور تک تو درخت کھلے کھلے فاصلے پر تھے لیکن جیسے جیسے وہ سب آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے جنگل گنجان اور درختوں کا فاصلہ بھی قدرے کم ہوتا جا رہا تھا اور

ایک جگہ تو انہیں باقاعدہ ایک ایک کر کے درختوں کے درمیان سے گھلتا پڑا۔

وہ سب خاموشی سے ہاتھوں میں اسلحہ اٹھائے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے جا رہے تھے اس دوران انہوں نے چند افراد کو اپنے دائیں بائیں نظر رکھنے کا کھدیا تھا اور دو افراد باقاعدہ اپنے پیچھے نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب بہت چوکنے انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کے اندر سے انہیں کسی پرانی اور پسیدہ عمارت کے آثار نظر آنے لگے وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔

عمارت کو سامنے کی طرف سے جنگلی جھاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ شکل سے وہ کوئی بہت ہی پرانا مندر لگ رہا تھا جس کے رنگ و روغن اور عمارت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے یوں ویران پڑے مدتیں گزر چکی ہوں۔ لوہے کے ایک بڑے گیٹ کے دونوں طرف ستون بنے ہوئے تھے جن کی حالت بھی کافی خستہ تھی انہیں نظر میں یوں لگتا جیسے کسی بھی وقت وہ اچانک زمین بوس ہو جائیں گے۔

گیٹ کے صحن درمیان میں پتیل کا ایک گھنٹا چھول رہا تھا شاید وہ بھی پتیل کا رہا ہوگا لیکن اس وقت اس کا رنگ زیادہ تر سیاہ ہی نظر آ رہا تھا۔ مندر کے اندر جانے کے لئے بہت سی سیڑھیاں تھیں جن کی بہت سی اینٹیں اکڑی ہوئی تھیں اور بہت سی خستہ حالت میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب عمارت کے سامنے موجود چند درختوں کے جھنڈ میں موجوا تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں بات چیت کر رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق شاید وہ انسانی بھیر یا اسی عمارت میں چھپا ہوگا کیونکہ وہ جب سے جنگل میں چلے آ رہے تھے اس وقت سے کوئی انہونی بات واقع نہ ہوئی تھی اور نہ انہیں سے انہیں اس انسانی بھیر پر کسی موجودگی کے کوئی آثار نظر آئے تھے وہ سب اس بات پر بھی متفق تھے کہ شاید اس ویران مندر میں داخل ہونے کا کوئی اور خفیہ راستہ بھی موجود ہو اور وہ درندہ اسی راستے سے ہی آتا جاتا ہو۔ خبر یہ سب قس آرائیاں انہیں معلوم ہو رہی تھیں اصل حقیقت تو اس مندر اندر جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

کافی دیر تک صلاح مشورہ کرنے کے بعد خبردار نے اپنے چند آدمی اس مندر میں بھیجے کا فیصلہ سنایا جس کے مطابق ان میں سے چار آدمی اس عمارت میں داخل ہو گئے اور وہاں کا جائزہ لے کر انہیں بھی اندر آنے کا اشارہ دیں گے۔ اس فیصلے پر سب نے اتفاق کیا اور پھر چار آدمی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اس مندر کے میں گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ سیدھے جانے کی بجائے ایک جانب سے آگے بڑھ رہے تھے اس لئے کہ اگر کوئی اندر موجود ہو تو انہیں سامنے سے نہ دیکھ پائے۔ خبردار ان کے ساتھ جانے کی بجائے وہیں رک گیا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حالات کے مطابق وہیں رہ کر کوئی اقدام کر سکے۔

شام کا وقت ہو چلا تھا اور درختوں پر شور مچاتے پرندے بھی خاموش ہو گئے تھے اور جنگل میں یوں خاموشی طاری تھی جیسے جنگل کے تمام چرند پرند ہجرت کر کے کہیں اور جا رہے ہوں۔ یا شاید آرام کر رہے ہوں لیکن زمین پر چلنے والے انسان اپنے آرام کی خاطر اس معریت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے جس نے ان سب کا سکون برباد کر دیا تھا۔ خبردار اور باقی پیچھے بچ جانے والے افراد میں سادھے اپنے ساتھیوں کو اس مندر کی جانب بڑھتے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں ان کی سلامتی کے لئے دعایں مانگ رہے تھے۔

وہ چاروں آہستہ آہستہ چلتے اس کے میں گیٹ کے سامنے پہنچ گئے پھر ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہی دو افراد ہاتھوں میں پکڑی بندوقوں کا رخ سامنے کی طرف رکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے باقی دو افراد نیچے پڑھوں کے پاس ہی رک کر ان کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دونوں افراد سیڑھیاں چڑھ کر اس مندر کے لان میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ دائیں جانے خشک پتوں کا ایک پیر موجود تھا اور وہاں اس قدر گندگی اور غلاظت تھی کہ جیسے مندر کی بجائے کوئی کوڑے دان ہو۔ لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس خشک پتوں کے ڈھیر کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے کسی نے بڑی نفاست سے اسے اکٹھا کیا ہو۔

ابھی وہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک سیاہ بٹے نے انہیں اس ڈھیر سے باہر نکالا اور ان سے مخاطب ہوا۔ "اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لو جو بیڑھوں سے کان لگائے نیچے کھڑے ہیں۔" بٹے کے منہ سے انسانی آواز سننے ہی ان کے رنگ فق ہو گئے اور ان کے جسم یوں ہو گئے جیسے کانٹو تو لپوٹیں۔

پوری دنیا میں تحقیق کے مطابق اب تک صرف دو پرندوں کو انسانی آواز میں بولنے کا شرف حاصل ہے جس میں ایک مینا ہے اور دوسرا طوطا۔ ان دونوں کی زبانیں انسانی زبان سے ملتی ہیں اس لئے ان دونوں پرندوں کو انسانی لہجے میں سکھانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور یہ بہت جلدی انسانی آواز میں بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے اس بٹے کو انسانی آواز میں بولنا دیکھ کر ان کی حیرت بجاتھی۔ اور پھر ان دونوں کے قدم تو مندر کے فرش سے یوں چپک گئے تھے جیسے لوہا کسی مقناطیس سے چٹ جاتا ہے۔ وہ بے بسی سے کھڑے اسی بٹے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس بٹے نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور سیدھا ان بت بنے جسموں سے کسی توپ کے گولے کی مانند آگرایا۔ وہ دونوں جس طرح سکتے کی حالت میں کھڑے تھے شاید قیامت تک کبھی ہوش میں نہ آتے لیکن اس خوفناک بٹے نے انہیں چند منٹوں میں ہی ہوش دلادیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سینوں پر کسی نے بہت بھاری ہتھوڑا مار دیا ہو اور جس کی ضرب سے انہیں اپنی پسلیاں ٹوٹی محسوس ہوئیں۔ اور پھر اچانک ٹھمرانے سے وہ دونوں تیزی سے زمین کی جانب گرنے لگے لیکن پھر یکدم انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیہ قوت نے پیچھے سے انہیں سہارا دے دیا ہو۔ وہ آدھے کھڑے اور آدھے گرنے کے انداز میں وہیں رک گئے۔

بلا بھی ٹکراتے ہی تیزی سے زمین پر گرے اور انہیں اس انداز میں کھڑے دیکھ کر اپنا پنچہ بڑے زوردار انداز سے ایک نوجوان کے سینے پر دے مارا۔ دارا تازہ زوردار تھا وہ سیدھا اس کا سینہ چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ پنچے

کے وار سے اس کا سینہ پھٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی زندہ انسان کو کسی کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ وار سے سینے میں سے انسانی اعضا نکل کر باہر گر گئے جس کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی زمین پر جا پڑا۔

بلنے نے جھپٹ کر دل کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور ایک ہی لمحے میں ہڑپ کر گیا۔ دوسرا نوجوان اپنے ساتھی کا بھیا تک انجام دیکھ کر تیزی سے پلٹ کر مندر کی سیڑھیوں کی جانب بھاگا لیکن بلا اسے اتنی مہلت کہاں دیئے وہ لڑا تھا اس نے بھاگتے ہوئے نوجوان کو پیچھے سے ہی دوبارہ پنجہ مارا اور اس باغیرچاس کی پیٹھ میں گھس گیا اور اس کا بھی وہی انجام ہوا اور اس کا دل بھی اچھل کر پیچھے ہی زمین کی جانب گر پڑا۔ بلنے نے جھپٹ کر اسے تھا مارا اسے بھی چٹ کر گیا۔ دونوں نوجوانوں کی چیخیں سن کر پیچھے کھڑے ان کے ساتھی ان کے مدد کے لئے لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگے اور جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو اپنے ساتھیوں کا بھیا تک انجام ان کے سامنے تھا۔ دلالان میں خون بکھرا ہوا تھا یوں لگتا جیسے کسی نے بڑی سی گائے ذبح کر دی ہو۔ ان کے ساتھیوں کے کٹے ہوئے جسم زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اور ان کے نزدیک ایک کالا بلا میٹھا خون سے بھرے اپنے پنجے چاٹ رہا تھا۔ ان کے اوپر پہنچتے ہی اس بلنے نے بھی ان کی طرف دیکھ لیا تھا لیکن وہ برابر اپنے پنجے چاٹنے میں مصروف تھا۔

وہ دونوں سکے کی حالت میں تھے اور پھر جیسے اچانک انہیں ہوش آگیا اور وہ اس کیفیت سے باہر نکل آئے اور واپس پلٹنے کے لئے مڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر واپس جنگل کی جانب دوڑے لیکن شاید ایسا کرنے میں انہیں دیر ہو چکی تھی اس لئے وہ جیسے ہی مندر کے عمارت سے باہر نکلے۔

مندر کے سامنے کی دیوار پتھی اور ایک عورت کا آدھا دھڑ اس میں سے باہر نکلا جس کی بے نور آنکھیں سیاہ چلیوں سے عاری تھیں اور اس کا بڑا سا راجھا تھ تیزی سے لہراتا ہوا ان دونوں کی گردنوں تک پہنچا اور انہیں دبوچ کر واپس مندر کی دیوار میں غائب ہو گیا۔ اندر کا منظر تو باہر جنگل میں موجود

جیسے ہوئے لوگ شاید زندہ کچھ پائے تھے لیکن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ سب خوف سے چیختے ہوئے واپس جنگل میں بھاگنے لگے۔

نمبردار پر بھی خوف کی کیفیت طاری تھی ظاہر ہے وہ بھی ایک انسان تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کا لرزنا دینے والا حشر دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری عمل تھا۔ دوسرا وہ سب ان کے محافظ کے طور پر بھی ساتھ آیا تھا اس لئے ان کے بھیا تک انجام کا خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا لیکن چونکہ حقیقت سب کے سامنے تھی اس لئے وہ کم از کم اس طرف سے مطمئن ضرور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ان کے بیوی بچوں کا بھی خیال آ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ اندر وہ تھا۔ اس لئے اپنے ساتھیوں کو بھاگتا دیکھ کر انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا وہ اس کی کوئی بات سننے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے انہیں واپس جاتا دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔

☆.....☆.....☆

دونوں بولنے آدمیوں نے ہاتھوں میں جھاتی صغراں کو لے جا کر ایک تہہ خانے میں رکھ کر کڑی کی غٹا پر لٹا دیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو سائیز میں لکے چڑھ کے بیٹھوں سے کس کر باندھ دیا اور یہی عمل اس کے دونوں پاؤں پر دہرایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ تہہ خانے میں موجود ایک سوراخ میں داخل ہو گئے۔ اس سوراخ جیسے تین اور چوکور سوراخ جن کی لمبائی اور اونچائی تقریباً تین فٹ ضرور ہوگی موجود تھے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دائیں طرف والی دیوار سے ایک عجیب الخلقت شکل کا گور یا ٹانما انسان برآمد ہوا جس کے سر کے لمبے بال اس کے شانوں تک جمبول رہے تھے۔ چہرے پر گوریلے کی مانند موٹی ناک جس میں ایسا مصلی جیسا زور پھٹا ہوا تھا اور اس نے سیاہ رنگ کا ٹکڑا بھی کسا ہوا تھا جس پر زرد رنگ سے دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ جس کے عین درمیان ایک سفید چھوٹی تصویر تھی، ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک چمک دار تھوڑی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ سوراخ سے نکلتے ہی سیدھا پنجہ اٹھالیا صغراں کے نزدیک آکر ٹھہر گیا۔ وہ اسے یوں لپکا کہ وہ

نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ مجرورہ اپنے لیوں پر زبان گھماتے ہوئے اس کے بازو کی جانب بڑھا اور تیز دھار چھری سے اس کے ننگے بازو پر وار کر دیا۔

صغراں کے منہ سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی اور تہہ خانے اس کی چیخ سے گونجنے لگا۔ اور اس کے چہرے پر انتہائی کرب کے آثار پھیل گئے چوں کہ وہ کسی تکمیل کے زیر اثر نہ تھی اس لئے چھری کا وار سے ہی فوراً ہوش میں آگئی اور تکلیف سے اپنا سر دائیں بائیں پھینکنے لگی۔ پھر اپنے سامنے ایک گور یا ٹانما انسان کو پا کر دوبارہ بیہوش ہو گئی۔ بازو کٹنے ہی خون کا ایک فوارہ سے نکلا اور اس کے تازہ تازہ خون پنجے سے ہوتا ہوا پیچھے زمین پر گرنے لگا۔ کٹا ہوا بازو اٹھا کر اس کو گر پڑا ٹانما انسان نے ایک زوردار چیخ ماری یوں لگا جیسے کسی نے بہت تیز دھار سا زین بجا دیا ہو۔

ابھی اس کی چیخ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی تہہ خانے کی باقی دیواروں میں موجود دیگر سوراخوں سے دوسرے مکروہ صورت انسان برآمد ہوئے انہوں نے بھی اپنے اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے اوزار پکڑے ہوئے تھے۔

صغراں جو کہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی اور اپنے ساتھ آئندہ آنے والے حالات سے بے خبر پنج پر پڑی تھی۔ ان دونوں مکروہ صورت افراد نے اپنے اپنے اوزاروں سے پنج پر لیٹی صغراں کے جسم سے اپنے اپنے من پسند گوشت کے ٹکڑے کاٹے اور ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ ان سوراخوں میں گھس گئے جہاں سے وہ کچھ دیر قبل نکلے تھے۔

تہہ خانے کے فرش پر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی وہاں کوئی گائے ذبح کی ہو۔ صغراں کا جسم ہولے ہولے کاٹنے کا تھا۔ ایک ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک زندہ انسان کے کٹے ہوئے جسم کا منظر ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا جسے دیکھ کر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ ان دونوں افراد کے غائب ہوتے ہی ایک بھیا تک شکل عورت جس نے اپنی پیٹھ پر ایک میٹھن باندھ رکھی تھی جیسے عموماً فصلوں پر پیرے کرنے والے باندھتے ہیں اور اس کی لمبی یونزل اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تمام رکھی

تھی۔ اس کے سیاہ چہرے پر لٹکتے ہوئے سرخ بال بہت بڑے لگ رہے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ کوئی چڑیل ہی لگ رہی تھی جسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی پنج پر لیٹی صغراں کے قریب آئی اور نوزل کا رخ اس کی طرف کر کے اپنے ہاتھ سے میٹھن کی سائیز پر لگا پینڈل اوپر نیچے ہلانے لگی اس کے ایسا کرتے ہی سبزی مائل پانی کی ایک موٹی دھار صغراں کے اڑھڑے جسم پر پڑنے لگی۔ جہاں جہاں اس پانی کی پھوار پڑ رہی تھی وہاں سے اس کا جسم مرکزی کی مانند پھل پھل کر پیچھے ہٹنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہاں تہہ خانے کے فرش پر پانی ایک ڈھیر کی صورت اکٹھا ہو گیا۔

نجانے اس سبزی مائل میں کیا ایسی تاثیر تھی کہ اس نے چند لمحوں میں ایک انسانی جسم کے گوشت اور ہڈیوں کو یوں نکال دیا تھا جیسے ان کا بھی وہ جودی ہو۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس بری شکل عورت نے اپنی پیٹھ پر بندھی میٹھن اتار کر تہہ خانے کے فرش پر رکھ دی۔ اور دائیں طرف نظر آنے والے کٹھ کاٹھ میں سے ایک پرانا کپڑا اٹھا لیا اور اس سے زمین پر بکھرا ہوا صغراں کا خون صاف کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خون کا ایک دمہ تک نہ تھا۔ اس نے کپڑا ایک جانب اچھالا اور دوبارہ سوراخ میں گھس گئی۔

☆.....☆.....☆

بیرات کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب دو سائے سیاہ چادریں اوڑھے شہر سے دور ایک پرانے قبرستان کے دروازے کی جانب بڑھے جا رہے تھے جسمانی خدوخال سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں بہت محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑی خاموشی سے قبرستان کے دروازے کی جانب جا رہے تھے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے لوہے کا کہنی گیٹ دھکے سے کھولا۔ دروازہ چونکہ مقفل نہ تھا اس لئے دھکا لگتے ہی فوراً کھل گیا ویسے بھی اسے بند کرنے کا کوئی جواز نہ تھا تو کونسا کسی نے وہاں سے کوئی خزانہ چا کر لے جاتا تھا۔

قبرستان کے سامنے کی دیوار پکی انٹھوں سے بنی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اور گھاس پھوس لگی ہوئی تھی۔ جھاڑیاں ایک باڑ کی صورت اختیار کر چکی تھیں جس کی وجہ سے دور سے وہ دیواریں ہی محسوس ہوتی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ قبرستان میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی نزدیک سے کسی جھینگری کی آواز سنائی دیتی تو لمحہ بھر کے لئے خاموشی میں ارتعاش سے پیدا ہوتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

یہ قبرستان لگ بھگ تین ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس میں دور دور تک بہت سی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں بہت سی قبریں سر مٹ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خستہ حالت میں تھیں اور بہت سی قبریں گڑبڑوں کی صورت میں تھیں یہ ان کے وارثوں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کبھی کبھی دور سے گیدڑوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے جاتیں تو دل دہل جاتا کہتے ہیں کہ رات میں آسمانی بلائیں زمین پر اترتی ہیں تو زمین پر چند پرند اور جانوروں خصوصاً مائی اور کتوں کو وہ نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ روتے اور چلاتے ہیں۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ "اپنے بچوں کو مغرب کے وقت گھروں سے باہر نہ نکالا کرو کیونکہ ایسے وقت میں بلائیں باہر نکلتی ہیں اور انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جب کبھی کسی کی جانور کو روئے ہوئے دیکھیں تو فوراً آیت الکرسی کا ورد کرنا چاہیے کیونکہ اس کے پڑھنے سے بری بلاؤں کو آگ لگ جاتی ہے اور وہ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ آیت الکرسی پڑھنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرمادیتا ہے جو اس کے پڑھنے والے کی حفاظت کرتا ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے قبرستان میں ایسی قبر کی تلاش میں تھے جو پرانی ہو اور اس پر چٹا ہوا چراغ بھی موجود ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں قریب ہی قبرستان کے گورکن کا مکان تھا جس کے اندر سے دیئے کی روشنی اس کی دیوار میں بے ایک گول روشندان سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

چونکہ رات کا وقت تھا اس لئے وہ بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اور ویسے بھی کسی نے قبرستان سے بھلا کیا لینا دینا تھا اس لئے وہ بے فکر کی نیند سو رہا تھا۔ مکان سامنے دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ دوسری جانب بڑھنے لگے۔

شاہ بابا نے انہیں بہت مشکل کام سونپا تھا کیونکہ ایک ایسی قبر جو بوسیدہ بھی ہو اور اس پر چراغ بھی جل رہا ہو تقریباً ناممکن لگ رہا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ ان قبروں پر ہی چراغ جلاتے ہیں جو تازہ بنی ہوں ورنہ بوسیدہ اور خستہ قبر جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو بھلا اس پر کوئی چراغ کیوں جلائے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک امید کے سہارے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پھر کچھ دیر تک بھٹکنے رہنے کے بعد وہ واپس ہو گئے۔ اور دل برداشتہ ہو کر واپس جانے کے لئے سوچنے لگے۔

یہ دونوں فیکا موچی اور رشیدی ماں تھے جو شاہ بابا کے حکم کے مطابق اس وقت قبرستان میں موجود تھے۔ رشیدی ماں نے بڑی مشکل سے فیکے موچی کو ایک ٹھنڈی رقم دینے کا وعدہ کر کے اس کام کی تکمیل کے لئے رضا مندا کیا تھا پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب اسے اس کی بیٹی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا احساس دلایا تو اس نے بھی ساتھ دینے کی حاضری بھری تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی وعدہ کرنا پڑا تھا کہ یہ راز مرنے دم تک کسی کو نہ بتایا جائیگا۔ یہ سب باتیں طے کر کے وہ آج اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اس وقت اس پرانے قبرستان میں موجود تھے۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہے تھے وہ اتنا آسان نہ تھا بلکہ بہت مشکل کام تھا۔ اور اب ایک پرانی قبر پر چٹا ہوا چراغ و صوفٹنا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ تک تلاش جاری رکھنے کے بعد وہ دونوں ایک جگہ رک کر آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ "گلتا ہے اس قبرستان میں کوئی ایسی قبر نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے اس لئے ہمیں آج واپس لوٹ جانا

چاہئے اور پھر کسی مناسب وقت میں کسی اور قبرستان میں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے۔" رشیدی ماں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیک ہے جیسے تمہاری مرضی اچھا ہوتا اگر آج ہی ہم یہ کام انجام دے لیتے کیونکہ روز بروز آدمی رات کے بعد اپنے گھروں سے نکلنا کون سے آسان بات ہے اور پھر اگر گھر کے افراد میں سے کسی کو شک ہو گیا تو ہمارا راز کھل سکتا ہے اور ہم مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں۔" فیکے نے بھی جوابا کہا۔

"لیکن جب ہمیں ایسی قبریں نہ ملے گی تو ہم کیسے یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں؟ کیونکہ شاہ بابا کے مطابق اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو ہم اپنا مقصد نہیں پاسکتے۔" رشیدی ماں نے جواب دیا۔

ابھی وہ آپس میں کھڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے اچانک انہیں اپنے قریب ایک آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں کسم کس اس طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر ایک گونج دار آواز نے خاموشی کا ظلم توڑ دیا۔ دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک زوردار ہلچل کے کانوں کے قریب لا کر یک لخت بجا دیا ہو انہیں یوں لگا جیسے یہ گونجدار آواز ان کے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دے گی۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لئے ہوا اور پھر یکدم دوبارہ یوں خاموشی چھا گئی کہ انہیں اپنے سینوں میں دھڑکنے والی کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

وہ دونوں خوف و ہراس میں ڈوبے کھوٹی کھوٹی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وقت نے انہیں پتھر کا بنا دیا ہو۔ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد جیسے یکدم انہیں کسی نے چھوڑ دیا ہو اور وہ ہوش میں آ گئے ہوں۔ ان کے چاروں طرف گھپ اندھیرا ڈیرے ڈالے ہوئے تھا اور قبرستان اسی طرح اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے تھا اور وہ اس کے نیچوں بچ کھڑے آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگے۔

اس خوفناک آواز نے انہیں بہت خوفزدہ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنا پلان ملتوی کر کے اپنے گھروں کی راہ

لی۔ راستے میں وہ دونوں خاموش ہی تھے اور گھروں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے سرگوشی میں کچھ بات کی اور فیکا موچی اپنے گھر کے اندر گھس گیا اور رشیدی ماں بھی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

نمبردار کے ساتھ آئے اس کے آدمی خوفزدہ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جانے والے راستے کی جانب بھاگتے چلے جا رہے تھے جو کہ جنگل کے اندر سے ہو کر جا رہا تھا جنگل رات کے اندھیرے میں اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں دیوار جنت اپنے سر اٹھائے ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں۔ نمبردار چونکہ خود ڈر گیا تھا مندر کے اندر جو کچھ اس نے اپنی جاگتی آنکھوں کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوتا دیکھا تھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا۔ وہ ان کے تعاقب میں ان کے پیچھے ہی بھاگتا چلا جا رہا تھا خوف کی وجہ سے اس کے پاؤں اس کا ساتھ دینے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے پیچھے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں مسلسل آوازیں دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن جیسے کسی نے اس کے حلق میں کانٹے گاڑ دیئے ہوں کہ جو اس کی آواز کو اس کے حلق میں قید کرنے میں لگے ہوں۔

تقریباً بیس پچیس منٹ تک مسلسل بھاگتے رہنے کے بعد وہ اس جڑے ہوئے راستے پر پہنچ گئے۔ رات کے وقت بھی راستے کی مٹی فاسفورس یا ریڈیم کی مانند چمک رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس پر کسی قسم کے چلنے کا نشان اب بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا ہے تھے اور اس بار بھی انہیں یہ بہت عجیب لگا تھا۔ بچانے اس میں قدرت کا کیا مجید تھا۔ بحر حال اس وقت ایسی باتوں پر غور کرنے کی بجائے انہیں اپنی جان بچانے کی فکر زیادہ تھی اور وہ اندھا دھند اس راستے پر بھاگتے چلے گئے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے دیئے ویسے ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشان بڑی تیزی سے مٹنے جا رہے تھے۔ ان سب کے چروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کے چہرے چاندنی میں یوں لگ رہے تھے جیسے کسی نے



سفید رنگ ان کے چہرہ پر بھیر دیا ہوا۔

چاروں طرف ہوا کا عالم طاری تھا اور راستے کے دونوں طرف لگی جھاڑیوں میں چھپے درندے بڑی حیرت سے انہیں سرپٹ بھاگتے دیکھ رہے تھے۔ جھاڑیوں میں سے ان کی سرخ سرخ آنکھیں چمکتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مسلسل سرپٹ بھاگتے رہنے کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ کھیتوں میں پہنچ گئے اور ان میں موجود پکڑ پکڑیوں پر بھاگے لگے اور ٹھوڑی دیر میں وہ سب گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔

گاؤں کے نزدیک پہنچ کر وہ چنچنے چلانے لگے اور ان کے اس طرح چنچنے کی آوازیں رات کے اندھیرے میں گاؤں ان لوگوں کو صاف سنائی دیں جو ان کے جنگل میں جانے سے لے کر ابھی تک ان کے انتقال میں جاگ رہے تھے۔ ان کا شور سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور ان کو اس طرح رات کے اندھیرے میں گاؤں کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ بھی خوفزدہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

گاؤں کے لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر غبردار اور اس کے قہقہے جانے والے آدمی ان کے قریب آ کر یوں زمین پر ڈھیر ہو گئے جیسے کسی نے آٹے کی بوریاں زمین پر لا دوکی ہوں۔

☆.....☆.....☆

دلچسپ منظر دیکھو لہے کے لباس میں کوئی شہزادہ ہی لگ رہا تھا اس کے تمام رشتے دار اس کے گرد گھیراؤ لے لے اس سے باتیں اور چیمپڑا چھاڑنے میں لگے ہوئے تھے وہ بھی اپنی پریت کوہ کے لئے کی خوشی میں ان سب کی چیمپڑا سے محفوظ ہو رہا تھا لیکن شاید وہ اپنے آنے والے برے وقت سے بے خبر تھا جو اس کی تاک میں اس کا انتظار کر رہا تھا اس کے والدین بارات لے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا ان کی یہ پوشش بھی کہ وہ بارات کے گرد جلدی اپنے سہمی کے گاؤں پہنچیں تاکہ رسومات کی ادائیگی اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد جلدی سے اپنی بہو کو لے کر رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں لیکن ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی باراتی ابھی پوری طرح تیار نہیں

ہوئے تھے ہر کوئی بلاوجہ ہی ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ان کے چہرہ پر بے بسی چھائی ہوئی تھی اور باراتیوں پر اپنے غمے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے جو کہ ان کے نزدیک بہت معیوب بات تھی۔ اس لئے وہ بے چارگی سے ان کی تیاریوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ پھر کافی دیر کے بعد کسی نے آواز لگائی کہ بارات چلنے کے لئے تیار ہے اور یہ سن کر انہوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

یہ صبح کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب ایک کچی سہائی بھی پر دلچسپ منظر دکھائی دے گا۔ والدین اور دو تین قریبی رشتہ داروں کے ساتھ براجان تھا۔ بھی میں جیسے سفید کھوڑے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بھی کے پیچھے چند اور بھیلوں اور کچی ہوئی تیل گاڑیوں پر دیگر باراتی سوار تھے۔ یہ قافلہ پریت کوہ کے گاؤں کی جانب رواں دواں تھا جو کہ ان کے گاؤں سے تقریباً پندرہ میل کی مسافت پر تھا ان کے اندازے کے مطابق انہیں پریت کوہ کے گاؤں پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ سکتے تھے اور وہ سب مطمئن تھے کہ شام کے سامنے گھرے ہونے سے پہلے پہلے وہ واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جب بارات چلی تو راستے میں بچوں اور عورتوں کی ضرورتوں کی وجہ سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں کم از کم چار پانچ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔

بھی میں جیسے کھوڑے آہستہ چلنے پر خوش نہیں تھے لیکن تیل گاڑیوں کی رفتار کی وجہ سے انہیں بھی اپنی چال آہستہ مہمی بڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے جیسے کر کے وہ پہرے کے وقت گاؤں پہنچ ہی گئے گاؤں میں ان کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں چونکہ گاؤں کی ہر عورت اور مرد بھی اس نوجوان کو دیکھنے کی حسرت تھی جس نے ان کے گاؤں کی سب سے خوبصورت و شیرازہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اس لئے وہ سب بھی بڑی بے چینی سے بارات کا انتظار کر رہے تھے۔

گاؤں کے داخلی راستے پر وہ سب اکٹھے کھڑے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے ان کے استقبال

لئے تیار کھڑے تھے اور پھر جیسے ہی ان کی نظریات پر بڑی وہ سب خوشی سے چنچنے چلانے لگے۔ گاؤں کے نزدیک پہنچ کر ان سب کا پرزور انداز میں استقبال کیا گیا اور ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ دلچسپ منظر دکھائی دے رہا تھا سب کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے سرلیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور باراتیوں کے ساتھ ساتھ ان سب کو لے جا کر ایک بڑی سی چوٹی میں ٹھہرایا۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ چوٹی اپنی خوبصورتی کی مثال تھی۔ جس کا بڑا سا منقش دروازہ کارٹیک کی محنت کا مندر ہوتا ثابت تھا۔

چوٹی کے پتھروں تک ایک بڑا دالان تھا جس میں جا بجا تخت پوش بچے تھے۔ جن پر سرخ رنگ کی چادریں بچھی ہوئیں تھیں۔ ان سب کو لے جا کر ان تخت پوشوں پر بٹھایا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی خدمت میں ایک ڈانڈہ دار شربت پیش کیا گیا جس کے منفرد ذائقے کی ہر کسی نے دل کھول کر لا دی۔ عورتیں زنان خانے میں چلی گئی تھیں اور بچے دوسرے بچوں کیساتھ کھیلنے کو نئے میں لگ گئے۔

پریت کوہ دالان کے لباس میں لمبوس کوئی آسمان سے اتری الہرا لگ رہی تھی۔ اسٹین اور مہندی نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین بنادیا تھا۔

شادی کے سرخ جوڑے میں وہ کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ شرم سے اس کے اندر کی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر اپنے محبوب کو دیکھنے کی تمنا بڑی بے چینی ہو۔ اس کی بچپن کی سہیلیوں نے اس کو اپنے گھرے میں لیا ہوا تھا اور وہ اس سے چیمپڑا چھاڑ میں مصروف تھیں اور وہ بھی کبھی ان کے مذاق پر کھل کھلا کر ہنس دیتی جس سے اس کے موتیوں جیسے سفید دانت بہت بھلے لگتے تھے۔ غرض یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے بھی اسے بڑے پیار سے تخلیق کیا ہو۔

چوٹی کے برابر میں ایک بڑے احاطے میں باراتیوں کے سواگت کے لئے کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا جس میں مزے مزے کے پکوان تیار کیے جا رہے تھے جن کی بھنی بھنی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ چوٹی کے اندر ایک بڑے سے کمرے میں پریت کوہ کو بیٹھایا گیا تھا اور

تھا جس میں ضرورت کا تقریباً ہر سامان دیا گیا تھا تاکہ شادی کے بعد اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چھوٹا موٹا سامان بڑے بڑے ٹرکوں میں رکھ کر ان پر تالے لگا دیئے گئے تھے۔ جن کی چابیاں پریت کوہ کی والدہ نے اپنی حفاظت میں رکھی ہوئی تھیں۔ چیز و لاکرہ چوٹی کے ایک کونے کی طرف بنایا ہوا تھا جس کی طرف کبھی کوئی نہیں جاتا تھا اس کمرے کا سب سے بھی منتخب کیا گیا تھا کیونکہ دوسرے کمروں میں شادی میں شرکت کرنے والوں کو رکھا گیا تھا اس وقت پریت کوہ کی والدہ کے ہاتھ میں ایک بڑی سی گھڑی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں پڑے بندھے ہوئے ہوں شاید مہمانوں میں سے کسی نے کوئی رسم کی ادائیگی کی ہو۔ وہ گھڑی ہاتھ میں لئے چیز و لاکرے کی جانب بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے نزدیک جا کر اس نے گھڑی زمین پر رکھ کر اس پر لگا تالا کھولا اور گھڑی زمین سے اٹھا کر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بڑے سے زور سے سانس لی ہو اور ایک گرم ہوا کا جھونکا اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بوکھلا گیا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر مسک جھٹک دیا کہ شاید کرہ بند رہنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو کیونکہ اس کمرے میں تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور اس سے ہوا کا گزر نہیں تھا اس لئے ٹھن کی وجہ سے اچانک کرہ کھلنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی گھڑی ایک بڑے سے ٹریک کے نزدیک رکھ کر اس کا قفل کھولنے لگی۔ قفل کھول کر اس نے جیسے ہی اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا اس میں سے ایک بڑا سا کالا پھل کر باہر نکلا اور تیزی سے اسے حیران ہوتا چھوڑ کر کمرے کے لاکھ کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ حیران وہ پریشان ساکت نظروں سے اسے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیونکہ ہوا کمرہ میں رکھا ٹریک تو اس نے خود منتقل کیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا پھر ایسا کیسے ہوا کہ ایک سیاہیلا اس ٹریک میں بند ہو گیا ہو اور زندہ حالت میں اس کے

سامنے موجود ہو۔ کچھ دیر تک وہ بت بنی گھڑی رہی اور پھر تیزی سے گھبرائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور خوف کی وجہ سے اسے کمرہ بند کرنا بھی یاد نہیں رہا۔

☆.....☆.....☆

مسلل کوششوں کے باوجود بھی رشید کی ماں اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی ایک دوبار رشید کو بھی اس پر شک ہوا کہ جیسے اس کی ماں اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا لیکن کل تو حد ہوگئی جب اس کو پیاس کی حاجت ہوئی تو اس نے پانی پینے کے لئے جب صحن کا رخ کیا تو اس وقت اس کی ماں گھر کا باہر کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہو رہی تھی اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سوئی ہوئی تھی جب اسے گھر کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز سنی آ رہی تھیں اس لئے وہ صرف یہ دیکھنے کے لئے باہر نکل گئی لیکن اس کے دیکھنے کے باوجود اس کو کبھی میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا لیکن جس طرح وہ نظریں چرا کر اس کے برابر کچا جواب دے رہی تھی اس سے اس کے دل میں اس کا گمان کے شک میں بدل گیا تھا۔ اور وہ راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی ماں کے کمرے میں جھانک رہا تھا لیکن دوسری طرف اس کی ماں بھی شاید محتاط ہو گئی تھی اس لئے وہ بھی کافی دنوں سے جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔

لیکن ہی دل میں تملاتی رہتی تھی کہ کوئی گھڑی ہو جب وہ شاہ بابا کا دیا ہوا تعویذ جلدی سے کسی پرانی قبر میں دباوے تاکہ اس کی بہو سے اس کی جان چھوٹے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے مذموم مقاصد میں ناکام ہی رہی تھی اور سارا سارا دن اپنی بہو کے کاموں میں کیڑے نکالتی رہتی تھی اور شاید اس کی بہو بھی اب وحیف ہو گئی تھی کہ اس کے ڈانٹنے ڈٹنے اور کسنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی جس کی وجہ سے رشید کی ماں اور چڑی تھی۔

رات کو رشید کے گھر آنے پر اس کی بیوی دن بھر کی کارگزاری اس کے سامنے رکھ دیتی جس میں اس کی ماں کے رویے کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی۔ رشید خود ان دنوں کی روز روز کی نوک جھونک اور شکاجوں سے تنگ

آگیا تھا اس لئے وہ بھی ہر وقت پریشان رہتا کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ خود کشی کر لے تاکہ روز روز کی ان مصیبتوں سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا۔

ایک روز دوپہر کے وقت اس کے ایک دوست کی شادی تھی جس میں اس نے اس کو اس کی فقیہ کیساتھ مدعو کیا تھا اور وہ اس اچھا دوست تھا جس کی شادی میں شرکت لازمی تھی اس لئے اس نے اپنی ماں اور بیوی کو شادی میں جانے کے لئے کہا رشید کی ماں کو یہ موقع غنیمت لگا اور اس نے جلدی سے اپنی طبیعت کی ناسازگی کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا اور ان دونوں کو شادی میں جانے نہ کہا۔

رشید نے کچھ دیر اصرار کیا لیکن پھر اپنی بیوی کو لے کر دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ ان دونوں کے گھر سے نکلے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے شاہ بابا کا دیا ہوا تعویذ کمرے میں چھپائے ہوئے ایک لوہے کے بس سے نکالا اور اپنے دوپٹے سے باندھا اور گھر کو تالا لگا کر قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر نکل پڑی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دیکھے موچی کو بغیر بتائے ہی اس مسئلے کا حل تلاش کرے گی اور اس طرح اسے دیکھے موچی کو پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے اور وہ خاموشی سے اپنا کام بھی مکمل کر لے گی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بڑی رازداری سے قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

دوپہر کی وجہ سے اس راستے پر زیادہ لوگوں کا رش نہیں تھا۔ اکا کا لوگ اس راستے پر آج بھی رہے تھے لیکن کسی نے بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں وہ قبرستان کے قریب پہنچ گئی اور وہاں رک کر اوپر ادھر دیکھ کر اندر داخل ہو گئی۔ قبرستان میں ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا کر ہوئی تھی۔ قبروں پر اگی ہوئی جھاڑیاں ان میں فزوں انسانوں کے رشتہ داروں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے عزیز و اقارب انہیں وہاں دفن کر بھول چکے ہوں۔ کچھ جنگلی حیروں کی جھاڑیاں بھی دکھائی دیں جن پر سرخ سرخ حیر بہت بھلے لگ رہے۔

تھے اس نے لپکاتے دل کے ساتھ کچھ پیر توڑ کر منہ میں ڈالے تو ان کا ذائقہ بیٹھا محسوس ہوا وہ پیر کھائی اور ادھر دیکھتی آگے بڑھنے لگی اسے کوئی ایسی پرانی قبر کی تلاش تھی جس پر دیا بھی رکھا ہو۔

اس وقت وہ دن میں اس لئے قبرستان آئی تھی تاکہ دن کی روشنی میں اپنی مطلوبہ قبر تلاش کر کے اس پر کوئی نشانی لگا سکے تاکہ رات کے وقت اسے مزید وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ رات کے وقت ایسی قبر تلاش کرنے میں بہت وقت ہوئی تھی اس لئے آج گھر میں کسی کے نہ ہونے کی وجہ سے موقع ملے ہی وہ پرانی قبر کی تلاش میں نکل آئی تھی اور پھر جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

ایک نیم کے درخت کے نیچے ایک کچی قبر دکھائی دی اور اس کے سر ہانے ایک پرانا چراغ بھی دھرا تھا جس میں رکے تیل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے روزانہ جلایا جاتا ہے اس نے اچھی طرح اس قبر کی نشانی کو اپنے ذہن میں بٹھایا اور واپسی کی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک چھوٹا سا ہل نما کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک کربہہ اشکل انسان جس کے جسم پر گہرے رنگ کا لباس تھا ہاتھ میں ایک ترشول تھا۔ بیٹھا تھا ترشول کے تینوں تیروں پر بندروں کے تازہ رنگ رکے تھے جن سے خون بہہ بہہ کر سامنے رکے ایک پتیل کے قہال میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ وہ قہض شکل اور چلیے سے کوئی سا دھو لگ رہا تھا۔ اس کا گنجا سر کمرے میں لگے ایک بلب کی زبردستی میں خوب چمک رہا تھا یوں لگتا جیسے اس نے اپنے سر میں سروس کے تیل کا خوب استعمال کیا ہو۔

قہال میں جمع ہوتے خون میں اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ڈبو ڈبو کر وہ اپنے ہاتھ پر پھیر رہا تھا جس سے اس کے ہاتھ پر خون ایک پیر کی صورت جتا جا رہا تھا اور ایک موٹی لگتی جا رہی تھی۔ یہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر بندروں کی کھوپڑیوں پر بھی پھونکتا جا رہا تھا غالباً وہ کوئی منتر پڑھ رہا تھا لیکن کوئی نامانوس ہی زبان تھی جس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ جیسے ہی وہ ان بندروں کی کھوپڑیوں پر منتر پڑھ کر پھونکتا ان کی مردہ آنکھیں ایک جھلکے سے کھلتی اور پھر بند ہو جاتیں۔ کمرے میں اس وقت اس کے سوا کوئی اور جاندار موجود نہیں تھا۔ کچھ دیر تک یہ تماشہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے ترشول پر لٹکی ایک بندر کی کھوپڑی کو پکڑا اور کمرے کے ایک کونے کی طرف اچھال دیا۔

کھوپڑی جیسے ہی فرش سے ٹکرائی ایک زوردار آواز پیدا ہوئی اور یکدم ایک انسانی بھیر یا اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ایک انکڑائی لیتا ہوا اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ نمودار ہونے والے اس بھیرے کے تمام جسم پر لمبے سیاہ بال تھے اور اس کا بھیا نک چہرہ بھی سیاہ بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جس سے اس کے چہرے کو واضح طور نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

شلماک حاضر ہے مہاراج۔ بھیرے کے منہ سے ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ سا دھو کوئی مہاراج پکار رہا تھا کیونکہ اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اس وقت کوئی اور موجود نہیں تھا۔ سا دھو اس دوران ترشول زمین پر رکھ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا بولا۔ ”میں نے تمہیں ایک انسانی سمیٹ لانے کے لئے بھیجا تھا لیکن اتنا سا گزرنے کے باوجود بھی تم نے کام نہیں کیا۔ اسادھو غصے سے لال پیلا ہو کر اس سے مخاطب ہو رہا تھا۔

”مہاراج! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر گاؤں کے لوگوں نے میرا چچا کیا اور مجھ سے میرا شکار چھین لیا۔“ شلماک نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ سا دھو کو جواب دیتے وقت اس کے جسم پر یوں لرزہ طاری تھا کہ جیسے کسی نئی وقت سا دھو اس کو منتر سے جسم کر دے گا۔

”لیکن یہ تو ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے جو تم مجھے آج بتا رہے ہو۔“ سا دھو نے جوابا کہا۔

”جی مہاراج! آپ سچ کہہ رہے ہیں لیکن ان سات دنوں میں، میں دوسرے شکار کی تلاش میں تھا۔“ شلماک نے دوبارہ گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بات

مستند اکٹروں، حکیموں، ماہرین طب کی ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت - 100 روپے

## دل کی بیماریاں

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی، دہائی بلڈ پریشر، غذائی 5 تہدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، امراض دل کا بڑا سبب صدمات، تنہائی اور خود غرضی ہے، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تخیلیاں اور ہارٹ ایک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، ایک حکیم کا رفر خون کا عطیہ دینے سے نہ گھبرائیں، سقوط قلب کیا ہے؟ دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ ایک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں غصے کے عالم میں جسم کی کیا حالت ہوتی ہے؟ فصد آئے تو کیا کریں، غصہ کم کرنے کے لئے چند تجاویز، بچوں میں دل کی بیماریاں، بالی پاس سرجری اور فرائینڈ چکن، ایمر جنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا مہاتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوچن، ورم غلاف القلب پیری کارڈائٹس، دل کی سوچن، ورم قلب، دل کی عضل کی سوچن کارڈائٹس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں چلے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شعبہ ایجنسی نوبل اسکوائر گریجوی  
اردو بازار  
Ph: 32773302

کہتے ہوئے اس کے جسم پر مزید زرد طاری ہو گیا تھا۔  
سادو کچھ دیر تک غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا  
پھر غراتے ہوئے اس کو دوبارہ جلد شکار تلاش کرنے کا کہہ کر  
منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر اس کی طرف پھونک دیا۔ ایسا  
کرتے ہی انسانی بیٹھرا یکدم کمرے سے غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ جنگل کی طرف جانے  
والے راستے پر چل پڑا۔ جنگل اندھیرے میں اپنی تمام تر  
وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا، ہلکی ہلکی ہوا چل  
رہی تھی جس سے درختوں کے پتوں سے سرسراہٹ ہوا بہت  
عجیب لگ رہی تھی۔ چاند آسمان پر موجود تھا لیکن کبھی بھی  
کوئی آوارہ ہادل کا ٹکڑا اس کے سامنے آتا تو چل بھر کے  
لے اندھیرا چھا جاتا پھر چاند نمودار ہوتے ہی دوبارہ ہر  
طرف دودھیا روشنی پھیل جاتی۔

قافلہ اپنی رفتار سے چلا جنگل میں داخل ہو گیا۔  
راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت اور جنگلی  
جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں کبھی کبھی جھاڑیوں سے گیدڑوں  
کے بولنے کی محو آوازیں سنائی دیتیں تو چل بھر کے لئے  
جنگل کی خاموش فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوتی اور پھر یکدم  
خاموشی چھا جاتی۔ رات کے تقریباً سات بج چکے تھے اور  
جنگل میں یوں لگتا تھا جیسے رات کے بارہ بج چکے ہوں۔

جنگل میں آگے تک پہنچ جانے کی وجہ سے اب چاند  
کی روشنی بھی اس کا اندھیرا ختم کرنے میں ناکام ہو چکی تھی  
لیکن اس کے اندر بنا کچا راستہ صاف نظر آرہا تھا جس کی وجہ  
سے انہیں اس پر سفر کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی  
تھی۔ قافلہ بڑی خاموشی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا  
تھا۔ وہ تیل گاڑیاں جن میں جینز، غورتیں اور بچے سوار تھے وہ  
انہوں نے درمیان میں رکھی تھیں۔

قافلے کے آگے دلچسپ سنگھ اور دلہن والی کبھی تھی  
اور آخر میں گاؤں کے بوڑھے اور جوان اپنی اپنی تیل گاڑیوں  
کو ہاتھ چلے آ رہے تھے جنگل کے راستے سے سفر کرنے  
سے ان کو تقریباً پانچ میل کا سفر بچ جاتا تھا سوچ کر انہوں  
نے یہ راستہ اختیار کیا تھا ورنہ اگر وہ سیدھے راستے پر چلتے تو  
شاید رات کے ایک بجے تک ان کو گاؤں پہنچنا نصیب

سورج اپنے دن بھر کا سفر طے کرتا ہوا مغرب کی  
جانب رواں دواں تھا اور شام کے سائے پھیلنے لگے  
تھے۔ دلچسپ سنگھ کناج وغیرہ سے فارغ ہو کر اور تمام بارانی  
کھانا کھا کر واپسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی  
لاکھ کوششوں کے باوجود وہ دن کی روشنی میں واپسی اختیار نہ  
کر سکے تھے۔ رسومات کی بہتات اور کھانا تیار ہونے میں دیر  
ہو گئی تھی اس لئے وہ بھی مجبور تھے اور جیسے تھے کر کے اب  
واپسی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ جینز کا سامان دو تیل  
گاڑیوں پر لاد دیا گیا تھا اور تمام غورتیں اور بچے اپنی اپنی تیل  
گاڑیوں میں براہِ جان ہو چکے تھے اور دلچسپ سنگھ اپنی دلہن  
پر بہت کوڑ کولنے لگے اپنی کبھی میں سوار ہو چکا تھا گاؤں کے کچھ  
لوگ انہیں گاؤں کی سرحد تک چھوڑنے آئے تھے اور پھر  
انہیں الوداع کہہ کر واپس اپنے گھروں کو چل دیئے۔

شام کے سائے گہرے ہونے کی وجہ سے لگایا گیا  
اندھیرا چار سو پھلنے لگا تھا اور تمام بارانیوں کو اپنے گھروں کو  
لوٹنے کی جلدی تھی لیکن اس کے ساتھ رات کا خوف بھی  
طاری تھا۔ کچھ روز پہلے کچھ گاؤں سے ایک عجیب و غریب  
مخلوق کے قصے ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکے تھے اس لئے  
ایک انجانا سا خوف ان پر طاری تھا۔ اتنی بڑی ہارٹ کورات  
کو کھڑا دلچسپ سنگھ کے سرالوں کے بس کی بات نہیں تھی  
اس لئے مجبوراً انہیں واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

واپس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ پندرہ میل کی  
مسافت پر تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک شارٹ راستہ بھی  
ان کے گاؤں کی طرف جاتا تھا لیکن اس کے لئے انہیں ایک  
گھنے جنگل میں بنے ایک کچھ راستے سے ہو کر جانا پڑتا۔  
تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد قافلہ رک  
گیا اور چند بوڑھے اور کچھ دارو کوں نے باہمی مشورے سے



ہوتا۔ اکا دکا ہوتے تو شاید مرکز بھی ایسا کرنے کا نہ سوچے چونکہ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لئے انہوں نے یہ خطرناک راستہ اختیار کرنے کا سوچا تھا۔

قافلہ کو چلتے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ بھی مطمئن لیکن ہوشیاری سے اپنے سفر پر رواں دواں تھے۔ دلچسپ سنگھ کے برابر میں اس کی دلہن پریت کو رکھی کبھی دکھائی دے رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک کچھ ہونے والا ہو لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ڈری ڈری دلچسپ سنگھ کے بازو سے چسبی بیٹھی تھی اور خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دلچسپ سنگھ اس کی اندرونی کیفیت سے محفوظ ہو رہا تھا وہ چونکہ خود ایک بہادر شخص تھا اس لئے اس پر کسی قسم کا کوئی خوف طاری نہیں تھا البتہ اسے اس بات کی فکر ضرور تھی کہ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور اس وحشت زدہ ماحول کی وجہ سے عورتوں اور بچوں پر ایک وحشت کی کیفیت طاری تھی۔ اس ہے اسے بھی جلد از جلد اس وحشت زدہ ماحول سے نکل کر اپنے گاؤں پہنچنے کی فکر تھی۔ ابھی انہیں مزید آدھا میل سفر طے کئے ہوا ہوگا۔

اچانک جنگل کے اندر سے ایک انتہائی خوفناک اور دل دہلا دینے والی چیخ سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بھیڑیا اپنی تمام طاقت کے ساتھ چلا جا ہو۔ جنگل کے خاموش ماحول میں اچانک اس چیخ نے پھل چلا دی جس کو سنتے ہی درختوں پر بیٹھے پرندے گھبرا کر اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر آسمان پر اڑنے لگے اور جھاڑیوں میں دبکے چھوٹے موٹے جانور جو بڑی حیرت سے قافلے کو جاتا دیکھ رہے تھے نکل نکل کر یوں بھاگنے لگے جیسے اگر انہیں ایک لمحے کی بھی دیر ہوگئی تو وہ عفریت ان کو ہڑپ کر جائے گی۔

چیخ کے سنتے ہی عورتیں اور بچے خوف سے چیخنے چلانے لگے اور خود دلچسپ سنگھ کے برابر بیٹھی اس کی دلہن بھی خوف سے لہرائی ہوئی اس کی جھولی میں گر گئی۔ دلچسپ سنگھ نے جلدی سے اسے ایک طرف لٹایا اور جلدی سے بھی رکھا کر عورتوں اور بچوں والی تیل گاڑیوں کی طرف دوڑا اچھاں

کھلبلی چچی ہوئی تھی بچوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کچھ بچے اور عورتیں خوف سے رو رہی تھیں۔

دلچسپ سنگھ کو دیکھ کر ان میں سے کچھ عورتیں خوف سے چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ دلچسپ سنگھ نے انہیں حوصلہ دیا اور خاموش رہنے کا کہہ کر دوسرے نوجوان کے پاس پہنچا جو اس کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھوں میں ہتھیاروں اور لٹائیاں اٹھائی ہوئی تھیں اور کچھ افراد نے اپنے ہاتھوں میں لائٹیں اٹھائی ہوئی تھیں جن کی لو کی پھڑپھڑائی روشنی اندھیرے کو کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

نوجوانوں کے نزدیک پہنچتے ہیں دلچسپ سنگھ نے ان کو کوئی ہدایت دی جسے سن کر ان میں سے چند افراد عورتوں اور بچوں کی تیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک طرح سے انہوں نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ باقی بچ جانے والے چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر دلچسپ سنگھ قافلے کے آگے آگے چلے گا۔

قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک چیخ سنائی دینے کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دی تھی لیکن وہ سب چونکا تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھ میں تھامے اس عفریت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس عفریت کو زمین کھا گئی ہو یا آسمان نکل گیا ہو۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد بھی دوبارہ وہ خوفناک آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ایسا محسوس کرتے ہی ان پر طاری خوف کچھ کم ہوا اور وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگے۔ اس بار وہ سب پہلے سے زیادہ چوکے تھے اور ہر قسم کی مصیبت سے بچنے کے لئے تیار تھے۔

ابھی انہیں چلے چند منٹ ہی ہوئے تھے ایک بار پھر وہی دل دہلا دینے والی چیخ دوبارہ سنائی جو کہ اس بار ان کے قریب سے ہی سنی گئی تھی اور پھر آگے آگے ان کے سامنے ایک وحشت ناک اور رگوں میں خون جمادینے والا منظر ایک انسانی بھیڑ بے شکل میں نمودار ہوا۔

چاند کی دودھیا چاندنی میں اس کے جسم پر لمبے اور

گہرے سیاہ بال بہت خوفناک منظر پیش کر رہے تھے اور کا چہرہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس کے اندر سے چمکتی اس کی آنکھیں دور سے ہی صاف نظر آرہی تھیں۔ بچے اور عورتیں تو اسے قریب دیکھتے ہی چیخنے چلانے لگے لیکن نوجوان اس کو دیکھتے ہی اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھوں میں تھامے اس کے آگے کھڑے ہو گئے ان سب کا اندازہ جارحانہ تھا کہ اگر اس عفریت نے ان میں سے کسی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو وہ ان سے بچ نہیں پائے گی۔

وہ خوفناک بھیڑیاء ملک تھا جسے اس سادھو نے نئی جینٹ ڈھونڈنے کے لئے دوبارہ بھیجا تھا۔ اور اس وہ عفریت اپنے آقا کا حکم بجالانے کے لئے اپنے شکار کی تلاش میں تھا جس کے لئے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس کا شکار اس کے سامنے خود بخود چل کر آ گیا تھا اور وہ سادھو کے عتاب سے بچنے کے لئے یہ اب یہ موقعہ دوبارہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا اس لئے وہ ان کے سامنے نمودار ہو گیا تھا۔

نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ عفریت دھاڑتا ہوا ان کی جانب بڑھا اور ایک کر ایک تیل گاڑی جس پر بچے سوار تھے اور بچے چلا رہے تھے ان پر حملہ آور ہوا۔ نوجوانوں نے گھبرا کر جواب میں اپنے ہتھیاروں سے اس سے بچاؤ کے لئے حملہ کیا لیکن وہ عفریت ان کے انداز سے سے کہیں زیادہ تیز اور جالا کا تھی اس نے تیزی سے خود کو ان کے وار سے بچا لے ہوئے جھپٹ کر تیل گاڑی سے ایک چھوٹے بچے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اسی دوران نوجوان اس کے مزید نزدیک پہنچ گئے تھے انہوں نے جلدی سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں سے وار کر دیا بہت سے وار تو ان کے بے کار ہو گئے۔

لیکن ان میں سے چند ایک ڈنڈوں کی ضربیں اس کی پیٹھ پر اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ پیٹھ پر ڈنڈوں کی ضرب کھاتے ہی اس عفریت کے منہ سے تکلیف کی شدت سے بڑی ڈراؤنی آوازیں نکلیں اور اس نے جلدی سے ہاتھ میں دیوبچے ہوئے بچے کو دوڑ پھینک کر اپنے بچاؤ کے لئے ان حملہ آور نوجوانوں پر حملہ کر دیا جو نوجوان اس کے زیادہ

نزدیک تھا اس کے جسم پر اس کا زوردار ہاتھ بڑا اور وہ اچھل کر دور جا کر اب دیکھ کر دوسرے نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ دلچسپ سنگھ اس دوران خود بھی اپنے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈا اٹھائے اس عفریت کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور دل ہی دل میں اس کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کے دائیں پہلو کی طرف سے گھوم کر اس پر ایک زوردار وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران وہ عفریت سنبھل کر خود کو اس کے حملے سے بچا لیتی تھی۔

یہ دیکھ کر دلچسپ نے دوبارہ اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ عفریت اتنے زیادہ افراد سے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت بھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بھاگتی ہوئی جنگل کے اندر گھس گئی اور کچھ ہی دیر میں ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

عشاء کا وقت گزر رہی تھی رشید کی ماں اپنے ناپاک منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار ہی وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تاکہ ان کے سوتے ہی وہ اپنے مذموم کام کے لئے گھر سے روانہ ہو سکے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی ایک بہو کا گلہ دیوبچے دے لیکن وہ ایسا کرنے سے مجبور تھی نہانے اسے اپنی بہو سے کہا پھر تھا حالانکہ وہ بیچاری اس کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا کر تھی اور اسے کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں دیتی تھی لیکن پھر اس کی ساس اس کی دشمن بنی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد ان کے کمرے کی بتی بجھنے پر وہ خاموشی سے اٹھی اور گھر کا دروازہ کھول کر آہستہ سے اسے باہر سے بند کر کے گلیوں سے ہوتی ہوئی قبرستان جانے والے راستے پر چل پڑی۔ اس کا شوہر بشیر جو ایک راج گیر تھا اور محنت مزدوری کر کے اپنے بیوی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ وہ بھی ہر دلچسپ شخص تھا اور ہر کسی سے خس اور خوش ہو کر بات کرتا تھا اور اپنی مزدوری اور محنت کے لئے کسی سے بھی بحث نہیں کرتا تھا اور جو بھی اسے جو مزدوری دے دیتا تھا وہ

خاموشی سے لے لیتا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے اس کی کمائی میں بہت برکت ڈال دی تھی اور اس کے گھر کا گزر بسر بہت اچھا ہونے لگا تھا۔

لیکن قسمت بھی شاید اس کے خلاف ہو چکی تھی کہ ایک روز اسے ایک بوسیدہ مکان کی مرمت کا کام ملا۔ وہ صبح سویرے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کام کی طرف چل نکلا۔ وہ چونکہ خود مستی تھا اور ایک مزدور کو بھی اس نے اپنے ساتھ لیا اور اس مکان میں پہنچ کر مزدور کو کام سمجھانے لگا۔ مکان کافی عرصہ سے بوسیدہ حالت میں ویران پڑا تھا اور اس کو گاؤں کے ایک خوشحال شخص نے اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور اس کو مرمت کروا کر خود اس میں رہائش رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

گاؤں میں بشیر مستی کی خوش اخلاقی اور کام کی دھوم تھی اس لئے اس نے بھی اس کام کے لئے اسی کا انتخاب کیا تھا حالانکہ شہر میں ایک سے ایک مانج کیڑل جاتا تھا لیکن اس نے ان سب پر بشیر کو فوٹیت دینا مناسب سمجھا اور اس کے نتیجے میں آج وہ اس بوسیدہ مکان میں موجود تھے۔

مکان کے مالک نے تمام کام چونکہ اس کو پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لئے وہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ مکان کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے کافی سالوں سے وہ ویران پڑا ہے اور اس کے اندر کی طرف جنگلی جھاڑیاں اور خورد و گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جا بجا جگی جگی اینٹیں ٹھہری پڑی تھیں جن میں سے بہت سی ٹوٹی ہوئی تھیں کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں خالی تھیں اور صرف ان میں لگی چوکنٹیں موجود تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان کے دروازے اور کھڑکیاں چمک کر لے گیا ہو۔ یہ تقریباً چھ کمروں پر مشتمل مکان تھا اور اس کی اوپری منزل نہیں تھی۔ کمروں کے اندر ہر طرف گندمی ٹھہری ہوئی تھی اور ایک عجیب طرح کا قفن پھیلا ہوا تھا۔ بشیر اور مزدور اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو پریشان ہو گئے کہ کیسے اس جگہ کو پھر سے رہنے کی قابل بنایا نہیں گئے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس جاہ حال مکان کے مالک نے انہیں منہ لگی مزدوری دینے کی حامی بھر لی تھی اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے

تھے۔ ان دونوں نے اپنے اوزاروں کا تھیلا ایک جانب تھوڑی سی جگہ صاف کر کے رکھ دیا اور پھر اینٹیں اٹھا اٹھا کر ایک طرف پھینکنے لگے۔

ابھی انہوں نے کچھ اینٹیں ہی ایک طرف پھینکی تھیں اچانک ایک کالا سیاہ سانپ پھنکراتا ہوا ایک اینٹوں کے ڈھیر سے نکلا اور بڑی تیزی سے اپنے نزدیک بشیر کو پا کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔ اس اچانک افتاد پر بشیر اور مزدور گھبرا کر باہر کی جانب لپکے لیکن اپنے پیچھے رکھی اینٹوں کے ڈھیر سے لڑا کر نیچے گر گئے۔

بشیر چونکہ مزدور کے آگے کی جانب مگرا تھا اور کسی قدر سانپ کے نزدیک بھی تھا اس لئے وہ لپٹ میں آ گیا اور سانپ کے ڈسنے کا شکار ہو گیا۔ مزدور یہ دیکھ کر فوراً دوبارہ اٹھا اور چیخا ہوا باہر کی جانب بھاگا۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ چیخا چلاتا گاؤں کے مکالوں کی جانب بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

گاؤں پر زیادہ پڑا نہیں تھا بس اکا دکا دوکانیں وہاں تھیں جو صبح سویرے ہی کھل جاتی تھیں جہاں سے گاؤں کے لوگوں کو درد و دہی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں ان پر کھڑے چند گاہک اور دوکانداروں نے جب اسے حواس باختہ اپنی جانب بھاگتے دیکھا تو وہ بھی دوکانوں سے باہر نکل کر اس کی جانب لپکے مزدور تیزی سے بھاگتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا اور لہر آ کر ان کے قریب گر گیا اور بیہوش ہو گیا۔

یہ ایک قدرتی عمل ہے کہ معصیت کے وقت جب کسی کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا تو وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

بہی حال اس مزدور کا ہوا وہ بھی ان کے نزدیک گر کر بیہوش ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے دو جوان بھاگ کر گاؤں کے اکلوتے حکیم کو بلا لائے جس نے اس کی نبض دیکھ کر اور وہاں موجود لوگوں سے باہمی بات چیت کر کے انہیں سنا کر بلایا اور تھیلے میں سے ایک چٹکی دوا لے کر اس مزدور کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوکاندار سے پانی طلب کر کے اس کا ایک گھنٹ اس مزدور کا

منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ کچھ پانی اس کے منہ سے بہہ نکلا لیکن کچھ مقدار اس کے حلق میں اتر چکی تھی اور غالباً اس پانی کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود دوا بھی اس کے حلق سے اتر چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں مزدور نے اپنی آنکھیں کھول دیں پہلے تو وہ کوئی کوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت دکھائی تو وہ چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اس کے بتلانے پر گاؤں کے چند جوان اس بوسیدہ مکان کی جانب بھاگے۔

لیکن انہوں نے وہاں پہنچ کر جو منظر اپنی جانگی آنکھوں سے دیکھا وہ ان کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ بشیر کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور اس کا چہرہ بھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بڑی اچھے طریقے سے اسے کونکوں کی بمٹی میں پکایا ہو۔ اس کے منہ سے سفید رنگ کی جھاگ نکل کر جم چکی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ خوف سے اس کے نزدیک بھی نہیں جا رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں اس سانپ کو تلاش کر رہی تھیں جس کے متعلق وہ مزدور کی زبان سن چکے تھے۔ لیکن دور دور تک انہیں کوئی سانپ یا کوئی اور موذی جانور نظر نہیں آیا غالباً وہ موذی اپنا کام دکھا کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

کچھ دیر تک سکتے کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد انہیں ہوش آیا اور انہوں نے جلدی سے ایک نو جوان کو رشید کے گھر کی جانب دوڑایا اور ساتھ ہی ایک چادر اور چارپائی بھی ساتھ لانے کے لیے کہا یہ سننے ہی وہ نو جوان جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔ اور کچھ ہی دیر میں رشید کی ماں روٹی دھونی اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اس نے دروازہ آسمان سر پر اٹھایا تھا اور اس کے ساتھ گاؤں کے اور بہت سے لوگ اور عورتیں بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں آ گئے تھے۔

گاؤں میں ایک کھرام سانچ گیا تھا ہر شخص انگلیاں ہٹا کر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل بشیر جوان کے درمیان تھا اب ان سے بہت دور جا چکا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد رشید کی ماں رفتہ رفتہ اپنے

شوہر کا غم بھول چکی تھی اور پھر دوبارہ سے اپنے کاموں میں مگن ہو چکی تھی۔ رشید کی بہو اس کی خدمت کر کے اسے اپنے سر کا غم بھلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی لیکن بچانے کی بات بھی کر رشید کی ماں اس کی دشمن بن گئی تھی اور کسی نہ کسی طریقے سے اس سے اپنے بیٹے رشید کا پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتی تھی۔ اس کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی اور اس سلسلے میں اس نے اپنی ایک دو بیٹیوں سے بھی تذکرہ کیا تھا جو خود اسی ڈگر پر چل رہی تھیں جس پر اس وقت وہ خود بھی اس لئے ان میں سے ہی اس کی ایک سبکی لے اسے شاہ بابا کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آج اس کے پاس شاہ بابا کا دیا ہوا ایک تعویذ تھا جسے دفنانے کے لئے وہ اس وقت رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل پڑی تھی۔

پہلے تو اس نے ٹیکے موچی کو اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ کر کے ایک دوبار قبرستان کا چکر لگایا تھا اور اس میں ناکام رہی تھی لیکن پھر اس نے ہمت کر کے خود ہی اس کام کو سر انجام دینے کا ارادہ کیا اس سے اس کا کوئی راز و دھرم نہیں ہوگا اور اس کے پیسے بھی بچ سکتے تھے۔ کیونکہ پہلے وہ دوبار ٹیکے موچی کو پیسے دے چکی تھی اور اس کے لئے اس نے رشید سے سو بہانے بنائے تھے اس لئے اب کیا کہہ کر تیسری بار رشید سے پیسے مانگتی اس سے وہ اس پر شک کر سکتا تھا اور پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنے پیسوں کا آخر کیا کرتی ہے حالانکہ اس کی ضرورت کی ہر شے رشید اس کو گھر میں ہی لاکر دیتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے یہ کام خود ہی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت اس کی چال میں تیزی تھی اور اسے اپنی منزل کا بھی بخوبی اندازہ تھا کیونکہ وہ دن کی روشنی میں وہاں کی نشانی ذہن میں رکھ آئی تھی اس لئے وہ سیدھی اسی راستے پر چل رہی تھی جو سیدھا سی بوسیدہ قبر کی طرف ہی جاتا تھا۔

قبرستان گاؤں سے باہر تھا زیادہ قبریں نہیں تھیں لیکن اس میں لگے ٹیکروں اور پیلوں کے درختوں نے ایک جمنڈی صورت اختیار کر لی تھی۔ چلتے چلتے وہ قبرستان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی اور زمین پر ادھر ادھر دھکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

راستے میں پڑنے والی چند ہی قبروں پر دیئے جل رہے تھے لیکن اسے ان سے کوئی غرض نہیں تھی وہ سیدھی چلتی ہوئی اسی طرف جا رہی تھی وہاں بوسیدہ قبر تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچی جہاں اس کی توقع کے عین مطابق اس پر ایک چراغ روشن تھا جس میں تیل لالاب بھرا ہوا تھا اور اس چراغ کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہوا نہیں چل رہی تھی ورنہ شاید آج بھی اسے ناکام لوٹنا پڑتا اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے بندھا تعویذ کھولا اور جلدی سے اسے قبر کے سر ہانے بیٹھ کر ایک لکڑی کی مدد سے زمین کھودی اور تعویذ میں اس رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی اور اس مٹی پر وہاں بیٹھ کر کھڑے کر دی والے ہاتھ جھاڑے اور جلدی سے واپس گھر کی طرف چل دی۔ اس کام کو انجام دینے کی خوشی یا جوش کی وجہ سے پہلے تو اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ تنہا رات کے اندھیرے میں قبرستان میں ایک بوسیدہ قبر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

لیکن جب اس نے یہ کام مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اپنے گھر کا رستہ ناپا تو پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا۔ اور اب تو اسے قبرستان کے اندر سے کہیں کہیں گیدڑوں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھے جیسے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے ہوں اور اب تو اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ لوگ باتیں کرنے کے دوران اس کا نام بھی لے رہے ہوں پہلے تو اسے نے یہ سب اپنا وہم سمجھا۔

لیکن جب ان آوازیں نے شدت اختیار کر لی تو وہ اندھا دھند اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی اپنے راستے میں آنے والی قبروں پر بھی چڑھتی جا رہی ہے اس وقت تو بس اس پر ایک ہی بات کی دھن سوار تھی کہ وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچ جائے۔

وہ جتنی تیزی سے دوڑ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں اس نے بھاگتے ہوئے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ

آوازیں اس قدر تیز تھیں جیسے اس کے کانوں کے پردے چیر کر اس کے دماغ میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مسلسل دوڑنے کے بعد وہ قبرستان سے باہر نکل کر گھر کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہو چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچ گئی اب اسے وہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں اس نے جلدی سے گھر کے دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو کر آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

گھر میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس کے بیٹے اور بہو کے کمرے کی جی بھی بند تھی۔ شاید وہ دونوں اس کی غیر موجودگی سے بے خبر ہی رہے تھے ورنہ اس وقت وہ دونوں اس کے انتظار میں صحن میں ہی موجود ہوتے۔ بیدار نہ کر اس کی تسلی ہوگی اور وہ جلدی سے اپنے بستر کی جانب بڑھی اور خاموشی سے چار داڑھ کر سونگی۔

☆.....☆.....☆

عفریت کو قاعب ہوتے دیکھ کر برات والوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر سے اپنا سفر شروع کر دیا۔ اس بار انہوں نے عورتوں اور بچوں والی تیل گاڑیوں کو مزید اپنے گھیرے میں لے لیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہوں اور خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ چاند خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا اور آسمان پر ستارے بڑی حیرت سے رات کے اندھیرے میں اس قافلے کو دیکھ رہے تھے جو سیدھا ایک راستے پر گامزن تھا جو ان سب کے لئے ایک نل گاہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ سب اپنے آنے والے انجام سے بے خبر اپنی منزل کی جانب چل رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے جنگل میں لگے درختوں کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور اور چلے ہوئے کہ ان کے سامنے ایک بہت ہی خستہ حال اور پرانے مندر کی عمارت دکھائی دی۔ اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں کی گردش کیل و نہار نے اس کی خوبصورتی کو کھوج کھایا ہو۔

پوری عمارت پر خوبصورت چھائی ہوئی تھی وہ سب چونکہ پہلے کبھی اس طرف نہیں آئے تھے اس لئے اس

عمارت سے ناواقف تھے لیکن اب قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی تو انہیں پتہ چلا کہ اس خوفناک جنگل میں ایک پرانا اور ویران مندر بھی موجود ہے۔ مندر کے بڑے گیٹ کے سامنے چابجا جنگلی پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں چوہے ہلایں بھاگ رہی تھیں جو چاند کی چاندنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔

عمارت کی دیواروں کا پلستر تقریباً اوجڑ چکا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے برج بہت ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ چاند چلن ہوا میں مندر کے اوپر آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے مندر پر چاندنی بکھری ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے عین دروازے کے اندر سے روشنی سی جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ اس جنگل میں ایسی روشنی کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے لیکن حقیقت ان کے سامنے موجود تھی۔ عین دروازے کے سامنے ایک سوکھا تالاب بھی موجود تھا جس کے اندر کسی پرانے درخت کی جڑیں پانچ چھ فٹ تک اونچی اٹھی ہوئی تھیں اور درخت کا نام و نشان تک موجود نہیں تھا لیکن جڑیں موجود تھیں بڑا عجیب سا منظر تھا جو ان کی عقلوں پر حاوی تھا۔ وہ وہاں سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے کسی ناپیدہ قوت نے ان سب کو پھیر کا بنا دیا ہو اور وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے بھاگنے سے قاصر تھے۔

ابھی انہیں وہاں کھڑے کچھ لمحے ہی ہوئے ہوئے تھے کہ اچانک مندر کے سامنے والی دیوار ایک دم پھٹی اور اس میں سے ایک عورت کا ادھونگا جسم باہر نکلا جس کا ایک ہاتھ آگے کی جانب بڑھا ہوا تھا اور اس کو دوسرا ہاتھ اس کے پیچھے کی جانب تھا اور اس کی آنکھیں سیاہ چلتیوں سے عاری تھیں۔ جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ اس اچانک افتاد پر وہ بھٹکا کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر دفعتاً اس کھلتی عورت نے اپنا دایاں ہاتھ ایک تیل گاڑی کی جانب بڑھایا اور ایک عورت کی گود میں موجود بچے کو بچھٹ کر چھینا اور واپس دیوار میں غائب ہو گئی۔ اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس کا ہاتھ اس تیل گاڑی تک یوں پہنچ گیا تھا جیسے وہ کوئی ربڑ کا بنا ہوا تھا۔ وہ جو ضرورت کے وقت کھینچتا چلا جا رہا ہو۔ یہ سب

کچھ آٹا ٹاٹا ہوا اور جتنی دیر میں وہ سب اس کے بارے میں سوچتے وہ عفریت اپنا کام کر چکی تھی۔

کچھ دیر تک وہ بت بنے یہ سوچتے رہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے اور پھر جب انہیں حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب چیخنے چلانے لگے اور جس عورت کا بچہ وہ عفریت لے گئی تھی وہ دھاڑیں مار مار کر کہن کر رہی تھی۔ دلچسپ سنگھ چونکہ سب سے آگے والی کبھی میں سوار تھا اور وہ بھی اس دوران اس تیل گاڑی کے نزدیک پہنچ چکا تھا جس میں موجود عورت بین کر رہی تھی اور پھر حقیقت کا پتہ چلتے ہی اس نے چند نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس مندر کے عین دروازے کی جانب پیش قدمی کی۔

وہ ہر حالت میں اس بچے کو واپس لانے کا فیصلہ کر چکا تھا چاہے اس کے لئے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے یہ سوچ کر اس نے غصے اور جوش سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مندر کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مندر کے اندر جانے سے پہلے اس نے کچھ اور نوجوانوں کو قافلے کے افراد کی حفاظت کے لئے مامور کیا اور کچھ مزید ہدایات دے کر مندر کے اندر جانے والی بیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔ وہ سب چوکنے لگے اور ہوشیاری سے اپنے ہاتھوں میں ڈٹے قلمے بیڑھیوں چڑھنے لگے۔ بیڑھیوں پر جا بجا درختوں کے پتے اور مٹی جی جواں کے قدم رکھنے پر چرچاہٹ کی آوازیں نکال رہے تھے۔ رات کے سنانے میں بچوں کی یہ آوازیں بہت خوفزدہ کر رہی تھیں۔ بیڑھیوں چڑھ کر اوپر پہنچتے ہی سامنے ایک بڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف بہت سے کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ حجت سے لگتے ہوئے کڑیوں کے جالے زمین تک پہنچے ہوئے تھے اور فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کافی سارے گڑھے بنے ہوئے تھے کچھ بھی دیر میں وہ سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہو گئے جہاں سے ہلکی ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کی دیواروں کا رنگ گہرا پیلے رنگ کا تھا جس پر چابجا ہندوؤں کے دیوتاؤں کی



تصادف ہوئی تھی۔ ہاں کے وسط میں ایک بہت بڑا بت نصب تھا جس کے بہت سے ہاتھوں میں مختلف چیزیں پکڑیں ہوئی تھیں۔

بت کے قدموں میں خشک پھولوں کا ڈھیر تھا اور بہت سے خشک تاریل کے جھلکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی دور میں یہ ایک پرکشش عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن اب اس پر ایک عجیب سی عورت چھائی ہوئی تھی۔ نجانے کن حالات کے تحت لوگ اسے خیر باد کہہ گئے ہوں گے۔ ہاں کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا ہوگا۔

چاروں طرف ایک پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہاں بالکل خالی تھا روشنی کے لئے چھت پر ایک کم واٹ والا بلب روشن تھا نجانے اس غیر آباد اور انسانی آبادی سے دور اس ویرانہ مندر میں یوں روشنی کا انتظام کیسے کیا گیا ہوگا مگر اس وقت ان باتوں پر سوچنے کی بجائے اس گمشدہ بچے کی جان بچانے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے اس خیال کو ذہن سے فوراً جھٹکا اور بڑی خاموشی سے سامنے نظر آنے والے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے جو ہاں کے دائیں طرف ایک کونے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا دروازہ ایک طرف کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر اندر دکھائی دے رہا تھا یہ کل پانچ افراد تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں مضبوط ڈھکے اٹھائے ہوئے تھے اور چوکنا تھے۔

دلچسپیت سنکھ نے انہیں ایک لائن میں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دوا فرلو کو اپنے پیچھے نظر رکھنے کا اشارہ کر کے اس چھوٹے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی کہ شاید اسے کچھ نظر آجائے لیکن بہت کوشش کے باوجود اسے اندر اندر یہی نظر آیا۔ وہ وہیں رک کر اندر سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر خاموشی ہی تھی اور کوئی آواز یا آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ابھی انہیں وہاں کھڑے تھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ ہاں کی دیواریں یوں ہلنے لگیں جیسے باہر زلزلہ آگیا ہو۔ ہاں میں رکھا سب سامان یوں زور زور سے ہلنے لگا جیسے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر

زوردار پکڑ دینے لگا ہو۔ سامان کے ساتھ ساتھ وہ سب لوگ خود کو بھی گھومتا محسوس کرنے لگے انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی کہار کے برتن بنانے والے تخت یعنی آوی پر بیٹھ گئے ہوں انہیں اپنا آپ تیزی سے گھومتا محسوس ہوا یہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور جہاں تھے وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ سب کچھ تھوڑی دیر تک ہوا اس کے بعد ہاں میں ٹھمبیر خاموشی چھا گئی۔

پھر اچانک ہاں میں تیز ہٹکرو بجنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ساتھ تیز ہوا کے جھکڑوں کا شور بھی سنائی دیا یوں لگا جیسے باہر یکدم بہت زور کا طوفان آگیا ہو لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے لئے ہوا پھر ایکدم خاموشی چھا گئی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کے ساتھ قسمت کیا کھیل رہی ہے اور وہ کس مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ وہ سب سب ایکدم مرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ کیسے اب کیا ظہور میں آتا ہے۔

صدیوں پرانا مندر رات کا وقت اور کسی انسان کا وہاں موجود ہونا رگوں میں خون منجمد کروینے کے لئے کافی تھا۔ دلچسپیت سنکھ خود ایک بہادر نو جوان تھا لیکن جس طرح بے درپے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس سے وہ بھی کچھ خوفزدہ اور پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں اس سے بچنے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ اسے اس معصوم بچے کی بھی فکر ستائے جا رہی تھی جسے وہ عفریت اٹھا کر نجانے کہاں لے گئی تھی۔

اس بچے کی ماں کا روتا اور دھاڑیں مارتا چہرہ بار بار اس کے سامنے آ رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ اس مندر میں داخل ہونے کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آخر وہ عفریت اس بچے کو اس مندر کے اندر کہاں لے گئی ہے اور جو واقعات ان کے ساتھ پیش آ رہے تھے وہ بھی اس بات کا ثبوت تھے اس ویرانہ مندر کے اندر طاعون کی طاقتیں رہائش پذیر تھیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے سے پہلے وہ اسے اس عفریت کے چنگل سے چھڑائے۔ لیکن ابھی تک وہ اندھیرے میں ہی ٹانگ ٹوٹیاں مارتے پھر رہے تھے۔ ہاں میں خاموشی چھاتے ہی وہ دوبارہ کوئی اور

راستہ ڈھونڈنے لگے اور پھر تھوڑی سی کوشش سے انہیں ہاں کے انتہائی بائیں کونے میں چند سیڑھیاں کی تہہ خانے میں اترتی دکھائی دیں۔

سیڑھیوں کے نزدیک رک کر انہوں نے سرگوشی میں کوئی بات کی اور پھر تین افراد آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور نیچے جاتی سیڑھیاں اترنے لگے۔ دوا فرلو ان کے پیچھے دوسری طرف منہ کئے احتیاط سے ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے اس طرح انہوں نے دوڑوں طرف نظر رکھی ہوئی تھی تاکہ کسی بھی آنے والے خطرے سے بچنا جاسکے۔ سیڑھیاں زیادہ چوڑی نہیں تھیں اور نیچے اترنے میں انہیں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیوں کہ سیڑھی پر ان کا مکمل تکیہ پڑنے کی بجائے آدھا تکیہ رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں نیچے اترنے میں بہت پریشانی ہو رہی تھی۔ سمجھ سے بالا تھا کہ جس کسی نے بھی یہ سیڑھیاں بنائی تھیں کیا سوچ کر بنائی تھیں کہ ایک انسان کو نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔ سیڑھیوں کی تعداد کم و بیش تیس بنیائیس کے قریب ضرور رہی ہوگی اس کا اندازہ انہیں نیچے اترتے ہوئے ہو رہا تھا جیسے جیسے وہ تہہ خانے میں اترتے جا رہے تھے اس میں ٹھٹھن بڑھتی جا رہی تھی اور ایسا نقص پھیلا ہوا تھا جیسے کسی مذبح خانے سے خون اور لاشوں کی بدبو آتی ہے بدبو اس قدر تیز تھی کہ انہیں اپنے ناک پر بے اختیار ہاتھ رکھنے پڑے۔ لیکن سزا اندزدہ بدبو انہیں اپنے دماغ میں محسوس ہو رہی تھی۔

تہہ خانے کی جب آخری پانچ سیڑھیاں بچ گئیں تو وہ وہیں رک کر اندر کا جائزہ لینے لگے اندر بالکل اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے فرش پر سیاہی مائل مادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پھاڑے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر وہ کیا چیز محسوس ہو رہی ہے۔ چابجا پھیلی ہوئی تھی اور پھر ایک جھلکے سے وہ سب اچھل پڑے خدا کی پناہ وہ سیاہی مائل مادہ کچھ اور نہیں بلکہ خون تھا اور وہ سزا اند والی بدبو بھی اسی میں سے ہی آ رہی تھی نجانے وہ کسی جانور کا خون تھا یا کسی انسان کا وہ سب یہ سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس وقت تو انہیں اپنا آپ بچانا مشکل ہو رہا تھا۔

تہہ خانے میں ایک کونے میں ایک کھجور کے پتوں والی پرانی سے چٹائی بھی پھینچی نظر آ رہی تھی جس پر ایک طرف ایک مٹی کا بڑا سا پیالہ رکھا تھا اور ایک طرف لوہے کا ایک بڑا سا صندوق بھی رکھا تھا جس پر سیاہ رنگ پینٹ ہوا تھا یا شاید صدیوں کی مٹی کی ایک تہہ جم چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس تہہ خانے میں کوئی دروازہ یا کھڑکی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس تہہ خانے میں اترنے کے لئے صرف وہ سیڑھیاں ہی واحد ذریعہ تھیں جن پر اس وقت وہ سب کھڑے حیرت اور خوف سے تہہ خانے کے فرش کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہ کر انہوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی اور پھر دلچسپیت سنکھ ایک نو جوان کے ساتھ اس لوہے کے صندوق کی طرف بڑھا وہ اسے کھول کر یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ شاید اس میں رکھے کسی سامان سے اس تہہ خانے کا راز معلوم ہو سکے۔ یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس لوہے کے صندوق کی جانب بڑھنے لگے۔

صندوق پر ایک بوسیدہ سا تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر دلچسپیت نے آہستہ سے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو فوراً مکمل ہو گیا غالباً بوسیدہ اور پرانا ہونے کی وجہ سے اس کا میکانزم خراب ہو گیا تھا اس لئے فوراً مکمل گیا۔ دلچسپیت نے اسے کنڈی سے نکال کر ایک طرف اچھال دیا جس سے تہہ خانے کے فرش پر ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کوئی اور آہٹ یا آواز سننے کی کوشش کرنے لگے لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ لگتا تھا اس وقت ان کے علاوہ اس جگہ کوئی اور نفس موجود نہ تھا۔

یہ دیکھ کر دلچسپیت نے آہستہ سے اس صندوق کا ڈھکن اٹھانا شروع کیا۔ اور پھر جیسے ہی اس نے پورا ڈھکن اوپر اٹھا کر اس کے اندر جھانکا ایک زوردار نقصان کا سبب اس سے نکل کر ان کے ناکوں سے ٹکرایا اور خدا کی پناہ اندر کا منظر اچھے اچھوں کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ صدیوں پرانے دیرانہ مندر کے اندر رات کے اندھیرے میں ایک تہہ خانے کے اندر صندوق میں رکھے مختلف لوگوں کے کتے ہوئے سر رکھے ہوئے تھے یوں لگتا جیسے کسی نے ابھی

ابھی ان کو ان کے جسموں سے علیحدہ کر کے اس صندوق میں بھر دیا ہو۔ یہ سب دیکھ کر وہ چیخنے چلاتے واپس بیڑھیوں کی طرف بھاگے اور جلدی جلدی اس کی بیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن یہاں کرنے پر انہیں بہت مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ مندر کے تہ خانے کی بیڑھیاں جوڑائی میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے انہیں ایسا کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ جلدی میں وہ بار بار نیچے گر رہے تھے لیکن پھر جیسے تیسے کر کے وہ آخر تہ خانے سے باہر نکلے میں کامیاب ہوئی گئے لیکن جیسے ہی انہوں نے باہر قدم رکھے وہ ایک دم ایک بمیاب شکل سا دھو سے ٹکرائے جو سیدھا ان بیڑھیوں کی جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا اور پھر یہ دیکھ کر ان کی رہی تھی ہمت بھی جواب دے گئی کہ اس سا دھو کے ایک ہاتھ میں اس بچے کا کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا جسے وہ صوٹرتے ہوئے وہ اس وقت اس خوفناک مندر کے تہ خانے سے نکل رہے تھے۔

بچے کا سر گردن تک کٹا ہوا تھا اور اس کی کٹی گردن سے بہت سی رگیں باہر جھول رہی تھیں جن سے تازہ تازہ خون فرش پر ٹپک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی اس سا دھو نے اس بچے کو ذبح کیا ہو۔ نجانے اس بد بخت سا دھو نے اس معصوم کیسا تھکنا کیا تھا یا کھیل کھیل ہو گا اور کس قدر اس بچے کو اذیت ہوئی ہوگی۔

پہلے تو سا دھو بھی اچانک ان لوگوں کے ٹکرانے کی وجہ سے ایک دم گھبرا گیا تھا اور اسی گھبراہٹ میں اس کے ہاتھیں ہاتھ میں جھومتی اس بچے کی گردن ایک جھٹکے سے نکل اور سیدی تہ خانے میں جانے والی بیڑھیوں کے اندر ایک قہار کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ لیکن اس ساری کارروائی میں وہ سب یہ ضرور دیکھ چکے تھے کہ وہ کٹا ہوا سر اس بچے کا ہی تھا۔ سا دھو کے خام خیال میں بھی نہیں تھا یوں اچانک کوئی تہ خانے سے نکل کر اس سے ٹکرائے گا اس لئے وہ بھی بے فکری سے چلتا ہوا تہ خانے کی جانب بڑھ رہا تھا لیکن پھر یوں اچانک دھکا لگنے کی وجہ سے وہ بوکھلا گیا اور بچے کی گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تہ خانے کی بیڑھیوں پر گر گئی اور لڑھکتی ہوئی اندر غائب ہو گئی اور وہ خود زین یوں ہو گیا۔

دلچسپ نگاہ اور اس کے پیچھے لپکنے والے اس کے دیگر ساتھیوں نے جلدی سے زمین پر گر کر اس سا دھو کو دبوچنا چاہا لیکن اس عرصے میں وہ سا دھو مسلسل چکا تھا زمین پر گرتے ہی اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر ان کی طرف پھونک دیا۔ دلچسپ اور اس کی ساتھیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے جسموں کو مفلوج کر دیا ہو ان کے لاکھ لپٹے چلنے کے باوجود ان کے جسموں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سا دھو ان کی حالت دیکھ کر زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ایک منتر پڑھ کر سامنے نظر آنے والی دیوار پر پھونک دیا۔ منتر ختم ہوتے ہی سامنے والی دیوار ایک سرسراہٹ سے یوں سائیل میں گھس گئی جیسے کسی نے اپنے ہاتھ سے اس دیوار کی دوسری طرف دھکیل دیا ہو۔

دیوار سرکتے ہی سامنے ایک تنگ سی راہداری نظر آ رہی تھی جس میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے چھت سے لٹکتے بڑے بڑے جالے جن میں پھنسی ہوئی بڑے سائز کی ٹکڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ راہداری کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے جگہ جگہ کھدے بنے ہوئے تھے۔ دیوار میں راستہ نمودار ہوتے ہی سا دھو نے ایک ایک کر کے سب کو اپنے کندھے پر اٹھا کر راہداری سے گزرتے ہوئے ایک اور تہ خانے کی بیڑھیاں اتر کر اس کے فرش پر لٹا دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس ویران مندر میں تہ خانوں کا جال بچھا ہو۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ تقریباً ایسے دور دراز مندروں میں ایسے تہ خانے خاص طور پر بنوائے جاتے تھے تاکہ وہاں کے سا دھو پجاری اپنے مذہم مقاصد کو دنیا کی نظروں سے چھپا سکیں۔ اور اس طرح مندروں کی آڑ میں ان کی عیاشیاں بھی کھل کر دنیا والوں کے سامنے نہ آسکیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہ لوگ کرتے تھے جنہوں نے دنیا والوں کے سامنے جھٹی سا دھو اور پجاریوں کا روپ دھار رکھا ہو لیکن حقیقت میں جو اسل سا دھو یا پجاری ہیں وہ ایسا کام کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ لوگ بھی اپنے عقیدے کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مذہب کے سچے پیروکار ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے عیاش سا دھو یا

پجاریوں کے ہمیں میں چھپے شیطان کے چیلو نے ان کے عقیدے اور مذہب کو بدنام کیا ہوا تھا۔ ان سب کو تہ خانے کے فرش پر سینٹ کی یوریوں کے طرح پنگ کر اس نے ایک کونے میں پڑے رسیوں کے ڈھیر میں سے کچھ رسیاں اٹھا کر ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔

☆.....☆.....☆

رشید نے دوکان بند کی اور اپنا تھمیل ہاتھ میں تھامے گھر کی راہ لی۔ راستے سے اس نے اپنی ماں اور بیوی کے لئے تھوڑا پھل خریدا اور اسے تھیلے میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا پھر جیسے ہی اس نے کنڈی کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ اٹھایا کہ یکدم دروازہ یوں کھل گیا جیسے کسی کو اس کے آنے کا پہلے سے ہی انتظار ہو لیکن یہ سب اچانک اتفاق تھا کیوں کہ جیسے ہی اس نے ہاتھ اٹھایا تھا اسی وقت اس کی ماں نے اچانک دروازہ کھول دیا تھا۔

رشید کی بیوی کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا اور کافی دیر سے یوں ہی چیخ چلا رہی تھی لیکن درد تھا کہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ رشید کی ماں کافی دیر تک تو اسے یوں تڑپا دیتی رہی اس کی اس حالت سے وہ سمجھ گئی تھی کہ شاہ بابا کے دیئے ہوئے تعویذ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

لیکن جب اس کی تکلیف کا قابل برداشت دیکھنے لگی تو اس نے بھی غمگینا کر گاؤں کے حکیم کو بلانے کا ارادہ کیا اور یہ وہی لمحہ تھا جب وہ اسے بلانے کے لئے باہر نکلنے لگی تھی اور اسی وقت اسے کے بیٹے نے گھر کا دروازہ بجانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا تھا۔ ماں کو دروازے میں یوں پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا پھر اس کے پوچھنے پر اس نے اس کی

بیوی کی تکلیف کے متعلق بتایا۔

رشید یہ سن کر جلدی سے گھر کے اندر داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑا تھمیل اپنی ماں کے ہاتھ میں پکڑا کر بیوی کے پاس کمرے میں پہنچا اس کی حالت واضح بہت خراب لگ رہی تھی اس نے اس کو دلدارہ دیتے ہوئے اپنی ماں کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا وہ جلد از جلد حکیم کے پاس پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی بیوی کو دوا وغیرہ دے سکے تاکہ اس کی تکلیف کم ہو سکے۔ اس کا تڑپنا اس سے بھی نہیں دیکھا گیا تھا وہ یوں تڑپ رہی تھی جیسے کوئی تیز دھارا آئے سے اس کے پیٹ کے اندرونی اعضاء کو کاٹ رہا ہو۔ بے پناہ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سرخ سے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

حکیم کا مطب گاؤں کی ٹکڑ پر ہی تھا اور زیادہ آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مطب میں زیادہ رش نہیں آتا ہوتا تھا اس کا دکا فروزی نظر آتے تھے اس لئے رشید کے وہاں پہنچنے ہی اور اس کے بتانے پر حکیم نے جلدی سے مرتبوں سے کچھ سفوف نکال کر ان کی پڑیاں بنائیں اور جلدی سے رشید کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی رشید کی ماں اس وقت اپنی بہو کے کمرے میں ہی تھی جو مسلسل تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور اب تو اس کی تکلیف میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر حکیم نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے سے ایک پڑیا نکالی اور پانی لانے کا کہہ کر سفوف اس کے منہ میں اٹھیل دیا اتنی دیر میں رشید کی ماں پانی کا گلاس لے آئی تھی حکیم نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس میں سے دو گھونٹ رشید کی بیوی کے منہ میں اٹھیل دیئے۔

دوامہ میں جاتے ہی اس کی تکلیف میں کچھ افادہ ہوتا محسوس ہوا اور اس کے چلانے میں بھی کچھ کمی آ گئی۔ یہ دیکھ کر حکیم نے تھیلے سے مزید تین پڑیاں نکال کر رشید کے ہاتھ میں تھمادیں اور اسے کچھ ہدایات دیتے ہوئے واپسی کے لئے مڑا۔ رشید اس کا تھمیل ہاتھ میں تھامے اس

کے ساتھ ہی کرے سے باہر نکل گیا۔

یہ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ پورا چاند کی رات تھی جس کی وجہ سے زمین پر چاروں طرف دودھیا روشنی بھیلی ہوئی تھی ہر چیز اس کی سفید روشنی میں یوں نظر آ رہی تھی جیسے قدرت نے کسی برش سے اس پر سفیدی پھیر دی ہو۔ آسمان صاف و شفاف ہونے کی وجہ سے اس پر چمکتے ستارے بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ شخص کی شخص کی اور دل لہبا دینے والی ہوا چل رہی تھی جس کی سرسراہٹ سے درختوں کے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

جھاڑیوں میں دیکے چھوٹے موٹے جانور اپنی منمنی منمنی سرخ آنکھوں سے اس عفریت کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو زمین پر چلنے کی بجائے اڑنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ یہ وہی انسانی بھٹریا تھا جو اس طرح کی راتوں میں اپنے آقا کے حکم کے مطابق اس کے لئے ایک انسانی بچے کی جینٹ کی تلاش میں نکلتا تھا۔ اس کا جسم سیاہ بالوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا۔

جیسے آج کی رات وہ ضرور کوئی ایسی جینٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کو دیکھ کر اس کا آقا اس سے خوش ہو جائے۔ اس کا رخ اس انسانی آبادی کی طرف تھا جس طرف یہ راستہ جا رہا تھا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اسے چلتے ہوئے کوئی انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر تھی۔ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو رات کے اس پہر چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکلے کی غلطی کرے گا۔ آبادی لگ بھگ تقریباً نصف میل کے قریب رہی ہوگی جس طرف وہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ آبادی تقریباً سو گھروں پر مشتمل تھی۔ اس وقت وہاں کے رہائشی خواب خرگوش کے حوالے سے سو رہے تھے وہاں کے آوارہ کتے زور زور سے بھونکنے میں مصروف تھے۔

وہ عفریت اس آبادی کے نزدیک پہنچ کر رک گیا وہ اوپر اوپر نظر میں دوڑا کر آبادی میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے داخل ہو کر وہ اپنے شکار کو تلاش کر سکے۔ رات کے اس پہر اگر کوئی ذی روح اس کو اس

وقت دیکھ لیتا تو شاید وہشت کے مارے مری جاتا۔ کبھی کبھار دور کہیں سے گیدڑوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں جو اس وحشت زدہ ماحول کو اور بھی خوفناک بناتی تھیں۔ آبادی کے اندر جانے والی تین گلیاں تھیں جو دائیں بائیں اور تاک کی سیدھ میں جاری تھیں۔

وہ عفریت دائیں طرف جانے والی ایک پتلی سی گلی میں داخل ہونے کے لئے مڑا۔ ابھی اس نے دو تین قدم ہی اٹھائے ہوئے کہ کہیں سے تین چار کتے بھونکنے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئے اور زور زور سے بھونکنے لگے ایسا صرف چند گھنٹوں کے لئے ہوا پھر اس عفریت کی ایک خوفناک غراہٹ سننے ہی دم دبا کر واپس بھاگ گئے۔ ان کے بھاگنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اگر انہیں وہاں کھڑے ایک گھوڑا لگا تو وہ اس خوفناک عفریت کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ خوفناک بلا ان کو واپس بھاگتے دیکھ کر دوبارہ گلی کے اندر گھس گئی۔

گلی میں تقریباً اندھیرا چھایا ہوا تھا اور دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی کتا تک نظر نہیں آ رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کتے اس کے خوف سے کہیں بہت دور بھاگ گئے تھے گلی میں موجود ایک بجلی کے کھمبے پر لگا کم پاور کا بلب بھٹکل اندھیرا کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عفریت اپنے بھاری قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی چلتے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ کسی چرتی کی مانند چاروں طرف گھوم رہا تھا جیسے اس کی تلاش ہو۔ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس کا سر چاروں طرف یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ پلاسٹک کا بنا ہوا اس میں کوئی بڑی نام کی چیز نہ ہو۔ اس آبادی کا نام فتح پور تھا جس میں تقریباً سو گھر تھے جن کے زیادہ تر مرد حضرات روزگار کے سلسلے میں شہر میں جا کر اپنی محنت مزدوری سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

چلتے میں ایک بار اپنے گھروں کا چکر لگاتے اور اس کے ساتھ ہی اپنے گھر کے افراد کو ان کی ضرورت کی چیزیں جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لائے دے جاتے اور اس کے ساتھ ہی ان کو ہفتہ بھر کا خرچ بھی دے جاتے۔ اس طرح انہی خوشی یہ سب اپنا وقت گزار رہے تھے۔ آبادی میں ایک

گورنمنٹ کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا جہاں بہت سے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسکول کا ماسٹر ایک بی اے پاس بوڑھا شخص تھا جس کا نام تھرڈن تھا وہ ایک پرائمری اسکول سمجھے جاتا تھا جو اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو چکا تھا اور اب گورنمنٹ سے پینشن لے کر اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔

قدرت نے اسے کوئی اولاد نہیں دی تھی اس لئے جو پینشن اسے ملتی تھی وہ ان دونوں کی ضرورت کے لئے بہت تھی اس لئے اس نے بغیر تنخواہ کے اس اسکول میں کچھ وقت کے لیے اپنی خدمات مہیا کر رکھی تھیں جس کا وہ حکومت سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا اس کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے حکومت کے کچھ کارندوں نے اسے اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنا کچھ وقت اس اسکول کو دے سکے۔

فتح پور کے رہائشی ماسٹر قمر دین کی بہت عزت کرتے تھے جو ان کے بچوں کو بڑے پیار سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ بہت سے گھروں کے افراد اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی اشیاء بھی کبھی کبھار ماسٹر قمر دین کے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور اس طرح ان دونوں میاں بیوی کو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک کیا کرتے تھے۔ ماسٹر قمر دین ان کی اس مہربانیوں کا دل سے اعتراف کرتا تھا اور ان کے بچوں کو بڑے پیار سے اور شفقت سے پڑھاتا تھا۔ بچے بھی اسے بہت چاہتے تھے اور اس کا کہنا مانتے تھے۔ فتح پور کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر تھا لیکن جب بھی کوئی ٹرین اپنی پوری رفتار سے وہاں سے گزرتی تو فتح پور میں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی۔ مسافر ٹرین بہت کم رکتی تھیں صرف تین بویوں پر مشتمل ایک پانچ ٹرین دن میں دو بار وہاں سے گزرتی تھی اور وہی فتح پور کے باسیوں کا واحد سہارا تھی جو اس پر سفر کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شہر جاتے تھے اور پھر اسی پر واپس آتے تھے۔

ٹرین صبح سویرے شہر کی طرف روانہ ہوتی اور پھر شام کو مغرب کے وقت دوبارہ فتح پور کے اسٹیشن پر پہنچتی اور مسافروں کو وہاں اتار کر آگے بڑھ جاتی پھر دوسرے روز اپنی

منزل سے روانہ ہو کر یہاں سے مسافروں کو لے کر شہر چلی جاتی۔ فتح پور کے زیادہ تر رہائشی اسی ٹرین پر سفر کرتا پسند کرتے کیوں کہ اس کا کرانیہ بہت کم ہوتا تھا۔ شہر کی طرف دو بیس بھی چلتی تھیں لیکن ان کا کرانیہ بھی بہت تھا اور اس میں رش بھی بہت زیادہ ہوتا تھا کیونکہ وہ بیس آبادی کے اندر سے روانہ ہوتی تھیں لیکن ٹرین میں سفر کرنے کے لئے لوگوں کو ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوتا تھا اور اس کے لئے دو میل کی مسافت الگ لے کر پڑنی تھی۔

لیکن اتنی تکلیف اٹھانے کا ان کو یہ فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ ان کے پیسے بچ جاتے تھے اور خوشی خوشی ٹرین میں کم کرانیدے کر شہر جا کر اپنی شاہنگ کرتے تھے۔

قیوم صبح سویرے اٹھا اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے زاہد کو تیار کرنے کا کہہ کر خود گھر سے باہر نکل گیا۔ آج اس نے اپنے بیٹے زاہد کو شہر لے جا کر اس کے لئے اسکول کی نئی یونیفارم خریدی تھی اور ٹاپ وغیرہ کے لئے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ خود گھر سے باہر اس لئے نکل گیا تھا کہ رات کو اس کے ایک دوست نے اسے تاکیدی کی تھی کہ جب وہ شہر جائے تو واپسی میں اس کا بھی ایک کام کرنا آئے ورنہ اس کام کے لئے اسے خود شہر جانا پڑتا۔ گاؤں کے لوگوں میں چونکہ آپس میں محبت اور پیار بہت ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام ہی سمجھتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کے کام آ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے قیوم شہر جانے سے پہلے اس دوست سے مل کر اس کے کام کی نوعیت کا پوچھنے گھر سے نکلا تھا اور ساتھ ہی اپنی بیوی کو تاکید کر گیا کہ اس کی واپسی تک وہ زاہد کو اچھی طرح ناشتہ وغیرہ کروا کر اور نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تیار کر دے۔

جس دوست کے پاس وہ گیا تھا وہ گاؤں میں ایک درزی خیر تھا جس کی اچھی اور صاف ستھری سلائی وہاں کے لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ وہ رات دیر تک اپنی چھوٹی سی دوکان میں لوگوں سے لئے گئے کپڑے سلائی کرتا رہتا تھا۔ سادہ سلائی تو وہ خود ہی کر لیتا تھا لیکن جب کوئی ایسا



سوٹ آجاتا جس پر کوئی کڑھائی کا کام ہوتا تو اس کے لئے اسے شہر جانا پڑتا اور اس کے لئے وہ مالک سے کم از کم ایک ہفتہ ضرور لینا تھا تا کہ اس دوران وہ ملائی کے کیسا تھا کیسا تھا کڑھائی کا کام بھی مکمل کروا سکے ایسے کام کی اسے ضروری بھی بہت اچھی مل جاتی تھی اور مالک بھی کام کو دیکھ کر اسے داد دینے پر تیار رہ سکتے تھے۔

گزشتہ چار پانچ دنوں سے اس کی طبیعت ناساز تھی جس کی وجہ سے وہ ملائی بھی بہت کم کر رہا تھا لیکن جو کام اس نے پہلے لے رکھا تھا اس کو واپس کرنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اگر صرف سادہ ملائی ہی ہوتی تو شاید وہ جیسے تیسے کر کے کام مکمل کر کے واپس کر چکا ہوتا لیکن کچھ سوٹ ایسے بھی تھے جن پر کھڑیزا رنگ اور کڑھائی وغیرہ کا بھی کام تھا اس لئے طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے اسے شہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

رات اتفاق سے قیوم سے باتوں میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ صبح اپنے بیٹے زاہد کو اسکول کی یونیفارم دلانے کے لئے شہر جا رہا ہے تو اسے یکدم یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے وہ سوٹ جو صرف کڑھائی وغیرہ کے لیے بڑے ہوئے ہیں وہ قیوم کے ہاتھ شہر کے اس دوکاندار کے پاس بھیج دے جہاں سے وہ کڑھائی وغیرہ کروا رہا تھا۔ اسی لئے اس نے قیوم سے درخواست کی تھی کہ جب وہ صبح شہر کے لئے نکلے تو اس سے ملنا ہوا جائے تاکہ وہ اسے کام سمجھانے کے ساتھ ساتھ سوٹ بھی دے سکے۔ قیوم اسی سلسلے میں اس وقت اس کے پاس بیٹھا کام سمجھ رہا تھا۔ خبر دوزی اسے تمام سوٹ دے کر کہنے لگا۔ "قیوم بھائی یہ چار سوٹ ہیں ان میں سے تین سوٹ تو آپ وہاں ہی چھوڑ آئیے گا کیونکہ ان میں کڑھائی اور بڑا رنگ کا زیادہ کام ہے لیکن یہ کالا سوٹ اس پر صرف تھوڑی سی کڑھائی کا کام ہے اگر آپ ساتھ ہی لے آئیں گے تو بہت اچھا ہو جائے گا اس کے لئے میری طرف سے اس دوکاندار کو بہت تاکید کرو دیجئے گا تا کہ اس سوٹ کو میں اس کے مالک کو دے سکوں یہ سوٹ لئے مجھے بہت دن ہو گئے ہیں اس لئے اس سے پہلے کہ اس کا مالک مجھ پر ناراض ہو میں اس کی ناراضگی سے پہلے ہی اس کا یہ کام مکمل

کر کے اسے دے دینا چاہتا ہوں۔" خیر نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر قیوم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوٹ والا شاپر پکڑا اور پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے واپس گھر کی طرف چل دیا۔ گھر میں زاہد تیار ہوا اس کا ہی انتظار کر رہا تھا اس سارے کام میں چونکہ دیر ہو چکی تھی اور ٹرین کا وقت بھی گزر گیا تھا اس لئے اب شہر جانے کے لئے ان کے پاس صرف بس سے سفر کرنے لازمی ہو گیا تھا۔ اس نے زاہد کا ہاتھ پکڑا اور بیوی کو خدا حافظ کہتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ بس اسٹاپ وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک برگلہ کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے بنا ہوا تھا جس کے آس پاس چند ٹھیلے بھی موجود تھے جن پر موسمی فروٹ اور گنے کا جوس بیچنے والوں نے اپنا دھندا شروع کیا ہوا تھا۔

گاؤں کے خبردار نے بس کے مسافروں کے بیٹھنے کے لئے وہاں چند بچہ رکھوا دیے تھے جن پر عورتیں اور بچے بس کا انتظار کرنے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ گاؤں کی دو تین اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتی تھیں اور پھر مسافروں کو کچھ بچہ گھر شہر کی جانب فرمائے بھرتی یہ جاہد جا ہو جاتیں۔

عورتوں اور بچوں کو کوشش کی جاتی کہ بس میں سیٹ دی جائے اس کے لئے وہاں کے نو جوان اور دیگر مسافر بہت تعاون کرتے تھے اور خود ہی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر انہیں جگہ دیتے۔ اس کی نسبت شہروں میں یہ احساس بہت کم ہوتا ہے کہ لوگ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کو اپنی جگہ دیں۔ لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے موقعوں پر عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو بہت عزت دی جاتی ہے اور ممکن طریقے سے ان کے آرام و احترام کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ملک بہت جلدی سے ترقی کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کو دھکیں بھی تو پھر ڈھیر ملتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا پھل بھی نکلتا ہے۔

تقریباً بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد دور سے ایک کھٹار سی بس آتی نظر آئی اس کے پیچھے دھوئیں کا ایک

طوفان تھا جس رنگ سیاہ تھا دھوئیں کا رنگ ہٹا رہا تھا کہ نجانے کب سے اس میں کھٹیا معیار کا ڈیزل اور تیل استعمال کیا جا رہا ہے۔ دیہاتی لوگوں کو ایسے مسائل سے آگاہی کم ہی ہوتی ہے اس لئے وہ اس پر غور کرنے کی بجائے صرف اس بات پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں کہ بس میں زیادہ رش تو نہیں ہے کیا انہیں سیٹ مل جائے گی یا بس میں کھڑے ہو کر شہر تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ بس پر نظر پڑتے ہی بس اسٹاپ پر کھٹیلی ہی جگمگاتی اس وقت وہاں تقریباً دس بارہ مسافر ہی تھے جن میں تھوڑے اور تین بچے، ایک نو جوان اور دو بوڑھے شامل تھے ہر کسی کی کوشش تھی کہ بس میں پہلے سوار ہو کر اپنے لئے جگہ لے سکے۔ بس کی دیوکی مانند چٹکھاڑتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف ہی فرمائے بھرتی آ رہی تھی اور پھر چند منٹوں میں ان کے نزدیک آ کر رک گئی۔

بس میں پہلے سے بہت سے افراد سوار تھے اور تقریباً تمام سیٹوں پر لوگ براجمان تھے۔ بس کے رکتے ہی وہ سب اس کی طرف لپکے اور قیوم نے بھی جلدی سے زاہد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پہلے اسے بس میں سوار کروانے کے لئے آگے بڑھا جس کا دروازہ لوگوں سے تقریباً بند ہی ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے پیچھے سے دھکیلے سے کچھ لوگ بس کے اندر چلے گئے جس سے دروازے میں داخل ہونے کے لئے کچھ جگہ بن گئی۔

قیوم نے جلدی سے زاہد کو اٹھا کر بس کے اندر دھکیل دیا اور پھر خود بھی اچھل کر اس کے دروازے سے ہوتا ہوا بس کے اندر گھس گیا۔ بس میں کافی لوگ کھڑے تھے اور کافی شور بھی ہو رہا تھا۔ بس کا کنڈیکٹر لوگوں کو خاموش رہنے اور بس کے پچھلے حصے کی طرف جانے کا کہہ رہا تھا لیکن کوئی مسافر بھی اس کی بات پر کان نہیں دھ رہا تھا۔

لیکن پھر قیوم کے کہنے پر کچھ لوگ ذرا پیچھے کی طرف ہوئے تو بس میں کچھ جگہ بن گئی۔ یہ دیکھ کر بس میں کھڑے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور قیوم کا شکریہ بھی ادا کیا تمام مسافروں کے بس میں سوار ہوتے ہی بس ایک جگہ سے آگے بڑھی اور شہر جانے والے راستے پر دوڑتی چلی گئی۔ کرائے وغیرہ سے فارغ ہو کر قیوم نے زاہد کو اپنے

ساتھ ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ زاہد کی عمر تقریباً سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ گاؤں کے اسکول میں دوسری کلاس کا طالب علم تھا۔ نیا سال شروع ہونے کی وجہ سے اسکول کی نئی یونیفارم خریدنے کے لئے وہ اس وقت شہر جانے کے لئے بس میں سوار تھا۔ شہر کا فاصلہ گاؤں سے لگ بھگ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے چالیس منٹ لگ جاتے تھے کیونکہ بس کھٹارہ ہونے کیساتھ ساتھ جگہ جگہ رکتی بھی تھی اس لئے زیادہ دیر لگتی تھی۔

بس اپنا مقررہ فاصلہ طے کر کے شہر کی حدود میں داخل ہو گئی اور پھر شہر کے ایک چوراہے میں بس کے رکتے ہیں قیوم زاہد کا ہاتھ تھامے اور کپڑوں والا شاپر ہاتھ میں پکڑے بس سے اتر گیا۔ قمر دین کے سمجھانے کے مطابق اس دوکاندار کی دوکان چوراہے سے زیادہ دور نہیں تھی اس لئے وہ لوگوں سے پوچھتا ہوا اس دوکان پر پہنچ گیا۔

دوکان کے مالک قمر دین کا نام بتانے پر اس نے کپڑوں والا شاپر اس کے حوالے کر دیا اور ساتھ اس کا لے سوٹ کے متعلق جو کچھ قمر دین نے اسے تاکید کی تھی اس کا بھی کہہ دیا۔ دوکاندار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے کہا کہ اگر اسے شہر میں کوئی اور کام ہے تو وہ کر کے آجائے آتی دیر میں وہ اس سوٹ والے کام کو مکمل کر لے گا۔

قیوم یہ سنتے ہی زاہد کو لے کر اس دوکان کی طرف چل دیا جہاں اسکول کی یونیفارم دستیاب تھیں۔ اس دوکان کا پتہ اسے کے ایک دوست نے ہی اسے بتایا تھا جو خود اپنے بیٹے کے لئے اسی دوکان سے اس کے لئے یونیفارم لے کر گیا تھا۔

دوکان ڈھونڈنے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی اور کچھ ہی دیر میں وہ اس دوکان کے اندر موجود تھا۔ دوکان میں مختلف قسم کی یونیفارم لگی ہوئی تھیں اس نے زاہد کے ناپ کی ایک یونیفارم جو قدرے زیادہ ہنگامی بھی نہیں پسندی۔ دوکاندار کو اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے یونیفارم والا شاپر ہاتھ میں پکڑا اور زاہد کو لے کر دوکان سے باہر نکل آیا۔ زاہد کو وہ چونکہ بہت عرصہ بدشہر لایا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ بخشی دیر میں وہ کڑھائی والا سوٹ تیار ہوگا اتنی

دیر میں وہ اسے تھوڑا شہر ہی گھملائے۔ یہ سوچ کر وہ اسے لئے ایک پارک میں چلا گیا جہاں بچوں کی تفریح کے لئے بہت سے جھونپے اور سٹال لگے ہوئے تھے اس نے زہد کو اس کی پسند کے جھولوں میں بیٹھا اور اس کو خوش ہوتا دیکھ کر خود بھی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ چند ایک سٹال سے اس نے اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دلائیں۔ اور کچھ چیزیں اپنی ہودی کے لئے بھی خریدیں تاکہ وہ اپنی میں اسے دے سکے۔ زہد اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ ان دونوں کی آنکھ کا تارا تھا وہ دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

کافی دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں واپس اس دوکان پر آگئے جہاں سے وہ سوٹ لینا تھا لیکن دوکان پر پہنچ کر انہیں باجی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے دوکان سے نکلے ہی چکی جانے کی وجہ سے سوٹ جوں کا توں رکھا رہا ہے اور اب چونکہ بجلی کے آنے میں مزید پندرہ منٹ کا وقفہ ہے تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے اور شہر سے گاؤں جانے کے لئے آخری بس شام پانچ بجے چلی جاتی تھی اور ٹرین شام چھ بجے نکلتی تھی اس وقت بھی ان کے پاس صرف دو یا تین ٹکٹے ہی تھے جس میں وہ یا تو بس پکڑ سکتے تھے یا ٹرین کے ذریعے اپنے گاؤں جاسکتے تھے ورنہ دوسری صورت میں ان کو رات شہر میں ہی کرنا پڑتا اور یہ بات ان کو گوارا نہیں تھی کیونکہ زہد نے صبح اسکول جاتا تھا اور اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر اطلاع کر سکیے یہ سوچ کر وہ پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں دوکاندار کی آواز بڑی جواسے بتاتا تھا کہ اگر بجلی کے آگے ہی وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کو کڑھائی والا کام مکمل کر کے دے گا اس لئے زیادہ گھر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر قیوم کو کچھ حوصلہ ہوا اور پھر بے چینی سے بجلی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شہروں میں چونکہ بجلی کے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل مقرر ہوتا ہے اس لئے بجلی اپنے مقررہ وقت کے مطابق آگئی اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دوکان میں ریش نہ ہونے کی وجہ سے اس نے جلدی سے اس کا کام ہی شروع کر دیا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اپنے

گاؤں جانے والی بس یا ٹرین کو پکڑ سکے۔ بڑی کوشش کے باوجود اسے کڑھائی والا کام مکمل کرنے میں پونے دو گھنٹے لگ ہی گئے۔ لیکن اس سارے کام کی وجہ سے بس گاؤں کے لئے روانہ ہو چکی تھی اس لئے اب ان کے پاس سوائے ٹرین سے سفر کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اس نے سوٹ والا شاپر اٹھایا اور پیسوں کی رسید جیب میں ڈالتے ہوئے زہد کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ریلوے اسٹیشن جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے جو زیادہ دور نہ تھا۔ اسٹیشن پر اکا دکا مسافر ہی بیٹھے ہوئے تھے جو شام چھ بجے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

غور سے دیکھنے میں قیوم کو ان میں کوئی بھی اپنے گاؤں کا مسافر نظر نہیں آیا جو اس کی جان پہچان کا ہو۔ غالباً وہاں جو مسافر نظر آ رہے تھے یا تو وہ خود کی کوٹنے آئے تھے یا کسی اور شہر کے تھے۔ قیوم زہد کا ہاتھ تھامے ایک کونے میں رکھنے کی طرف بڑھا اور زہد کو وہاں بٹھا کر خود ایک سٹال والے سے پوچھنے لگا کہ فتح پور والی ٹرین کس وقت پہنچ رہی ہے پھر اس سٹال والے کے کہنے کے مطابق کٹر ٹرین چھ بجے ہی روانہ ہوگی وہ مطمئن ہو کر زہد کے ساتھ ہی بیچ پر بیٹھ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف ڈوبتا جا رہا تھا۔

اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے قیوم کو بھی فکر ہو رہی تھی کیونکہ اسٹیشن سے گاؤں کا فاصلہ دو گھنٹہ ٹرین ہونے کی وجہ سے اسے ہائی کاراستہ پیدل ہی طے کرنا تھا اور یہی سوچ سوچ کر اسے فکر کھائے جاری تھی کہ وہ یہ فاصلہ رات کے اندھیرے میں کیسے طے کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اس کے گاؤں کی طرف جانے والا یہ راستہ محفوظ راستہ ہے سوائے وہاں کے تلوں کے علاوہ کبھی بھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ اس بات سے تقریباً مطمئن تھا۔

زہد کو اس نے مونگ پھلی کا ایک پیکٹ لے دیا تھا جسے وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ خود اس نے چائے کی طلب ہونے پر ایک کپ چائے وہاں موجود ایک ٹی سٹال سے لے لیا تھا اور اس وقت اسے پینے میں مصروف

تھا ٹھیک شام کے چھ بجے ٹرین کی وصل سنائی دی اور دور سے ٹرین آتی دکھائی دی۔ قیوم نے جلدی سے چائے کا کپ واپس کیا اور زہد کا ہاتھ تھامے ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلتی پلیٹ فارم پر رگ ٹی ٹرین میں زیادہ ریش نہیں تھا قیوم کٹ پہلے ہی خرید چکا تھا جو اس وقت اس کی جیب میں محفوظ تھے۔ قیوم زہد کا ہاتھ پکڑے جلدی سے اپنے سامنے رکنے والی ٹرین کے ڈبے میں سوار ہو گیا ڈبے میں پندرہ سولہ مسافر سوار تھے اور انہیں بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں آئی۔ ٹرین دس منٹ تک رک کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئی۔

ٹرین کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی زبردستی اسے آگے دھکیل رہا ہو۔ پنجر ٹرینوں کی رفتار تقریباً ایسی ہی ہوتی ہے اس لئے وہ بے بسی سے اسے آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شہر اور فتح پور گاؤں کے درمیان تقریباً تین دیہات اور بھی تھے جن کے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی ٹرین نے رکتا تھا اس لئے اس کی رفتار نہ ہونے کی برابری تھی۔ دو اسٹیشنوں کو کراس کرنے کے بعد ٹرین تیسرے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اچانک بریک لگنے سے ایک جھٹکے سے قیوم بے خیالی میں سیٹ سے پیچھے گرتے گرتے بجا اور اس اچانک جھٹکا لگنے سے اس نے ساتھ ہی زہد کو بھی سنبھالا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرین رک چکی تھی اور سب مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھے کھڑکیوں سے باہر رات کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن باہر گھپ اندھیرا ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

غالباً ٹرین کسی جنگل یا ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی اور کیوں کھڑی ہوئی تھی اس کے جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ قیوم کچھ دیر تک بیٹھا انتظار کرتا رہا پھر کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھا کر باہر جھانکنے لگا۔ اس نے جیسے ہی سر باہر نکالا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گاڑی کا گاڑو گزرتا نظر آیا اس نے جلدی سے سلام کر کے اس گاڑو سے گاڑی کے رکنے کا سبب

پوچھا تو گاڑو نے بتایا کہ سامنے سے ایک بڑی ٹرین آرہی ہے جسے کراس دینے کے لئے گاڑی رکی ہے۔ اور اس کے گزرنے کے بعد ہی ٹرین دوبارہ روانہ ہوگی۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اندر کر لیا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد دور سے کسی ٹرین کی وصل سنائی دی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹرین طوفان کی طرح نمودار ہوئی اور فرارے بھرتی ان کی ٹرین کے نزدیک سے گزری۔

ٹرین کی تقریباً اٹھارہ کے لگ بھگ یوگیاں ہوئیں جو شور مچاتی ان کے نزدیک سے گزرتی جا رہی تھیں۔ اس ٹرین گزرنے کے دس منٹ بعد ان کی ٹرین نے وصل دی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اس سارے کام میں رات کے آٹھ بج چکے تھے اور چار سوارات کا گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ قیوم کو رہ کر یہ لگتا ہے جا رہی تھی کہ جتنی دیر اسے گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچنے لگے گی اتنی ہی پریشانی اپنے گھر تک پہنچنے میں اٹھانی پڑے گی۔ لیکن وہ بے بس تھا کیا کر سکتا تھا اس لئے بے بسی سے گاڑی کے منزل پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر آخری اسٹیشن پر پہنچ کر ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی اور رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

جب قیوم زہد کا ہاتھ پکڑے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ ریلوے اسٹیشن پر چونکہ روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا صرف کہیں کہیں پلیٹ فارم پر موجود چند اسٹینڈر پرائیٹن لٹکا کر ان میں روشنی کی کمی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے آفس میں گھسائی کرسی پر اٹھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر یہ دیکھنے کی بھی تکلف نہیں کی تھی کہ کوئی گاڑی آن کر رہی ہے اور کوئی روانہ ہوئی ہے۔ عجیب طرح کا رویہ تھا اس اسٹیشن ماسٹر کا۔ اس وقت وہ دونوں مسافر ہی وہاں اتراے تھے کوئی اور بندہ بشر وہاں موجود نہیں تھا۔ قیوم نے زہد کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

پورے چاند کی رات تھی چاند کی دووہیا روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ہر چیز قدرت کی اس اصول نعمت سے گھر کر سامنے آگئی تھی۔ چاند کی روشنی میں گاؤں کی طرف جانے والا راستہ صاف نظر آ رہا تھا راستے کے دونوں طرف

کھیت تھے جن میں لگی فصلیں ہوا سے لہلاتی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

قیوم نے راستے سے ایک درخت کی موٹی سی شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لی تھی تاکہ بوقت ضرورت کسی جنگلی جانور سے بچا جاسکے آسمان پر چمکتے ستارے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اور باتیں کرتے گاؤں کے راستے پر بڑھتے جا رہے تھے۔ دور کہیں سے گیدڑوں اور گلوں کے گھونڈوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی جنگلی جانور ان کے سامنے نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس لئے وہ اطمینان سے اوپر اُڑ رہے تھے اپنی راستے پر چل رہے تھے۔ دویل کا فاصلہ انہوں نے تقریباً سو گھنٹے میں طے کر لیا اور آخر کار گاؤں کے داخلی راستے پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔

قیوم کا گاؤں پہلی گلی کے درمیان میں واقع تھا اس لئے وہ ہاتھ میں تھامی لکڑی کو دور پیچ کر اس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں چلتے ہوئے ابھی اسے تھوڑی سی دیر ہوئی ہوئی کہ اس نے ایک بھیا تک اور انتہائی دشمنانہ منظر دیکھا۔

ایک انسانی بھیڑ اس سے چندہ میں فٹ کے فاصلے پر گھڑا ان کی جانب ہی دیکھ رہا تھا اس کے جسم پر سیاہ بالوں نے اس کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔

قیوم اور زاہد کے حلق میں جیسے ان کی چھین پھنس کر رہ گئی تھیں اور ان کے پاؤں نے جیسے زمین کو مضبوطی سے قابو کر لیا تھا اور وہ بھاگنے کے باوجود بھی بھاگ نہیں پارہے تھے۔ وہ غریب کچھ دیر تک کھڑی ان کو گھورتی رہی اس کی سرخ چمکدار آنکھیں بہت خوفناک لگ رہی تھیں اور پھر اپنے قدم اٹھاتے ان کی جانب بڑی قیوم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سارا جسم مفلوج ہو گیا ہو اور زاہد بے اپنی منہجند آنکھوں سے اس خوفناک بلا کا اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

قیوم کے ہاتھ سے سوٹ والا شاہر زمین پر گر گیا تھا اور بے خیالی میں اس کے ہاتھ سے زاہد کا ہاتھ بھی چھٹ گیا تھا۔ وہ بلا فکرموں سے دم دم کی آواز نکالتی ان کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی اور پھر اتنی قریب آ گئی کہ ان دونوں کو اس

کے گرم گرم سانس لینے کی آواز صاف سنائی دینے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے اس بلانے اپنا بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک مچھپے سے زہد کو دیوبچ کر وہاں سے جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔

قیوم بت بنا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جب اسے ہوش آیا تو وہ غریب زہد کو اٹھا کر بہت دور جا چکی تھی۔ اور تھوڑی سی دیر میں کھنے جنگل میں گم ہو چکی تھی۔

قیوم کو ہوش آتے ہی ایک جھٹکا لگا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت کا احساس دلایا تو وہ چیخا چلاتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

رات کے اندھیرے میں اس کے چہنچہ چلانے سے گاؤں میں ایک شور مچ گیا اور بہت سے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور پھر اس کے بتانے پر کہ کس طرح وہ غوثی غفریت اس کے بیٹے کو اٹھا کر کھنے جنگل میں بھاگ گئی ہے۔

گاؤں کے لوگ آپس میں چو گویاں کر رہے تھے لیکن کسی میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ کوئی اس غفریت کے پاس جا کر اس کے بیٹے کو واپس لاسکے اس لئے وہ صرف افسوس ہی کر رہے تھے۔ قیوم کی بیوی کا رورور کر برا حال تھا اور اس پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ قیوم کی اپنی حالت بہت خراب ہو رہی تھی شور سے گاؤں کا حکیم بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے بھی اپنی کوشش سے زہد کی ماں کو ہوش دلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بار بار بیہوش ہو رہی تھی ظاہر ہے اس کا اکلوتا بیٹا اس سے جدا ہو گیا تھا اور نجانے وہ غفریت اس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی یہ سوچ سوچ کر بھی اسے بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

کچھ لوگ نمبردار کو بلانے اس کے ڈیرے کی طرف دوڑ گئے جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ یہ سب کارستانی کسی خوفناک غفریت کی ہے تو وہ بھی کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ قیوم کو دلا دینے لگا کہ اس وقت رات کے اندھیرے میں جنگل میں جانا اور اس غفریت سے مقابلہ کرنا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔ ہاں البتہ صبح کے وقت جنگل میں جا کر اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے لیکن اس وقت تک وہ

غفریت اس بچے کے ساتھ کیا کرتی ہے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔

مسجد کے مولوی نے اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور صبر کرنے والوں کو کتنا اجر اور ثواب لکھا گیا ہے اس کے متعلق بتانے لگا۔ قیوم اپنے ہوش سے بیگانہ ہو گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ لوگ اسے کیا کہہ رہے ہیں اور کیا سمجھا رہے ہیں۔ اسے تو صرف اپنے پیارے نعت جگر کی فکر ہی ستائے جا رہی تھی جو وہ غفریت اسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا جھوم کم ہونے لگا اور لوگ افسوس کرتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

نمبردار نے بھی قیوم سے اجازت لی اور اپنے کارندوں کے ساتھ اپنے ڈیرے کی جانب چل دیا۔ اس نے دل ہی دل میں صبح شہر جا کر پولیس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ دوبارہ کسی قسم کا واقعہ رونما نہ ہو سکے۔ اس واقعہ سے گاؤں کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں میں یہ خوف پختہ ہو جائے اور وہ کھیتوں میں جانے سے بھی گھبرانے لگیں۔ سبکی سوچتا ہوا وہ اپنی حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

دو تین روز تو بغیر دخوی گزر گئے اور اس دوران رشید کی بیوی کی طبیعت بحال رہی لیکن اس کے بعد ایک روز اچانک جب وہ گھر کے آگن میں بیٹھی بیزی بھاری تھی کہ ایک گوشت کا بڑا سا ٹکڑا اس کے سامنے آن گرا۔ گوشت سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ابھی ابھی اسے کسی جانور کے جسم سے علیحدہ کیا ہو اور لا کر اس کے سامنے پھینک دیا ہو۔ عجیب بات یہ تھی اس کے ساتھ اس جانور کے جسم کے بال تک کھال سمیت موجود تھے جن کی رنگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی سرخ بالوں والے جانور کے جسم سے کاٹا گیا ہو۔ یوں اچانک اتنا بڑا گوشت کا ٹکڑا اپنے سامنے گرے دیکھ کر پھر اس کے ہاتھ پر لگ گئی جس سے خون کی دھار نکل کر فرش پر گرنے لگی۔ اس وقت گھر میں اس کی ساس موجود نہیں تھی وہ اکیلی ہی گھر میں موجود تھی اس نے جلدی سے چھری ایک طرف پھینکی اور بھاگتی ہوئی ایک

طرف کو نئے میں رکھی پر اپنی سی جادو کا کچھ حصہ بھاڑ کر اسے اپنے ہاتھ پر باندھ لیا لیکن خون مسلسل بہہ رہا تھا اور اب تو اسے ہاتھ میں تکلیف بھی ہونے لگی تھی یہ دیکھ کر اس نے گھر کے باہر کی جانب قدم بڑھانے تاکہ گلی میں کھیلنے کسی بچے کو حکیم کو بلانے کا کہہ سکے۔

وہ رشید کو بلا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے حکیم کو بلا کر کوئی دوا یہ مرہم وغیرہ کروالے پھر شام کو رشید کو بتا دے گی۔ یہ سوچ کر اس نے پہلے حکیم کو بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ گلی میں جھانک کر دیکھا تو ایک بچہ کوئی سو دا سلف لینے گھر سے نکلا تھا کہ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا اس نے اسے آواز دے کر جلدی سے حکیم کے مطب کی طرف دوڑا دیا اور تھوڑی سی دیر میں حکیم اپنا تھیلیا اٹھائے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔

حکیم کی دستک سن کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور حکیم کو اندر آنے کا کہہ کر محسن میں رکھی جا رہی پر بیٹھ گئی حکیم بھی محسن سے ہوتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور پھر اس کے بتانے پر اس نے ہاتھ پر بندھے کپڑے کو اتارنا چاہا خون جھنے کی وجہ سے کپڑا بھی کھال کے ساتھ چپک گیا تھا یہ دیکھ کر حکیم نے تھوڑا سا پانی ہاتھ میں لیکر پہلے کپڑے کو گیلیا کیا پھر آہستہ آہستہ کپڑے کو اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ سے جدا کرنے لگا۔ گیلیا ہونے کی وجہ سے کپڑا اب آسانی سے اتر گیا تھا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا پھر نجانے کیوں اتنا خون نکلا۔

حکیم نے پہلے ایک صاف کپڑے سے اس کے زخم کو اچھی طرح صاف کیا پھر تھیلی میں ہاتھ ڈال کر ایک مرہم کی ڈبی نکالی جس میں بیزی مائل رنگ کی کوئی مرہم نظر آ رہی تھی اس نے اس مرہم کو اپنی انگلی کی مدد سے اس کے زخم پر لپ کرنا شروع کر دیا۔ جب زخم اچھی طرح ڈھک گیا تو اس نے اسے یوں ہی کھلا چھوڑ کر رشید کی بیوی کو کچھ بتایا اور ایک دو پڑیا پانی کے ساتھ کھانے کا کہہ کر واپس مطب کے لئے گھر سے نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فیس یا دوا کے پیسے رشید سے ضرور دے دے گا اس لئے اس نے رشید کی بیوی سے پیسوں کا تقاضہ بھی نہیں کیا تھا۔

رشید کی بیوی اس دوران وہ گوشت کا ٹکڑا گھر کے



کوڑے دان کی نظر کر چکی تھی اور بے چینی سے رشید کے گھر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی ساس پڑوس میں کسی کیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی اور شام کو در سے لوٹنے کا کہہ کر صبح ہی گھر سے نکل گئی تھی۔ اس لئے اب اسے رشید کے گھر آنے کا شدت سے انتظار تھا تا کہ اسے وہ گوشت کا ٹکڑا بھی دکھاسکے اور اپنے ہاتھ کا زخم بھی۔

شام کے سامنے پھیلنے ہی رشید حسب معمول گھر میں داخل ہوا اور دوڑ کر اس کی جانب لپکا۔ رشید اس کو اس طرح اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک گیا اور ہاتھ میں تھا فروٹ کا شاپر ایک طرف رکھ کر اپنی بیوی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جیسے ہی اس کی نظر اس کے ذخی ہاتھ پر پڑی تو اس نے فوراً اسے اس کا سبب پوچھا اور پھر اس کے بتلانے پر پہلے تو اسے یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے کوڑے دان میں پڑا وہ گوشت کا ٹکڑا اسے دکھایا تب جا کے اسے یقین کرنا ہی پڑا۔

رشید اب کچھ سوچتے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کا بار بار شک اپنی ماں کی طرف ہی جاتا تھا جسے وہ کئی بار گھر سے غائب پاچکا تھا لیکن چونکہ وہ اس کی ماں تھی اس لئے وہ ایسا سوچنا اور سر جھٹک دینا لیکن اب جس طرح کے یہ واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے اس سے وہ کچھ سوچنے لگا تھا کہ ہونہ ہو اس سارے واقعات کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ ضرور ہے۔ وقت گزرتا گیا اور اب وہ محتاط ہو گیا تھا خاص طور پر رات کو اکثر صبح کا پتھر ضرور لگا تا کہ دیکھ سکے کہ اس کی ماں وہاں موجود ہے یا نہیں لیکن ایسا کرنے پر ہر بار وہ اسے صحن میں سویا ہوا پاتا اس لئے اب اس کا شک ختم ہو گیا تھا اور وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہوگا رشید اور اس کی بیوی اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ رشید کی ماں صحن میں سوئی ہوئی تھی۔ کمرے کا اکلوتا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب سے رشید کی بیوی کے ساتھ اس قسم کے واقعات ہونے لگے تھے اس وقت سے رشید نے اس کے کہنے پر کمرے میں بلب جلا

رہنے دیا تھا تا کہ رات کے وقت اگر وہ کسی حاجت سے اٹھتی ہے تو اندھیرے میں خوف محسوس نہ کرے۔

کمرے میں ان دونوں کے خزانے گونج رہے تھے اور اس وقت وہ دونوں گہری نیند کے حرے لوٹ رہے تھے۔ کہ اچانک کمرے کا بلب ایک جھٹکے سے بجھ گیا اور کمرے میں گھب اندھیرا پھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی رشید کی بیوی کی چار پائی کے پاس ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کی جسامت چھ سات فٹ کے قریب ضرور ہوگی اس کا ہلکا سا ہولہ اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا وہ ہولہ آہستہ سے رشید کی بیوی کے جسم پر چھکا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلوہ بوجھ لیا اس کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

اس اچانک الفاؤ پر رشید کی بیوی نے حراحت کرنا چاہی لیکن لگتا تھا جیسے کسی کھجے میں اس کی گردن جکھن گئی ہو اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنا دفاع نہیں کر پائی اور اس کے گلے سے یوں خرخر ہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی بکرے کو زخم کرتے وقت نلکی پڑتی ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر تک ہاتھ پاؤں چلائے پھر ایک دم اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

یکام ہوتے ہی وہ ہولہ اچانک کمرے سے غائب ہو گیا اور بلب بھی دوبارہ جل اٹھا۔ اس ساری کارروائی میں رشید بدستور سویا ہوا تھا اور اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے اور اس کی پیاری بیوی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

صبح حسب معمول اٹھتے ہی جیسے رشید نے اپنی بیوی کو اٹھنے کے لئے آواز دی تو اس کے بار بار بلانے پر بھی جب اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے تشویش ہونے لگی اور وہ فوراً اٹھ کر جیسے ہی اس کی چار پائی کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ اس کی بیوی کی اکڑی ہوئی لاش بستر پر موجود تھی اور اس کا جسم اکڑا ہوا تھا بجانے کس وقت وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ چیخا ہوا صحن میں سوئی اپنی ماں کے پاس پہنچا اور جلدی سے اسے جھنجھوڑنے لگا پہلے تو اس کی ماں کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

لیکن جب حقیقت کا اسے پتہ چلا تو وہ بھی دوڑتی

ہوئی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور پھر ساری بات اس کی سمجھ میں خود بخود آگئی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور شاہ بابا کا شکر یہ ادا کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے موٹکوں نے اس کی بہو سے اس کا پیچھا چھڑا دیا تھا۔ وہ بہو کی حالت دیکھ کر رین کرنے لگی اور ان لوگوں کے شور اور رونے کی وجہ سے اس پڑوس سے بھی لوگ گھر میں آگئے اور پھر حقیقت جان کر انکشت بدندان رہ گئے کہ رشید کی بیوی بظاہر کسی تکلیف میں بھی نہیں تھی اور ابھی تک ہی وہ پہلی پہلی بھی تھی لیکن اس کی اس طرح اچانک موت نے سب کو پریشان کر دیا تھا اس کی لاش اکثر ضرور مٹی تھی۔

لیکن سب سے حیرت والی یہ بات تھی کہ اس کی گردن پر کسی قسم کے نشان نہیں تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی نے بڑے زور سے اس کا گلوہ بوجھا ہو۔ اس لئے سب اس کی موت کو دل کا دورہ ہی سمجھ رہے تھے۔ رشید اپنی بیوی کے غم میں غڑھا ہوا گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار ان واقعات کو قرار دے رہا تھا جو کچھ روز پہلے اس کے ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ دیگر رسومات سے فارغ ہو کر اس کی بیوی کو دفنایا گیا۔ اور دوسری طرف رشید کی ماں اپنی بہو سے پیچھا چھٹ جانے پر بہت خوش تھی لیکن اپنی اس خوشی کا اظہار کر کے وہ کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے خاموشی سے اسے اصرار کرتی پھر رہی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ بھی کسی بے گناہ کا خون ریزا نہیں جانے دیتا ایک روز گھر سے باہر کسی کام کے سلسلے میں وہ نکلی تو شام کا اندھیرا ہونے کی وجہ سے گلی میں موجود کسی زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ ایک منٹ میں وہیں تڑپ تڑپ کر موت کا شکار ہو گئی۔ قدرے نئے اس سے اس کی بہو کے دل کا بدلہ لے لیا تھا۔

دلچسپ سٹھہ اور اس کے ساتھیوں کا کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد قافلے میں کچھ بوڑھے لوگوں نے مشورہ کر کے دیگر افراد کو جلد از جلد گاؤں کی جانب بڑھنے کی تاکید کی وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ لوگ مزید وہاں رک کر کسی اور مصیبت کا شکار ہوں جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دلچسپ سٹھہ اور اس کے ساتھ گئے چند جوانوں کی طاقت پر

بھی مجبور تھا کہ وہ اس بچے کو ضرور واپس لے کر آئیں گے۔ لیکن اس بچے کی ماں اپنے بچے کو لئے بغیر گاؤں جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی لیکن پھر لوگوں کے سمجھانے کے باوجود کہ صرف بچے کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی زندگی داؤ پر نہ لگائے اس لئے وہ جمع خاطر رکھ کر دلچسپ ضرور اس کے بچے کو اس خوفناک بلا کے بچے سے چھڑا لائے گا۔ یہ سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل پر چل پڑا اس دوران پریت کو کہی گئی کہ کچھ جوان آکر بیٹھ گئے تھے تا کہ اس کو تحفظ دے سکیں۔ پریت کو بھی دلچسپ سٹھہ کے لئے پریشان تھی کہ وہ انہوں نے اتنی دیر بجائے کیوں لگا دی تھی۔ لیکن اسے دلچسپ سٹھہ کی صلاحیتوں پر مکمل مجبور تھا اس لئے وہ مطمئن تھی۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ سب اپنے گاؤں پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گاؤں کے لوگوں کو جب ان کی زبانی سب حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب بھی بہت پریشان ہو گئے۔ بچے کی ماں کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن وہ پریشان ضرور تھی۔

گاؤں کے دیگر افراد اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور پریت کو کو اس کے سرال والوں نے لے جا کر حوٹلی کے ایک کمرے میں بیٹھا دیا۔ جگہ عری و الے کمرے کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جس سے اس گھر کے کینوں کے ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔ گھر کی عورتیں اس کے گرد گھیر اڑا لے بیٹھی تھیں۔ پریت کو ان میں سمٹی بیٹھی تھی۔

عورتیں وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق وغیرہ نہیں کر رہی تھیں کیونکہ انہیں تمام واقعات کا علم ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس وقت پریت کو کدو کا شور ہر چند جوانوں کے ساتھ اس خوفناک دیران مندر میں موجود تھا اور اب تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ سب کس حال میں ہیں۔

☆.....☆.....☆  
ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں دھونی جمائے ایک ساہو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس کے سامنے زمرس

کے چھوڑوں کا ایک ڈیر دکھائی دے رہا تھا جس میں رکھے دو نارمل اور کالے بکرے کا کتا ہوا سر رکھا تھا سر سے لگتا جیسے کسی نے تازہ تازہ اسے کسی بکرے کے ہڑ سے علیحدہ کیا ہو۔ سادھو وقفے وقفے سے اپنے سامنے رکھے مٹی رنگ کے ایک پاؤڑ کو کچلی سے اٹھا تا اور اپنے سامنے جھلنے والے لالہ میں پھینک دیتا جس سے آگ ا یکدم بجڑتی اور پھر معمول پر آجاتی یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی پاؤڑ نہ بلکہ کوئی پیڑوں ہو۔ کونے کے بائیں جانب چٹائی پر ایک بچہ جس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں کو مضبوطی کے ساتھ ایک بان کی رسی سے باندھ دیا گیا تھا لیکن ہوا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں یہ زائد جسے اس عفریت نے بیعت کی غرض سے اس خوفناک سادھو کے حوالے کر دیا تھا۔

اس عفریت کے اس کام کے عوض اس سادھو نے اسے ویران مندر کے تہ خانے میں رکھے ہوئے صندوق میں موجود کئے ہوئے انسانی سروں میں سے دوسرے میں دیئے تھے جسے وہ عفریت اس کے سامنے ہی کھڑے کھڑے چٹ کر گیا تھا اس طرح کے کئے ہوئے سراں کے مرغوب خدا تھے۔

سادھو اس سے جب بھی اپنی مرضی کا کام لیتا تو اس کام کو ٹھیک طرح سے سر انجام دینے پر وہ خوش ہو کر اس کو انسانی سر دیتا تھا۔ سادھو اپنے ایک جاپ کے لئے انسانی جسموں کا استعمال کر رہا تھا جن کے ہڑ وہ ایک مخصوص جگہ دفن دیتا تھا اور ان کے ہڑ سے الگ کئے ہوئے سر تہ خانے کے اندر رکھے لوہے کے صندوق میں رکھ دیتا جو اس نے اس انسانی بھیڑیے سے کام لے کر اسے معاوضے کے طور پر دیتے ہوئے تھے۔

گزشتہ کچھ دنوں سے سادھو ایک خاص قسم کا جاپ "لونا چھاری" کے نام کا کر رہا تھا جس میں اسے منتر کے دوران ایک چھوٹے انسانی بچے کی بیعت دینے کے لئے کہا گیا تھا اور اس کام کے لئے اس نے اپنے ایک بھوکے کام سونچا جو انسانی بھیڑیے کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔

سادھو نے اسے یہ مذموری سونپی اور خود جاپ مکمل

کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ ایک دو بار تا کامیوں کے بعد وہ عفریت اپنے مقصد میں کام ہو گیا اور ایک انسانی بچہ لا کر گزشتہ روز اس کے حوالے کر دیا اور اسی سلسلے میں وہ آج اس ویران مندر کے ایک ہال میں موجود تھا وہ مندری منہ میں کوئی منتر پڑھ رہا تھا اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن بند آنکھوں کے باوجود وہ مٹی والا سفوف برابر اپنے سامنے رکھی آگ میں پھینکتا جا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے سب دکھائی دے رہا ہو۔

ابھی اسے جاپ کرتے توڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے والی دیوار میں درمیان سے جھٹی اور اس کے اندر سے ایک چمندر کی شکل کا جانور پھل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس کا انداز ایسے تھا جیسے کوئی کینگر و اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو لیکن اس کے ہاتھ سرے سے ہی نہیں تھے بلکہ اس کی صرف دو ٹانگیں ہی تھیں اور اس کا پتلی تھوڑی جیسا منہ کچھ زیادہ ہی لیوڑا تھا اس کے جسم پر بھورے رنگ کے بال تھے جو بیل پچھل سے لے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے کسی نہایت تک نہ ہو غرض اس کو ایک نظر دیکھنے سے گھن آتی تھی۔

وہ سادھو کے سامنے کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے کسی بھی وقت زمین پر گر جائے گا۔ سادھو اس دوران اپنی آنکھیں کھول چکا تھا اور اس وقت اسے عجیب و غریب جانور کوئی محسوس ہوا تھا جو نشہ پے شخص کی طرح کھڑا ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔

سادھو نے اپنے سامنے زمین پر رکھا ایک ترشول اٹھایا اور چلتا ہوا سیدھا اس عجیب الخلقت جانور کے پاس پہنچ کر ترشول اس کے پھولتے پھٹتے پیٹ میں کھسکا دیا۔ ترشول اس کے پیٹ میں کھس گیا اور خون کا ایک فوارہ اس کے پیٹ سے اٹل پڑا یہ دیکھ کر سادھو نے جلدی سے اس کے اگلے خون کو ایک بڑے سے پیالے میں اکٹھا کیا اور لے جا کر اس چٹائی پر سونے ہوئے بچے کے قریب لا کر رکھ دیا۔ وہ عجیب الخلقت جانور زمین پر ٹیڑھے میڑھے انداز میں مگر ہوا تھا زار خون بہہ جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی لیکن سادھو نے اس کی طرف

دھیان دینا بھی گوارہ نہ کیا اور دوبارہ اپنی پچھلی والی جگہ پر آکر دوبارہ جاپ شروع کر دیا۔

کچھ دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر دوبارہ اس بچے کے پاس گیا اور اس کے نزدیک رکے خون کے پیالے میں اپنا ہاتھ ڈال کر خون سے تر کرتا اور اس بچے کی پیشانی پر لٹکا اور پھر تھوڑی دیر میں اس بچے کا تمام جسم اس خون سے تر ہو گیا یہ دیکھ کر سادھو نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ پیالے میں ابھی بھی کچھ خون بچ گیا تھا لیکن اس کی رنگت سیاہی مائل ہونا شروع ہو گئی تھی اور پر ایک پتلی سے تہہ جتنی جاری تھی اس کام سے فارغ ہو کر سادھو نے دوبارہ آگ کے قریب جا کر اسے بجھایا اور پھر بچے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس ہال سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

دلچسپ نگاہ اور اس کے ساتھی زمین پر بیٹھتی کی کیفیت میں پڑے تھے۔ جب سے سادھو نے انہیں یہاں لا کر چھپا تھا اس وقت سے وہ سب بیہوش ہی تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ بہت دیر ہو گئی یوں لگتا تھا جیسے سادھو انہیں وہاں پھینک کر بھول گیا ہو۔ جس جگہ انہیں پھینکا گیا تھا یہ وہ تہہ خانہ نہیں تھا جہاں یہ پہلی بار گئے تھے۔ بلکہ یہ اس ویران مندر کا کوئی دوسرا تہہ خانہ تھا جہاں اس وقت یہ سب اپنے انجام سے بے خبر بیہوش کی کیفیت میں لیٹے تھے۔

کافی وقت گزر گیا اور پھر دلچسپ نگاہ کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ اپنی ادھ مٹی آنکھوں سے اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو قریب ہی اپنے دوسرے چار ساتھیوں کو بھی موجود پایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اسے پوری طرح ہوش آ گیا اور اس کے لاشوں نے اسے تمام واقعات یاد دلادیے کہ کس طرح وہ ایک بچے کو ڈھونڈتے ہوئے اس ویران مندر میں داخل ہوئے تھے اور کس طرح ایک تہہ خانے سے نکلے ہوئے وہ ایک سادھو سے ٹکرائے تھے جس نے اپنے ہاتھ میں اسی بچے کی گردن پکڑ رکھی تھی۔

یہ سوچتے ہی اس نے یکدم اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ اس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ پوری طرح اٹھ نہیں سکا۔ اس کے

دیکر ابھی تک بیہوش ہی پڑے ہوئے تھے وہ خود چونکہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کی نسبت جلد ہوش میں آ گیا۔ اس کی طرح اس کے دوسرے ساتھیوں کے بھی ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ پھر اس کی تھوڑی سی کوشش سے اس کے چاروں ساتھی بھی ہوش میں آ گئے اور اندر کے ماحول کو دیکھ کر کانپنے لگے لیکن دلچسپ کو دیکھ کر انہیں کچھ حوصلہ ہوا۔

دلچسپ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا اور اسے کچھ سمجھا کر اپنی پیٹھ کو اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف کر دیا۔ دوسری طرف کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی پیٹھ کے ساتھ ملا دیئے اس طرح دونوں کے ہاتھ آپس میں ٹکرائے گئے اور پھر دلچسپ کے سمجھانے پر اس کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے دلچسپ نگاہ کے بندھے ہاتھوں پر گلی گرہ کھولنے کی کوشش کی۔ گرہ بہت مضبوطی سے باندھی گئی تھی تھوڑی سی کوشش سے دلچسپ نگاہ کے بندھے ہاتھ آزاد ہو گئے اس نے جلدی سے رسیاں ایک طرف پھینک کر اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی جلدی جلدی آزاد کرانا شروع کر دیا۔

کچھ دیر میں وہ سب اس معصیت سے پیچھا چھڑا چکے تھے اور اب کا لائحہ عمل سوچنے لگے۔ اس کارروائی میں کوئی بھی بندہ اس طرف نہیں آیا تھا غائب کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوا ہو گا کہ اس طرح بندھے ہونے کے باوجود وہ خود کو آزاد کرالیں گے۔ دلچسپ اپنے ساتھیوں کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر تہہ خانے کی اوپر جانے والی میڑھوں کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بات کی بہت فکر تھی کہ وہ اس بچے کی ماں کو کیا جواب دے گا جس کا کتا ہوا سر اب بھی اس کے خیالوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی دلہن پریت کو اور ان لوگوں کی بھی فکر تھی جنہیں وہ مندر کے باہر چھوڑ آیا تھا اور شاید وہ کب سے مندر کے باہر کھڑے ان





جسم کی زنجیریں توڑ کر دوڑتا ہوا جائے اور سامنے بچ کر  
لیٹے اس معصوم بچے کو کچا چبا جائے۔ لیکن اسے ساتھ  
ساتھ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اس کا آقا چاہے تو اس کی  
ذرا سی غلطی سے اسے جلا کر بھسم کر سکتا تھا وہ اس کی  
ہلکتیوں سے بخوبی واقف تھا اس لئے سوائے بچے و تاب  
کھانے کے وہ بے بس تھا۔

تہہ خانے کے نزدیک پہنچ کر دلچسپیت سمجھنے لے اپنے  
بچے آنے والے ساتھیوں کی طرف رکنے کا اشارہ کیا اور  
خاموشی سے کان لگا کر کچھ تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش  
کرنے لگا۔ اس کے اس انداز سے اس کے ساتھی بھی چونک  
کر تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے اور پھر جلد ہی  
انہیں یوں لگا جیسے کوئی انسان کچھ مانوس زبان میں کچھ  
پڑھنے میں معروف ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے  
پڑھنے کی بازگشت لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی وہ کیا پڑھ رہا تھا  
ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہاں رک کر انہوں نے آپس میں کوئی  
بات چیت کی ابھی وہ اس بات کا تہیہ کر رہی رہے تھے کہ آیا  
نیچے تہہ خانے میں جا کر دیکھا جائے کہ وہ کون شخص ہے اور  
اس وقت وہاں کیا کر رہا ہے کہ نیچے سے ایک بچے کے  
چیننے کی آواز سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بے درد انسان کسی  
معصوم بچے کے جسم کے اعضاء کو کسی کند چھری سے کاٹنے  
کی کوشش کر رہا ہو۔

بچے کے چیننے کی آواز سننے ہی وہ یکدم واپس ہلنے  
کیونکہ انہوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے یہی فیصلہ  
کیا تھا کہ انہیں تہہ خانے میں جا کر دیکھنے کی بجائے یہاں  
سے باہر نکلنے کی بارے میں سوچنا چاہئے کیونکہ وہ اپنی جانوں  
کو کسی اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

لیکن پھر اچانک تہہ خانے سے آتی کسی معصوم بچے  
کی دردناک چیخ نے ان کے قدم روک لئے اور انہوں نے  
رک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے نیچے تہہ خانے  
میں جانے کا ارادہ کر لیا لیکن اس کے برعکس کرنے سے پہلے  
انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کوئی ایسی چیز ساتھ لے  
جانے کے لئے اس کی تلاش کرنا چاہی جسے وہ اپنے بچاؤ کے

لئے استعمال کر سکیں اور جلد ہی انہیں قریب ہی ایک لوہے  
کی تقریباً دو انچ موٹی سلاح کوٹنے میں پڑی دکھائی دی۔  
سلاح کا ایک سرا جھنجی کی مانند چپٹا تھا جیسے اس  
سے کوئی مٹی وغیرہ کھودنے کے لئے کام میں لاتے ہوں اس  
وقت انہیں یہی قیمت لگا اور دلچسپیت سمجھنے لے اسے جلدی  
سے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے چلتے  
ہوئے نیچے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔

تقریباً سات آٹھ سیڑھیاں اترنے کے بعد ان کی  
آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے  
کافی تھا۔ ان کے سامنے ایک بچہ جس کا ایک بازو ایک ایسے  
انسان کے ہاتھ میں تھا جس کی پیٹھ ان کی طرف تھی اور اس  
کے ہاتھ میں ایک تیز و صاف چھری تھی جس سے تازہ تازہ  
لوہیچہ رہا تھا۔

سامنے بچہ پڑا ہوا ایک بچہ تڑپ رہا تھا اور اس کے  
منہ سے تکلیف کی شدت سے چیخیں نکل رہی تھیں جو تہہ  
خانے کے اندر گونج رہی تھیں۔ اس دہشت ناک منظر کو کچھ  
کر انہوں نے واپس بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی لیکن پھر اس  
کو بزدلی سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دلچسپیت  
انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ  
سیڑھیاں اترتا ہوا تیزی سے آخری سیڑھی اترتا ہوا تیر کی  
طرح گیا اور سامنے کھڑے شخص کی پیٹھ میں اپنی پوری  
طاقت سے ہاتھ میں پکڑی لوہے کی سلاح مسمیو دی۔

سادھو جو بے خیالی میں کھڑا اپنے کے دوسرے بازو  
پر چھری سے وار کرنے ہی والا تھا کہ ایک دم جھٹکا کھا کر زمین  
پر گر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ویران مندر  
میں کوئی یوں اچانک آکر اس کی پیٹھ میں کوئی چیز مسمیو دے  
گا لیکن اب ایسا ہو چکا تھا اور وہ زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا۔

اور زمین پر گر کر ہی دلچسپیت نے اسے سمجھنے کا  
موقع ہی نہیں دیا اور پے در پے وار کر کے اس کا قصہ ختم  
کر دیا۔

اس ساری کارروائی میں تہہ خانے میں بندھا انسانی  
بھیڑ یا برابر شور مچاتا رہا وہ شاید اسے تہہ خانے کی سیڑھیاں  
اترے دیکھ چکا تھا لیکن سادھو جو پہلے ہی اس کے شور مچانے

کو نظر انداز کر چکا تھا اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اتنا شور  
کیوں کر رہا ہے۔ شاید وہ انسانی بھیڑ یا سادھو کو یہ بتانا چاہ رہا  
تھا کہ اس وقت تہہ خانے میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی آچکا  
ہے لیکن سادھو اپنی طاقت کے نشے میں پاگل ہو چکا تھا اور  
یہی پاگل پن اس کی موت کی وجہ بن گیا۔

سادھو کے مرتے ہی دلچسپیت کے دیگر ساتھی بھی  
جلدی سے سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچ گئے۔ سادھو کو دوبارہ  
چھری لہراتے دیکھ کر کچھ خوف سے بیہوش ہو چکا تھا لیکن اس  
کے کہنے کو وہ بازو سے بھی خون برس رہا تھا۔ خون زیادہ  
بہہ جا۔ نہ کہ وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور  
نیچے زمین پر ٹھون پڑ پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے وہاں ابھی  
تازہ تازہ کوئی لہکا کاٹا ہو۔

خوفناک اور ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک  
انسان کے ٹھون کا طالب بہت ڈراؤنا منظر پیش کر رہا تھا جو  
اتنے اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا لیکن اس  
ویران مندر میں داخل ہونے اور مختلف قسم کے عجیب و غریب  
واقعات سے نہرواؤ مانوس کی وجہ سے اس وقت وہ لوگ  
بے خوف ہو گئے تھے انہوں نے نیچے کی سائیس چپک  
لیں تو وہ چل رہی تھیں اور اس کی حالت سے یوں لگ رہا  
تھا کہ جیسے وہ کسی بھی سمت سے موت کو گلے لگا لگا۔

لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہلدی سے اسے  
اٹھا کر تہہ خانے سے باہر لا کر لٹایا اور پھر ایک کمرے میں  
جا کر ایک کھڑکی پر لگے پردے کو کھینچ کر اٹارنا اور جلدی سے  
اسے اس بچے کے کٹے ہوئے بازو والے حصے پر ابھی طرح  
لیٹ دیا۔ ان کے تہہ خانے سے لگنے تک وہ انسانی بھیڑ یا  
چینٹا چلاتا رہا لیکن انہوں نے اسے قتل کرنے کی بجائے اس  
بچے کو بجائے کو زیادہ ترجیح دی اس لئے انہوں نے اس انسانی  
بھیڑ سے کو اسے کے حال پر چھوڑا اور اس بچے کو لے کر تہہ  
خانے سے نکل آئے تھے۔

بچے کو ایک نوجوان نے اپنے کندھے پر اٹھالیا ہوا تھا  
اور پھر وہ جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر جانے کا راستہ  
ڈھونڈنے لگے۔ دو تین کمرے اور برآمدوں سے ہو کر انہیں  
وہی دالان دکھائی دیا جہاں وہ پہلی بار مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر

آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کھٹکا سانس لیا اور تیزی سے  
بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے اس وقت شام کے سائے پھیل  
چکے تھے۔ مندر میں وہ جس قسم کے حالات سے دوچار رہے  
ان حالات نے انہیں اس بات تک سے عاری کر دیا تھا کہ  
انہیں یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ دن کے کونے حصے میں اس وقت  
موجود ہیں اور اس بات کا اندازہ انہیں مندر سے باہر نکلنے کے  
بعد ہی ہوا کہ چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا انہوں نے  
مندر سے باہر نکلنے ہی سب سے پہلے بچے کو زمین پر لٹا کر  
دوبارہ اس کی سائیس چپک کیں تو یہ دیکھ کر انہیں تشویش  
ہونے لگی کہ اس کی سائیس پہلے سے بھی نہیں زیادہ کم ہونے  
لگ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر ان پر ایسی غاری ہوئی اور وہ بے بسی  
سے ہاتھ ملنے لگے کیونکہ انہیں نہیں لگ رہا تھا کہ وہ رات کے  
اس اندھیرے میں کس طرح اس معصوم بچے کو کسی حکیم وغیرہ  
کے پاس لے جا کر اس کا علاج کروا سکیں گے۔ ابھی وہ لوگ  
بے بسی سے کھڑے یہی سوچ رہے تھے کہ بچے نے زور زور  
سے جھٹکے لینے شروع کر دیے اور پھر دو تین منٹ اسی کیفیت  
رہنے کے بعد ایک زوردار جھٹکے سے اس کا جسم زمین سے تھوڑا  
لوہر اٹھا اور پھر ایک جھٹکے سے دوبارہ زمین پر گر کر ہی اس کی  
گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دلچسپیت سمجھ اور اس کی ساتھی اس کی اس دردناک  
موت کو اپنی جانتی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور بے بسی سے  
اپنے ہونٹ چباتے رہے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ  
نہیں دیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس معصوم بچے نے  
موت کو گلے لگا لیا۔ انہوں نے رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ  
سے بچے کو وہیں دفن کرنے کی بجائے اپنے ساتھ ہی لے  
جانے میں بہتری سمجھی اور بچے دل کے ساتھ اسے ایک  
نوجوان نے دوبارہ اپنے کندھے پر اٹھالیا اور انداز سے  
ایک طرف چلتے گئے۔

آہستہ آہستہ اس خوفناک اور منحوس مندر کی عمارت  
ان سے دور ہوتی گئی اور وہ کافی دیر تک چلتے رہے اس دوران  
انہوں نے تھوڑا سا جنگل کے اندر سے بھی فاصلہ طے کیا اور  
یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران ان کے ساتھ کوئی غیر  
معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور راستے میں کوئی جنگلی جانور نظر

اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکٹس بیسٹ

پاؤڈر



تبت پریکٹس بیسٹ پاؤڈر

اس سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

تقریباً دو میل تک پیدل چلنے کے بعد آخر کار اپنے گاؤں کی سرحد پر پہنچ گئے۔ دن نکل آیا تھا اور گاؤں لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی جیسے ہی انہوں نے گاؤں میں قدم رکھا وہاں کھیلنے بچوں نے انہیں دیکھتے ہی شور مچا شروع کر دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے اور اڑتے اڑتے یہ خبر کو دلچسپیت اور اس کے ساتھی گاؤں پہنچ گئے جس پر یہ سن کر دلچسپیت سنگھ کے گھر والے بھی دوڑتے گھروں سے نکلے اور راستے میں انہیں گھیر لیا۔ وہ لوگ ایک جھوم میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ گھر والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پریت کو خوشی دیکھنے والی تھی وہ دلچسپیت سنگھ کی خبریت کے لئے رات دن دعا میں مایک رہی تھی اور آج اس کی دعائیں اٹھ آئی تھیں اور اس کا دلچسپیت آج زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھا۔

تھکان اتارنے کے بعد شام کے وقت دلچسپیت سنگھ کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کو ان لوگوں کے زندہ سلامت واپس آ جانے کی وجہ سے ایک شاندار دعوت پر مدعو کیا گیا تھا جس میں تقریباً گاؤں کے تمام افراد شامل تھے۔ پر تکلف دعوت کے بعد دلچسپیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے انہیں ویران مندر میں پہنچنے اور اس بچے کی وردناک موت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو ہر شخص خوف سے کانپنے لگا۔ بچے کی ماں اپنے بچے کی وردناک موت کا سن کر برداشت نہ کر سکی اور بیہوش ہوگئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اور بچے کی موت کا سن کر وہاں موجود شخص اٹک رہا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے زندہ سلامت پہنچ کر آ جانے پر کسی قدر خوش بھی تھے اور برلمان کی بہادری کی تعریف بھی کر رہے تھے۔

دلچسپیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے گاؤں کے افراد کو اس انسانی بھیڑے کے متعلق اس لئے نہیں بتایا کہ کہیں وہ لوگ خوفزدہ ہو کر اپنے کھیتوں میں جانا نہ چھوڑ دیں لیکن ان سب کو سختی سے یہ تاکید ضرور کر دی تھی کہ بھول کر بھی کسی کوئی اس ویران مندر کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں۔



آیا جس سے انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔ نجانے وہ کتنی دیر تک یونی پیدل چلتے رہے اور پھر کافی دیر تک پیدل چلنے کے بعد صبح کا سپیدہ نمودار ہوا تو ہر چیز واضح ہوگئی۔

جنگل بہت پیچھے رہ گیا تھا اور دور دور بہت دور ایک راستہ جاتا دکھائی دیا اور غور سے دیکھنے پر ان کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا کہ یہ وہی راستہ تھا جس پر وہ پریت کو رکھ کے گاؤں سے واپس لوٹنے ہوئے سفر کر کے آئے تھے اور اس ویران مندر کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے تھے۔

پھر ایک جگہ جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے اس بچے کی لاش کو زمین پر رکھا اور اپنے ہاتھوں سے ہی ایک گڑھا نکھودنے کی کوشش کرنے لگے زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی پھر بچے کی لاش کو اسی کپڑے میں لپیٹ کر اس گڑھے میں لٹا دیا اور پھر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ گڑھا زیادہ گہرا نہ نکھودنے کی وجہ سے انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

تقریباً ڈیڑھ میل تک چلنے کے بعد اب انہیں دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں بہت سے مکان بنے ہوئے تھے ایک راگبیر سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ قریب پورے گاؤں ہے۔ اسی راگبیر سے تمام گڑھے گاؤں جانے کے لئے سیدھا راستہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسی طرف روانہ ہو گئے۔

مندر سے نکلنے کے بعد انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ باراتیوں نے ان کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے پڑاؤ اٹھالیا ہوگا اور سیدھے گاؤں ہی گئے ہونگے۔ اس لئے انہیں ان کی طرف سے کوئی ٹکرائی نہیں تھی۔

مسلسل پیدل چلنے اور رات بھر آرام نہ کرنے کی وجہ سے اب ان پر تھکامت طاری ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو پہنچنے اور دلچسپیت سنگھ کو اپنی دہن پریت کو رکھنے کی خوشی بھی جو نجانے اس وقت کس حال میں ہوگی۔ اپنے ایک ساتھی کی موت کا بھی انہیں بے انتہا افسوس تھا جو اس کا لے لے کا شکار ہو گیا تھا۔